مفتی اعظم ہند

مولانا کفایت اللہ شاہ جہاں پوری ثم دہلوی

ایک ادبی اور سیاسی شخصیت

مؤلف

ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہاں پوری

خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ

مفتی اعظم ہند

مولانا کفایت اللہ شاہ جہاں پوری ثم دہلوی

ایک ادبی اور سیاسی شخصیت

مؤلف

ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہاں پوری

ناشر

خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ

اشاعت ۲۰۰۵ء

قیمت [illegible]/- روپے

طابع: فرید بکڈپو، ۵۹-۲۱۵۸، ام۔ پی اسٹریٹ، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی

ناشر: خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ-۴

انتساب

میری یہ تالیف میرے مرحوم چچا، استاد و مربی مولانا محمد عبد الہادی خاں شاہ جہاں پوری کے فیض تربیت اور اثر صحبت کا نتیجہ ہے۔ میں اسے آں مرحوم ہی کے نام معنون کرتا ہوں۔

اللہ تعالیٰ مرحوم کے مراتب بلند فرمائے۔

ابو سلمان

(ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہاں پوری)

۳۱/ دسمبر ۲۰۰۳ء

حرف آغاز

مولانا کفایت اللہ شاہجہاں پوری ایک عہد ساز شخصیت کے مالک تھے۔ انہوں نے کئی جہات میں اپنی فطری اور کسبی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا۔ وہ ایک جید عالم دین تھے، ایک مدبّر سیاستداں اور مجاہد آزادی تھے، کئی دینی اور سیاسی کتابوں کے مصنف تھے اور اُردو و فارسی کے شاعر بھی تھے۔ ان کی ہمہ جہت خوبیوں اور خدمات کا اعتراف ان کے معاصرین نے بھی واضح طور پر کیا تھا۔ لیکن ان کی وفات کے بعد رفتہ رفتہ ان کی شخصیت اور خدمات کی جانب توجہ کم ہوتی گئی اور انہیں تقریباً فراموش کردیا گیا۔ اس کے اسباب و علل پر بحث کا یہاں موقع نہیں۔ لیکن یہ امر یقیناً قابل افسوس ہے۔

ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہاں پوری نے زیر نظر تصنیف میں ایک مرتبہ پھر مولانا کفایت اللہ کی شخصیت اور خدمات کو بطریق احسن اجاگر کیا ہے۔ اس کتاب کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصہ میں مولانا کفایت اللہ کی ذاتی نیز سیاسی و ادبی زندگی کے مختلف نقوش ملتے ہیں، مثلاً ان کی ابتدائی زندگی، جمعیۃ العلما سے ان کا تعلق، مختلف قومی اور بین الاقوامی تحریکوں میں ان کی شرکت اور ان کی تصنیفات و تالیفات کا جائزہ۔ ان موضوعات پر مبنی مختلف ابواب میں ان کا مفصل جائزہ اور ان پر مدلل تبصرہ قارئین کے لیے دلچسپی کا باعث ہوگا۔

علاوہ ازیں اس حصہ میں مولانا کے ورثا اور اخلاف کا بھی اجمالی بیان ہے۔ ان کے عربی، فارسی اور اردو کلام کے اقتباسات ہیں اور معاصرین ومتاخرین کے تاثرات اور خراجہائے تحسین کے نمونے بھی شامل ہیں۔ دوسرے حصہ میں مولانا موصوف کے فتاویٰ اور خطوط کی نقلیں بطور تاریخی دستاویز کے یکجا کی گئی ہیں۔ آخر میں ضمیمہ کے تحت مولانا کی

چند نادر روداد گار تحریروں کے نقوش اور دیگر کے متون محفوظ کر دیئے گئے ہیں۔

مجموعی طور پر یہ کتاب نہ صرف مولانا کی سوانح عمری ہے بلکہ ان کی زندگی سے متعلق تاریخی دستاویزوں اور نوادر کا خوبصورت مجموعہ بھی ہے۔ مجھے امید ہے کہ یہ کتاب مولانا کے عقید تمندوں کے لیے بالخصوص، اور اوائل بیسویں صدی کے مسلم معاشرہ کی تاریخ میں دلچسپی رکھنے والے قارئین کے لیے بالعموم، مفید اور معلومات افزا ثابت ہو گی۔

ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہاں پوری محقق اور مصنف، دونوں ہی اعتبار سے ایک مستند حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی تصنیفات اسکے قبل بھی لائبریری کے اشاعتی پروگرام کے تحت شائع ہو کر داد تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ ان کی اس تازہ تحقیقی و علمی کاوش کی پذیرائی بھی اسی انداز میں قارئین کریں گے، اس کا ہمیں مکمل یقین ہے۔

امتیاز احمد

فہرست

حصہ اول

سوانح اور ادب وسیاست
تعارف اور تبصرے کی ایک نظر

حصہ دوم

آثار علمیہ وادبیہ

دینی، ادبی اور تاریخی وسیاسی نوادر

پیش لفظ

مولانا مفتی محمد کفایت اللہ شاہ جہاں پوری ثم دہلوی دورِ آخر کے مشاہیر علمائے دین میں بڑی جامعیت کے بزرگ تھے۔ وہ نہ صرف اپنے معاصرین میں ایک خاص امتیاز کی شخصیت تھے بلکہ ماضی قریب میں بھی اس شان کا کوئی عالم دین نظر نہیں آتا۔ فقہ میں ان کی نظر بہت گہری تھی اور فتویٰ نویسی میں وہ بڑا درک رکھتے تھے۔ اس کا اعتراف نہ صرف برا عظم ہند پاکستان کے علمائے کرام اور اصحاب فن نے کیا ہے، عالم اسلامی کے اہل علم و نظر نے بھی ان کے تفقہ اور بصیرت کو تسلیم کیا ہے۔ مفتی اعظم ہند کا خطاب انھیں اسی لیے دیا گیا تھا کہ اس زمانے میں ان سے بڑا مفتی ہندوستان میں کوئی دوسرا نہ تھا۔

وہ دارالعلوم دیوبند کے نامور سپوت اور حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی کے ارشد تلامذہ میں ایک خاص شان کے مالک تھے۔ سیاست سے ان کے ذوق کو خاص مناسبت تھی۔ وہ سیاست داں نہیں سیاست ساز تھے، معاملات کی تہہ کو بہت جلد پہنچ جاتے تھے اور کسی واقعے کو معلوم کر کے اس کے پس منظر کو جان لینے میں وہ کمال کے مالک تھے۔ معاصر علمائے کرام میں سب سے پہلے انھوں نے سیاست کے میدان میں قدم رکھا اور ہر قدم پر اپنے ذوق، تدبر اور بصیرت کا ثبوت دیا تھا۔

وہ ۱۸۹۷ء میں دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہوئے تھے اور پانچ برس شاہ جہاں پور کے مدرسۂ عین العلم میں درس و تدریس کی زندگی گزار کر ۱۹۰۳ء میں دہلی چلے گئے اور دہلی کے مدرسۂ امینیہ اسلامیہ میں صدر مدرس اور مفتی کے عہدے پر فائز تھے۔ اسی وقت سے ان کے سیاسی اور سماجی ذوق نے دہلی میں اپنی جگہ بنانی شروع کر دی تھی اور ایک صاحبِ نظر کے بہ قول:

> "۱۹۱۹ء سے ۱۹۵۲ء تک دہلی میں کوئی سیاسی یا مذہبی تحریک ایسی نہیں تھی جس میں حضرت مفتی صاحب کی رہبری پوری صلاحیت و صفائی کے ساتھ نظر نہ آئے"۔

کسی رہنما کی بڑائی کو اس کی جماعت کے حلقے میں ضرور تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس لیے کہ

وہ ایک ضابطے کی ضرورت ہوتی ہے اس کے بغیر اس جماعت کا نظم برقرار نہیں رہتا۔ حتی کہ بعض اوقات تو جماعت کا وجود ہی معرض خطر میں پڑ جاتا ہے۔ لیکن ایک جماعت اور ایک مکتبہ فکر سے تعلق رکھنے والے کے لیے دوسری جماعتوں اور مکاتب فکر کے دائروں میں اپنے علم ورائے کی اصابت اور اخلاص کی سچائی کو منوانا اور عزت واحترام کا مقام حاصل کرنا سوت سے حسن اور دشمن سے اخلاص کا اعتراف کروانے کے مترادف ہے۔ حضرت مفتی صاحب بے شبہ ایسے ہی حسین اور صائب رائے تھے، جن کے حسن فکر، صحت فیصلہ، سیرت کی پختگی اور خلوص کی سچائی کو دوسرے فکری اور جماعتی دایروں میں بھی تسلیم کیا گیا ہے۔ جمعیت علمائے ہند کا تو ۱۹۱۹ء سے پہلے وجود ہی نہ تھا۔ البتہ کانگریس اور لیگ کی تنظیمات اور خلافت کی تحریک موجود تھی اور حضرت مفتی صاحب ہر جماعت کے زعماء کے معتمد علیہ تھے(۱)۔ وہ دیوبندی مکتبہ فکر سے تعلق رکھتے تھے، لیکن اہل حدیث، فرنگی محل (لکھنؤ)، بدایوں اور خیر آباد کے علماء کے حلقوں میں بھی یکساں ان کا احترام کیا جاتا تھا۔ ۱۹۱۸ء، ۱۹۱۹ء میں کانگریس، مسلم لیگ، خلافت اور جشن صلح کے خلاف تحریک (۲)" کے جلسوں کو کامیاب بنانے کے لیے انھوں نے جو کوششیں کیں اور جمعیت علمائے ہند کے قیام کے سلسلے میں پنجاب، سندھ، یوپی، بہار اور بنگال کے مختلف مکاتب فکر کے علماء کو انھوں نے جس قابلیت اور اعتماد کے ساتھ ایک پلیٹ فارم

---

(۱)- مرکزی مجلس خلافت کا قیام اسی برس (۱۹۱۹ء) عمل میں آیا تھا۔ لیکن ترکی خلافت کا مسئلہ اور اس سلسلے میں تحریک پہلے سے موجود تھی۔ اس کے نظم کی ضرورت نے مجلس کے قیام پر مجبور کر دیا تھا۔

(۲)- جنگ عظیم اول میں دول متحدہ کی فتح اور خلافت ترکی کے خلاف برطانیہ کی جیت پر حکومت نے "جشن فتح" منانے کا فیصلہ کیا تھا۔ لیکن ہندوستان کی سیاسی فضا، عوام کے جذبات اور ترکی کی شکست پر مسلمانوں میں غم واندوہ کی کیفیت کو دیکھتے ہوئے "جشن فتح" کے عنوان کو "جشن صلح" کے پر فریب نام سے بدل دیا گیا تھا۔ اگرچہ پنجاب وغیرہ میں "جشن فتح" کے عنوان ہی سے جلسے ہوئے اور ان میں بعض مسلمان اور ہندو زعمانے بھی شرکت فرمائی اور اظہار خوشی میں بعض اعمال بھی انجام دیئے، لیکن شمال مشرقی ہند میں حکومت کا یہ فریب پوری طرح کامیاب نہ ہوا۔

پر جمع کر دیا تھا، وہ ان کے حسنِ تدبر اعلیٰ قابلیت اور ملک کے ان پر اعتماد کا بڑا ثبوت ہے۔

حضرت مفتی اعظم صاحب جمعیت علمائے ہند کے قیام سے بیس برس تک اس کے صدر رہے۔ جمعیت علمائے ہند میں شہروں، اور علمی دینی، تعلیمی مراکز اور خانوادوں سے دیوبند، دہلی، اجمیر، لاہور، لکھنؤ، بدایوں، خیر آباد وغیرہ کے اور صوبوں میں بنگال، بہار، احاطہ بمبئی، راجستھان، پنجاب، سندھ، سرحد کے اور ہندوستان میں مسلمانوں کے تقریباً تمام اہم مکاتب فکر کے دیوبندی، بریلوی، اہل حدیث، خیر آبادی، فرنگی محلی، وغیرہ کے اکابر علمائے دین نہ صرف شریک بلکہ اس کے بانیوں میں شامل تھے۔ ان میں سے بعض افکار و عقائد اور روایات میں ایک دوسرے سے ضد و خلاف اور عناد کا تعلق رکھتے تھے اور ان میں سے ہر کوئی مکتب فکر اور خانوادۂ علمی اپنی قابل فخر تاریخ اور روایات رکھتا تھا۔ بلاشبہ اس وقت حالات کا تقاضا بھی یہی تھا کہ سب مسلمان ایک ہو جائیں، لیکن اس اجتماع اور اتحاد و تالیف میں حضرت مفتی محمد کفایت اللہ شاہ جہاں پوری ثم دہلوی کی بالغ نظری، حکمت عملی اور صلح جویانہ ذوق و روش کا بڑا حصہ تھا۔ جنہیں دنیا مفتی اعظم ہند کے معزز لقب سے یاد کرتی ہے۔ دیوبندی جماعت سے ان کا تعلق اور مولانا محمود حسن شیخ الحدیث اور صدر المدرسین دار العلوم دیوبند سے ان کا رشتہ تلمذ کسی سے پوشیدہ نہ تھا، لیکن انکی شرافت، نیک نفسی، اصابت رائے اور ان کے فتوؤں کی ہر خانوادۂ علم اور دائرۂ فکر میں دھوم تھی۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں علم و عقائد میں رسوخ، مطالعہ و نظر میں وسعت، رائے کی اصابت اور سیرت کی پختگی کی بہترین خوبیوں سے نوازا تھا اور قوم و ملت اور مذہب و وطن کی خدمت کی توفیق ارزانی فرمائی تھی۔ وہ منصف مزاج، صافی قلب، معتدل رائے اور متوازن فکر کے مالک تھے۔ وہ بے غرض تھے اور عجز و انکساری ان کا شیوہ تھا۔ وہ ناانصافی اور تعصب سے دور و نفور تھے۔ سختی اور تشدد کو کسی معاملے میں پسند نہ کرتے تھے۔ تنگ نظری اور تقشف ان میں موجود تھا۔ ان کی زبان، قلم اور رویے سے کسی کو تکلیف نہ پہنچتی تھی۔ انہیں جس طرح اپنے علم اور رائے کی اصابت پر اعتماد تھا، اسی طرح انھیں اپنے نفس و جذبات پر قابو تھا۔ وہ بلند پایہ عالم دین، وسیع النظر مبصر، نکتہ رس مفکر، صاحبِ استقامت اور عالم باعمل شخص تھے۔ ان کا تعلق اصحاب عزیمت و دعوت کے طبقۂ علیا سے تھا۔ ان کی دین داری، وطن دوستی اور قوم پروری ــــ دکھاوے، غرض، کھوٹ اور لالچ سے پاک تھی۔ ان کی مذہب پسندی اور انسانیت نوازی میں کوئی تضاد نہ تھا۔ وہ ایک مرنجام رنج سیرت کی مثال تھے، لیکن ان کے عزائم

میں پہاڑوں کی پختگی اور محکمی تھی۔

براعظم ہند پاکستان کی تاریخ اصحابِ علم و عمل کے تذکروں سے بھری ہوئی ہے۔ اعاظم رجال کی کسی دور میں کمی نہیں رہی۔ ہر قوم و مذہب میں مایہ ناز اور نادرِ روزگار شخصیات رہی ہیں، لیکن حضرت مفتی اعظم جیسی دین و دنیا، مذہب و سیاست، قومیت و انسانیت کی بہترین صفات کی جامع اور ہمدرد آشنا شخصیات شاذ کے درجے میں ملیں گی۔ دین، مذہب، انسانیت ان کی زندگی کا نصب العین اور دنیا، سیاست، قومیت زندگی کی ناگزیر ضرورت تھی۔ جس طرح کوئی دین دار اور مذہبی شخص دنیا اور سیاست سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح کوئی انسان دوست قومیت کی نسبت سے بے تعلق نہیں رہ سکتا۔ قیام و توطن کے لیے ہر شخص خطۂ زمین کے انتخاب میں آزاد ہے لیکن وہ اپنی زندگی کی ایک صبح یا شام بھی زمین سے تعلق اور اس کے اعتراف و اقرار کے بغیر نہیں گزار سکتا۔

جس طرح کسی سوسائٹی کے قیام کے لیے زمین کے کسی ٹکڑے کا وجود ضروری ہے۔ اسی طرح انسان کی زندگی کے ارتقاء اور تکمیل کے لیے سوسائٹی ایک ناگزیر عنصر ہے۔ جن لوگوں نے ہندوستان کی وطنیت اور اس کی ذمہ داریوں کے تعلق سے برادرانِ وطن کے ساتھ متحدہ قومیت کی تشکیل کو مسلمانوں کے لیے ننگ و عار، لغو اور خلافِ اسلام سمجھا تھا، انھیں قیام پاکستان کے اول روز اعلان کرنا پڑا کہ یہاں کوئی مسلمان، کوئی ہندو یا کوئی عیسائی نہیں، سب برابر کے شہری اور صرف پاکستانی ہیں۔ مسلمان اپنی مسجدوں میں، عیسائی اپنے گرجوں میں اور ہندو اپنے مندروں میں جائیں۔ یہاں کسی کو کسی پر کوئی ترجیح نہیں۔ سب کے مساوی حقوق اور یکساں فرائض اور ذمہ داریاں ہیں اور یہ کہ مذہب ہر کسی کا ذاتی معاملہ ہے۔ کسی کا کچھ مذہب ہو مملکت کو اس سے کوئی سروکار نہیں!! انھیں بھی آخر کار وطنی قومیت کو قبول کرنا پڑا اور وہ بھی نئے ملک میں ''متحدہ قومیت'' کے قیام پر مجبور ہوئے۔

رہے مذہبی اور سیاسی اختلافات و نزاعات! تو کیا ہندوستان کے حدود سے نکل کر انھیں ان اختلافات سے نجات مل گئی؟ کیا مسلمانوں، شیعوں، رضا خانیوں، بوہروں، قادیانیوں، سنیوں، مقلدوں، غیر مقلدوں، دیوبندیوں اور بریلویوں کے مابین اختلافات کی شدت ہندو مسلم اختلافات سے کچھ کم ہے؟ اور کیا پاکستان کی فضا سیاسی اختلافات کے تعفن سے پاک ہو گئی ہے؟ کیا پاکستان میں مرکز اور صوبوں کے مابین نزاعات نہیں ہیں؟ کیا کم آبادی کے

صوبوں کو زیادہ آبادی والے صوبوں سے استحصال کی شکایت نہیں؟ اور اس کے برعکس کیا کثیر آبادی اور زیادہ ذرائع ووسائل معیشت رکھنے والے صوبوں کو ذمہ داریوں اور کفالت کے بوجھوں کی شکایت نہیں ہے؟ کیا مشرق کو مغرب سے سیاسی حقوق کے غصب واستحصال کے سوا مذہبی عقائد میں استحصال کی شکایت تھی؟

اختلافات خواہ مذہبی ہوں، خواہ سیاسی، خواہ سماجی، طبقہ وارانہ، فرقہ وارانہ کسی قسم کے ہوں، ان کا حل تلاش کرنا پڑتا ہے! آج اگر کوئی شخص کہتا ہے کہ پاکستان میں مشرق ومغرب کی کشمکش اور بالآخر دونوں کی جدائی غلط تھی انہیں ایک ساتھ رہ کر مسائل اور اختلافات کا حل تلاش کرنا چاہیے تھا۔ تو وہ ہندوستان کی تقسیم کے جواز اور قائداعظم کے مقدمے کو کمزور کرتا ہے۔ اسے مان لینا چاہیے کہ مسلمانوں کے لیے یہی لازم تھا کہ وہ متحدہ ہندوستان ہی میں رہ کر مذہبی، سیاسی اور ہر قسم کے فرقہ وارانہ مسائل اور اختلافات کا حل تلاش کرتے!

غلطی سے یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ ہندوستان میں مذہب کی بنیاد پر اور مذہبی عقائد کے اختلافات سے مشترکہ وطنیت اور متحدہ قومیت کے تصور سے اختلاف کو ہوا ملی! حال آں کہ کسی مذہب کا آپس کی دشمنی سے کبھی کوئی تعلق نہیں رہا۔ مذہب بیر کرنا نہیں محبت کرنا سکھاتا ہے۔ البتہ مذہب کی مظلومیت ہمیشہ یہی رہی ہے کہ بہ طور ایک ہتھیار کے اس کا استعمال ایک قوم نے دوسری قوم کے خلاف اور ایک ہی مذہب کے ماننے والوں کے دو فرقوں نے ایک دوسرے کے خلاف بے محابا اور پوری آزادی کے ساتھ کیا ہے اور اس کے فوائد ونقصانات انھیں قوموں یا ان کے فرقوں نے اٹھائے اور رسوائی کی کالک مذہب کے منہ پر مل گئی۔

حضرت مفتی صاحب کی خوبی یہ تھی کہ وہ مذہب وسیاست اور ہر مسئلے اور ہر معاملے کو اس کے حدود میں رکھتے تھے۔ نہ تو مذہبی جوش میں آکر اس کے حدود سے تجاوز کرتے تھے اور نہ سیاسی ترنگ میں اس کے حدود کو نظر انداز کرتے تھے۔

افسوس! حضرت مفتی صاحب اپنے علم وعمل میں جتنے بڑے تھے اور ان کی دینی سیاسی خدمات جتنی عظیم الشان تھیں، انھیں اتنا ہی نظر انداز کیا گیا۔ بھلا دینے کی حد تک ان سے اعراض برتا گیا۔ اس پہلو پر بھی ایک سرسری نظر ڈال لینی چاہیے؛

حضرت مفتی اعظم کی وفات کے بعد نظم ونثر میں کچھ مضامین مختلف اخبارات ورسائل میں شائع ہوئے تھے۔ کچھ تعزیتی خطوط۔ قطعات تاریخ، تاثرات لوگوں نے حضرت

کے خلف اکبر مولانا حفیظ الرحمٰن واصف کو لکھ کر بھیجے اور ان کے پاس جمع ہو گئے تھے۔ اسی زمانے میں الجمعیۃ، دہلی کا ایک ''مفتی اعظم نمبر'' شائع ہوا تھا۔ الجمعیۃ کا نمبر جلد ہی نایاب ہو گیا اور بہت سے شائقین اور دور افتادہ نیاز منداس کے استفاضے سے محروم رہ گئے۔ ۱۹۶۶ء میں مولانا واصف مرحوم نے الجمعیۃ کے خصوصی نمبر کے مضامین اور کچھ مواد جو ان کے پاس جمع تھا، مرتب کر کے کتابی شکل میں ''بہ عنوان'' مفتی اعظم کی یاد میں ''چھاپ دیا تھا۔ یہ مجموعہ ۸/۲۲×۱۸ تقطیع کے ۲۲۸ صفحات پر مشتمل تھا۔ اس مجموعے میں بہ قدر ایک سو صفحات الجمعیۃ کے نمبر سے زیادہ ہیں۔ اس کے باوجود یہ کتاب ایک اوسط درجے کی ضخامت تک پہنچ سکی تھی۔ اب حال ہی میں پاکستان کے ایک علمی جریدے ماہنامہ ''القاسم'' نے الجمعیۃ کے تاریخی نمبر کو کچھ ترک واضافہ اور ترمیم کے ساتھ خصوصی پیشکش کے طور پر شائع کر دیا ہے۔ اتفاق سے اس کے صفحات بھی ۲۲۸ ہیں۔ البتہ اس کا سائز بڑا ہے (۱)۔ یہ ایک نہایت مفید علمی کام انجام پایا ہے۔ اگرچہ اس کا بنیادی مواد الجمعیۃ کے خاص نمبر سے ماخوذ ہے۔ الجمعیۃ کی خصوصی اشاعت کے بعد جو دو کام، مفتی اعظم کی یاد میں'' اور ''القاسم کی خصوصی پیشکش'' وجود میں آئے ان سے بہت سے شائقین اور تشنگان علم سیراب اور مستفیض ہوئے۔ لیکن ان کی اشاعت کی اہمیت کے باوجود ان سے علمی و تحقیقی کام میں کوئی اضافہ نہیں ہوا۔

حضرت مفتی اعظم کی وفات پر پورے اکیاون برس گزر چکے ہیں۔ لوگ اس بنیادی کام کے ۲۲۸ صفحوں کو اس مدت پر تقسیم کر لیا جائے تو تقریباً چار صفحے ایک سال کے حصے میں آتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کام کی یہ مقدار اور یہ رفتار ایک عام قومی کارکن کے شایانِ شان ہے؟ حضرت مفتی اعظم کا مقام تو اس سے بہت بلند تھا۔ وہ غیر معمولی شان کے صف اول کے سیاسی رہنما، جنگ آزادی کے سورما اور ایک نابغہ روزگار شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی شخصیت، سیرت، خدمات اور افکار کے تعارف میں الگ الگ اور کئی کئی مجموعے کیے جاتے، ان پر تصنیف و تالیف کے لیے اکیڈمی قائم کی جاتی اور ان کی یاد میں کئی دوسرے کام انجام دیئے جاتے تو بھی شاید ان کا حق ادا نہ ہوتا۔

کیا قوم کے اس اعراض اور عدم توجہ سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ قوم نے اپنے اس عظیم

(۱)- ماہنامہ القاسم خالق آباد ضلع نوشہرہ (سرحد) کے مدیر مولانا عبدالقیوم حقانی سرپرست جامعہ ابوہریرہ (خالق آباد) ہیں۔

محسن کو بالکل ہی بھلا دیا ہے، جس شخصیت نے اپنی پوری زندگی وطن کی آزادی کی جد و جہد میں بتائی تھی، قوم نے اس کی خدمت گذاریوں کا صلہ کیا دیا ہے؟ اخبار کا ایک نمبر، چند مضامینِ نظم ونثر، چند قطعاتِ تاریخ وفات۔ اور اس نمبر کی مکرر اشاعت بہ صورت کتاب اور بہ صورت مجلّہ —— ہر صورت میں زیادہ سے زیادہ صرف ۲۲۸ صفحات!

یہ سوال صرف قوم ہی سے نہیں، جس کی آزادی کے لیے اس نے اپنی زندگی کے پچاس سال اپنوں اور بیگانوں کی مخالفتوں کا سامنا کرتے ہوئے، دشنام سنتے ہوئے، کبھی سفر میں اور کبھی جیل کی سلاخوں کے پیچھے گزارے تھے! یہ سوال اس جماعت سے بھی ہے جس کا صدر بنکر بھی اس نے زندگی کے بیس برس کے شب و روز مشقتوں میں گزارے تھے اور بعد کے چودہ برس، جب جمعیت علمائے ہند کی کوئی ذمہ داری ان کے کاندھوں پر نہ تھی، ایک کارکن کی طرح اُس کی خدمت کے لیے مستعد رہے تھے۔ اس جماعت نے اپنے بانی اور پہلے بیس سالہ دور کے صدر کے لیے کیا کارنامہ انجام دیا؟

مجھے حضرت مفتی صاحب کے اخلاف کی دوسری پیڑھی کی تفصیل معلوم نہیں۔ ان کے دو بیٹے تھے۔ مولانا حفیظ الرحمٰن واصف کا انتقال ہو گیا۔ ''مفتی اعظم کی یاد میں'' ان کی خدمت کا ذکر آچکا ہے اور ''کفایت المفتی'' کے نام سے نو جلدوں میں حضرت کے فتاویٰ کی جمع و تدوین اور اشاعت کا انھوں نے جو کارنامہ انجام دیا۔ اس کتاب میں اس کا تذکرہ قارئین کرام کی نظر سے گزرے گا۔ مفتی صاحب کے چھوٹے بیٹے مولانا خلیل الرحمٰن قیام پاکستان کے بعد کراچی آگئے تھے۔ وہ اگرچہ ایک باصلاحیت نوجوان تھے لیکن ان کا تعلق نہ سیاست سے تھا اور نہ تصنیف و تالیف کا ذوق رکھتے تھے۔ انھوں نے جن معاملات میں اپنی زندگی گزاری، اس میں وہ حضرت مفتی اعظم ہند کا فرزند ہونے کے فخر کا علی الاعلان اظہار بھی نہ کر سکتے تھے۔ وہ ایک سرکاری ملازم کی حیثیت سے پاکستان آئے تھے اور ایمان داری اور خاموشی کے ساتھ اپنے نئے وطن کی خدمت انجام دے کر وقت آنے پر ریٹائر ہو گئے اور اب اپنی بیٹی کے ساتھ ایک معذور زندگی گزار رہے ہیں۔ ہمیں ان پر رحم آتا ہے۔ ہم ان سے باپ کا نام روشن کرنے اور ان کی یاد میں کسی ادنیٰ کام کی بھی توقع نہیں رکھ سکتے! اللہ تعالیٰ ان پر اپنا رحم فرمائے!

کسی شخص کے پوتے اور نواسے بھی اس کے اخلاف میں شمار ہوتے ہیں۔ معلوم کرنا چاہیے کہ انھوں نے اپنے سلف صالح اور نیک نام اور نامور بزرگ کے لیے اب تک کیا

خدمات انجام دی ہیں۔ حضرت مفتی صاحب کی ایک بیٹی بھی کراچی میں ہیں اور حیات ہیں۔ ان کی اولاد میں تین بیٹے اور تین بیٹیاں ہیں۔ میں حضرت مفتی صاحب کے ایک نواسے سے ملا ہوں حقیقت تو یہ ہے کہ اپنے عظیم نانا کے نام کے سوانہ ان کے کام سے واقف ہیں اور نہ مقام سے آشنا ہیں۔ ان سے کسی کام کی کیا توقع کی جاسکتی ہے۔

حضرت مفتی صاحب کے خاندان کے متعدد افراد دہلی اور شاہ جہاں پور میں موجود ہیں۔ مجھے معلوم نہیں کہ انھوں نے اپنے "فخر خاندان" کے لیے اب تک کیا کیا ہے اور کیا سوچا ہے!

ان کے علاوہ حضرت مفتی اعظم کے پچاسوں نہایت لائق اور نامور شاگرد تھے۔ ان میں سے بعض تو شاید اب بھی زندہ ہوں۔ کیا ان پر اپنے استاد کا کوئی حق نہ تھا اور کیا وہ بہ طور شکریہ و بہ حکم ھل جزاء الاحسان الا الاحسان بہ طرز اظہار احسان مندی ان پر کوئی تالیف لکھ کر آنے والی نسل کے لیے ان کے کارناموں، ان کی دینی و ملی خدمات اور ان کی سیرت کا تعارف نہ کراسکتے تھے لیکن انھیں بھی اس کا خیال نہ آیا وقت کے ہنگاموں اور اپنے شوق کے مشاغل نے اس فرض کی ادائیگی کی طرف توجہ کرنے کی فرصت نہ دی۔ اس لیے مناسب نہیں کہ ان کے شکوے سے زبان قلم کو آلودہ کیا جائے!

میرے ایک چچا مولانا محمد عبد الہادی خان، جو میرے استاد اور مربی بھی تھے اور بعد میں انھوں نے اپنی بھتیجی کے ساتھ میرا نکاح بھی کر دیا تھا، حضرت مفتی صاحب کے خاص شاگردوں میں سے تھے۔ وہ مدرسۂ امینیہ میں ان کے شاگرد تھے اور فراغتِ تعلیم کے بعد ایک طویل عرصہ دہلی میں گزارا تھا۔ میں نے حضرتِ مفتی صاحب کے متعدد فتووں پر تصویب و توثیق کے دستخط دیکھے ہیں، اپنے استاد سے بہت محبت کرتے تھے اور اکثر مرحوم و مغفور کی شرافت، نیک نفسی، علم و فضل، نظر و بصیرت، اخلاص و تقویٰ، ایثار و عزیمت کا ذکر فرمایا کرتے تھے۔ اُن کے فیضانِ صحبت سے میرے دل میں بھی حضرت مرحوم کے لیے ایک عقیدت پیدا ہو گئی تھی۔ بعدہ میرے اپنے مُطالعے نے اسے گہرا اور پختہ کر دیا تھا۔ اس عقیدت کے اظہار اور حضرت کی شخصیت و خدمات کے تعارف اور سیرت کے فیضان عام کے لیے خاکسار نے ایک کتاب لکھنے کا عزم کیا تھا۔ میں اللہ تعالیٰ کا شکر گزار ہوں کہ اس نے اس ناتواں اور دور افتادہ نیاز مند کو اپنے عزم کو پورا کرنے کی توفیق ارزانی فرمائی۔

خاکسار نے حضرت مفتی صاحب کی جامع جہات شخصیت کے مختصر سوانح، سیرت کے چند مضامین اور خدمات کے بعض پہلوؤں کے تعارف میں چند مطالب کو تالیف کر دیا ہے۔ خاص طور پر یہ سیاسی اور ادبی یا شاعرانہ دو پہلو ہیں۔ سیاسی پہلو حضرت کی زندگی کا نمایاں پہلو ہے اور شاعرانہ پہلو بہت سی ادبی، لسانی اور فکری خوبیوں کا عکاس اور اہمیت کا حامل ہے۔ لیکن یہ پہلو حضرت کی زندگی میں نمایاں نہ ہو سکا تھا۔ حضرت مفتی صاحب سیاسی کاموں کے ہجوم، درس و تدریس کی مصروفیات، فتویٰ نویسی کے اشتغال، مدرسہ امینیہ کے اہتمام اور جمعیت علمائے ہند کی ذمہ داریوں سے عہدہ برائی کی فکر، الجمعیۃ کی نگرانی و رہنمائی کے مشاغل کی وجہ سے اس طرف پوری توجہ نہ دے سکے تھے اور زندگی کے آخری دور میں تو اس کوچے کے راہ و رسم اور رنگا رنگ بزم آرائیاں بہ قول غالب "نقش و نگارِ طاق نسیاں" ہو گئی تھیں۔ اور جو کچھ سرمایہ فن موجود تھا اس کی طرف کسی صاحبِ ذوق، کسی مبصر اور ادبی نقاد کی نظر نہ گئی۔ اس حقیقت سے آشنا اور حضرت مفتی صاحب کے کمال سے واقف بہت کم لوگ تھے۔ مجھے معلوم نہیں کہ واصف نے اس ادبی سرمائے اور نوادرِ شعری کی جستجو اور بازیافت کے لیے کوئی منظم کوشش کی یا نہیں۔ البتہ یہ بھی حقیقت ہے کہ آج جو چند نوادر ہمیں دستیاب ہیں یہ انھیں کے ذوق و توجہ کی وجہ سے ہیں۔

اگرچہ یہ تالیف حضرت مفتی صاحب کی ہمہ جہت شخصیت کے تمام پہلوؤں اور ان کے خصایص کی پوری طرح جامع اور حضرت کے شایانِ شان نہیں۔ لیکن امید ہے کہ یہ مختصر مطالعہ اور ایک دور افتادہ نیاز مند کی یہ کوشش حضرت مفتی اعظم کی شخصیت کے وسیع مطالعے، حالات کی تحقیق اور آئندہ تصنیف و تالیف میں محرک ثابت ہو گی۔ نیز اس میں تالیف مطالب کے انداز و معلومات کی کچھ نئی باتیں قارئین کرام کی دلچسپی کا ضرور موجب ہو گی۔

ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہاں پوری

سخنے چند

مولینا مفتی محمد کفایت اللہ (۱۸۷۵ء - ۱۹۵۳ء) علمائے دیوبند کے سلسلۃ الذہب کی ایک بہت اہم کڑی اور شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی کے ممتاز ترین شاگردوں میں سے تھے۔ انھیں علمی و عملی زندگی گزارنے کے لیے جو وقت ملا وہ ایسا وقت تھا کہ ہندوستان اپنے مستقبل کی نقشہ آرائی کی جدوجہد میں بہمہ جان و تن مصروف تھا اور ہر حساس انسان مجبور تھا کہ اس جدوجہد میں اپنی بہترین صلاحیتوں کے مطابق اپنا حصہ بٹائے۔ اس وقت ہندوستان میں باصلاحیت افراد کی بہتات تھی۔ شاید جدوجہد ہی باصلاحیت انسانوں کی افزائش کرتی ہے۔ ایسے مشاہیر کی اس تعداد میں موجودگی میں کسی شخص کے لیے اپنی انفرادیت کا نقش ثبت کرنا بہت دشوار ہوتا ہے۔ تاہم مفتی کفایتِ اللہ صاحب کو قدرت نے بعض ایسے اوصاف و کمالات ودیعت فرمائے تھے جن میں کوئی ان کا مثیل نہیں تھا۔ ان کا تفقہہ فی الدین ایک تسلیم شدہ حقیقت تھی جس سے ان کا کوئی مخالف بھی جرأت انکار نہیں کر سکتا تھا۔ وہ فقیہہ اعظم کہلاتے تھے اور واقعی اس لقب کے مستحق تھے۔ ان کا ایثار ان کا ایک اور ایسا وصف تھا جس کی مثالیں ان کے دور میں بھی شاذ تھی اور آج تو ناپید ہیں۔ ان کی وفات پر جنوری ۱۹۵۳ء میں جامع مسجد، دہلی کے میدان میں جو تعزیتی جلسہ منعقد ہوا تھا اس میں شرکت کا موقع خاکسار راقم الحروف کو ملا تھا۔ اس جلسے کو مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی خطاب فرمایا تھا۔ اپنی تقریر میں انھوں نے کہا تھا کہ مفتی صاحب اپنے لیے جو منصب چاہتے وہ انھیں حاصل ہوتا لیکن انھوں نے کبھی اسکی ادنیٰ خواہش بھی نہیں فرمائی۔ مفتی کفایت اللہ صاحب کی تیسری بڑی صفت ان کے مزاج کا عدل و توازن تھا اور یہ ایسی صفت تھی جس نے انھیں موافق و مخالف ہر ایک کی نگاہ میں یکساں معتبر و محترم بنا دیا تھا۔ آپ جانتے ہیں کہ معاصرت کا فتنہ بڑا فتنہ ہوتا ہے اور جب کوئی شخص تنہا مسند علم ہی پر متمکن نہ ہو بلکہ خارزارِ سیاست میں بھی پوری طرح اُلجھا ہوا ہو، اور وہ سیاست ہندوستان کی بیسویں صدی کے نصف اوّل پر حاوی ہو، تو اس کا اس طرح بے داغ رہنا کتنا بڑا کارنامہ ہو سکتا ہے۔

مفتی کفایت اللہ کا مولد و منشا شاہ جہاں پور تھا، ان کی مادر درس گاہ دار العلوم دیو بند تھی اور ان کے علم و عمل کا اصلی میدان دہلی تھا لیکن ان کی علمی و عملی فتوحات پورے بر صغیر کا احاطہ کرتی تھیں بلکہ ان کی شہرت بر صغیر سے تجاوز کر کے عالم اسلام کے ہر گوشے تک پہنچ گئی تھی۔ انھوں نے مختلف دینی و فقہی مسائل سے متعلق جو فتوے اِرقام فرمائے تھے وہ ان کے تفقہ کا واضح ثبوت ہیں اور بڑی حد تک انھوں ہی نے انھیں مفتی اعظم کا درجہ عطا کر دیا ہے۔ درس و تدریس کا سلسلہ انھوں نے شروع تو شاہ جہاں پور ہی سے کر دیا تھا لیکن اس کا دائرہ اصلی معنی میں وسیع اس وقت ہوا جب وہ ۱۹۰۳ء میں شاہ جہاں پور سے دہلی منتقل اور وہاں مدرسہ امینیہ کی صدر مدرسی پر فائز ہوئے۔ مدرسہ امینیہ سے ان کا یہ تعلق آخر عمر تک رہا اور پھر یہ مدرسہ ان ہی کے نام سے جانا پہچانا گیا۔ سیاست سے ان کا لگاؤ دیو بند میں شیخ الہند کے فیض صحبت سے پیدا ہو گیا تھا لیکن وہ مستحکم دہلی آکر اور حکیم محمد اجمل خاں اور ڈاکٹر مختار احمد انصاری جیسے اکابر کی صحبت میں رہ کر ہوا۔ وہ ۱۹۱۹ء سے ۱۹۳۹ء تک کامل بیس برس جمعیۃ العلماء (ہند) کے مستقل صدر رہے۔ اور جب نہیں رہے تب بھی اس کا دماغ تو ہمیشہ ہی مانے جاتے رہے۔ کانگریس کے ساتھ بھی ان کی وابستگی تادمِ آخیر رہی اور ترکِ موالات کی تحریک میں شریک ہو کر انھوں نے قید و بند کی صعوبت بھی بھگتی۔ ان کا تعلق مختلف اوقات میں تحریک خلافت اور مسلم لیگ سے بھی رہا۔ تاہم ان کی سیاست اوّل سے آخیر تک حب الوطنی اور قوم پروری کی سیاست رہی۔ اِس راہ میں جو سب پر گذری وہ ان پر بھی گزری، البتہ اتنا ضرور تھا کہ اس سے نہ تو ان کے احترام میں فرق آیا اور نہ انھوں نے کسی شکل میں بھی اس کا معاوضہ حاصل کرنے کی کوشش کی۔ جہاں رواج اپنی ہی نہیں، اپنے باپ دادا کی خدمات کے بھی سکّے بھنانے کا ہو وہاں یہ کتنی بڑی بات ہے اس کا اندازہ دشوار نہیں اور یہی سبب تھا کہ ان کے دامن پر کوئی ہلکی سی چھینٹ بھی نہیں پڑ سکی۔

مفتی کفایت اللہ کی شخصیت جتنی عظیم تھی اسے دیکھتے ہوئے ان پر بہت کم کام ہوا ہے۔ شاید ان پر کماحقہ کام کرنے کے لیے وقت کو کسی ایسے اہل قلم کا انتظار تھا جو دولت اِخلاص سے پوری طرح مالا مال ہو، جسے بالخصوص حضرت شیخ الہند اور ان کے ایسے بلند مرتبہ شاگردوں سے گہری عقیدت ہو جو بیک وقت علم و عمل کے جامع رہے ہوں، جسے قدرت نے علم و تحقیق کا غیر معمولی ملکہ عطا کیا ہو اور جو اپنے اخلاص، اپنی عقیدت اور اپنے ذوق تحقیق کو

صفحہ قرطاس پر منتقل کرنے کی وافر صلاحیت رکھتا ہو۔ ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہاں پوری نے مدرسہ دیوبند کے صاحبان سیف و قلم کے ساتھ اپنے اخلاص اور عقیدت کا ثبوت طرح طرح سے مہیا کیا ہے۔ جیسا کہ معلوم ہے، اکابر دیوبند کا یہ سلسلہ شاہ ولی اللہ دہلوی تک پہنچتا ہے اور اس لیے سلسلۂ ولی اللہ کی دوسری کڑیاں بھی ابو سلمان صاحب کے اخلاص و عقیدت کا مرکز بنی ہیں اور ان میں ایک بہت اہم نام مولانا ابوالکلام آزاد کا ہے۔ ان سب حضرات پر ان کے کام کا دائرہ اتنا وسیع اور وقیع ہے کہ اس کا احاطہ امر دشوار ہے۔ تاہم اس پر ایک سرسری نظر ڈالنا اس لیے ناگزیر ہے کہ اس کے بغیر مفتی کفایت اللہ صاحب سے متعلق ان کی پیش نظر تصنیف کی اہمیت کا عرفان ممکن نہیں ہے۔

ابو سلمان صاحب نے مولانا محمود حسن، مولانا حسین احمد مدنی اور مولانا محمد حفظ الرحمٰن کا سیاسی مطالعہ اور اوّل الذکر دونوں بزرگوں کی سیاسی ڈائریاں شائع کی ہیں۔ مولانا محمود حسن کی کلیات بھی مرتب کی ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا عبید اللہ سندھی پر ان کا کام بہت ہی جہات پر حاوی ہے۔ اس میں مصنفات، مولفات، مرتبات سب کچھ آجاتا ہے۔ مولانا مفتی کفایت اللہ پر پیش نظر کتاب کے علاوہ سیاسی مطالعہ بھی مرتب ہو چکا ہے اور اس فہرست میں انھوں نے مولانا احمد سعید دہلوی کو بھی شامل کر لیا ہے۔ اس سلسلۃ الذہب کے علاوہ بعض دیگر اکابر کی حیات اور فکر کے مختلف گوشوں کو انھوں نے اپنے مطالعے کا مرکز بنایا ہے۔ امام ابن تیمیہ، مولانا مناظر احسن گیلانی، عبدالرحمٰن پشاوری اور اشفاق اللہ خاں کی سوانح عمریاں شائع کی ہیں۔ مولانا آزاد کے علاوہ مولانا محمد علی کی صحافت پر بھی قلم اٹھایا ہے اور مولانا آزاد، مولانا محمد علی، مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا عبدالماجد دریابادی کے مکاتیب مرتب کیے ہیں اور ان پر مفید مقدمے اور حواشی لکھے ہیں۔ مولانا محمود حسن اور مولانا آزاد کے علاوہ ثانی الذکر کے بڑے بھائی جواں مرگ غلام یسین آہ کا دیوان مُرتب کیا ہے۔ لکھا جا چکا ہے کہ علمائے باعمل ابو سلمان صاحب کی دِل چسپی کا خاص موضوع ہیں۔ اسی لیے انھوں نے مولانا سید محمد میاں کی معرکہ آرا تصنیف علمائے حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے کو از سر نو ترتیب دیکر اور اس میں اضافے کر کے شائع کر دیا ہے۔ اب ابو سلمان صاحب کی تالیفات و تعلیقات کی تعداد سوا سو سے متجاوز ہو چکی ہے اور ماشاء اللہ ان کا قلم بدستور رواں دواں ہے۔ اللھم زد فزد۔

اوپر جو کچھ عرض کیا گیا وہ فاضل مصنف کے کاموں کا محض ایک اجمالی خاکہ ہے ورنہ اس کی تفصیلات کے لیے پورا دفتر درکار ہے۔ مثلاً مولانا حسین احمد مدنی کی سیاسی ڈائری آٹھ جلدوں پر محیط ہے جن میں سے دو ضخیم جلدیں شائع ہو چکی ہیں اور مولانا آزاد اور مولانا عبید اللہ سندھی پر تو ان کا کام اتنا زیادہ ہے کہ اس کا ایک دفتر میں بھی سمانا ممکن نہیں ہے۔ ہم اپنے اکابر کو بھلا چکے ہیں یا ان سے ہماری واقفیت صرف ان کے ناموں اور چند سنی سنائی باتوں تک محدود ہے۔ ہمارے علمائے کرام کا اس برصغیر کی سیاسی تاریخ، بالخصوص تحریک حرّیت میں کتنا حصہ ہے اسے جاننے اور یاد رکھنے کی فرصت آج کسے ہے۔ اسیران مالٹا یا ریشمی رومال تحریک ہمارے لیے بس چند اصطلاحیں ہیں۔ مولانا محمد علی کے بارے میں ہم زیادہ سے زیادہ یہ جانتے ہیں کہ انھوں نے راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں کہا تھا کہ میں غلام ملک میں واپس نہیں جاؤں گا، مجھے آزادی دو یا قبر کے لیے دو گز زمین۔ مولانا آزاد کی شخصیت اور فکر کے ابعاد تک ہم میں سے کتنوں کی رسائی ہے اور کون جانتا ہے کہ اس ملک میں کبھی کوئی اشفاق اللہ خاں نام کا نوجوان تھا جو جذبۂ حب وطن سے سرشار مادر وطن کی عظمت کے ترانے گاتا ہوا ہنسی خوشی تختۂ دار پر جھول گیا تھا۔ اِن بزرگوں کا یہ ہم سب پر قرض ہے جسے ایک تن تنہا شخص نے اپنی فکر سلیم اور ہمت جواں کے سہارے کراچی میں بیٹھ کر ادا کیا ہے اور اب کہ وہ عمر عزیز کی ساتویں دہائی (Three Scores and Ten) پوری کرنے والا ہے اس کا علمی مشغلہ بدستور جاری ہے۔ ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہاں پوری کی عمر میں برکت اور صحت و توانائی میں ترقی کی دعاء کے ساتھ ختم کلام گرچہ ہزار سخن باقی۔

ریاض الرحمٰن شروانی
حبیب منزل، علی گڑھ
۳؍ فروری ۲۰۰۴ء

حصہ اوّل

سوانح اور ادب و سیاست
تعارف اور تبصرے کی ایک نظر

باب اوّل:

حالاتِ زندگی

(مولد و منشا اور تعلیم)

وطن مالوف:

شاہجہاں پور صوبہ یوپی کا ایک مردم خیز شہر ہے۔ نواب بہادر خاں نے بہ عہد صاحب قران ثانی شاہجہاں بادشاہ ۱۰۴۷ھ (۱۶۳۷ء) میں اس کی بنیاد رکھی تھی اور دس سال بعد ۱۶۴۷ء میں قلعہ کی تعمیر پر رسماً اس کی تکمیل ہوئی تھی۔ اگرچہ اس کی تعمیرات اور آبادی کا سلسلہ اس کے بعد تک جاری رہا۔ بادشاہ وقت کے نام پر اس کا نام شاہ جہاں پور رکھا گیا۔ شاہجہاں پور ضلع بھی ہے اور ضلع کا صدر مقام بھی۔

شاہجہاں پور پشاور سے کلکتہ جانے والی مین ریلوے لائن پر لکھنؤ سے ایک سو ایک میل پہلے آتا ہے۔ دہلی کے بعد مراد آباد، رام پور، بریلی اس سے پہلے ریلوے اسٹیشن آتے ہیں۔ ریلوے لائن شہر کے بیچ سے گزرتی ہے۔ اس کے قریب ہی جی ٹی (گرانٹ ٹرنک) روڈ ہے۔ شاہجہاں پور سے گرّا اور کھنوت نامی دو دریا بھی گزرتے ہیں۔ شاہجہاں پور کی ابتدائی آبادی دونوں دریاؤں کے سنگم میں واقع تھی، لیکن اب ان کے بیرونی کناروں سے باہر دور تک پھیلتی چلی گئی ہے۔ شاہ جہاں پور بریلی، فرخ آباد، ہردوئی اور سیتاپور کے اضلاع سے گھرا ہوا ہے۔ اس کی زمین زرخیز اور آب و ہوا نہایت خوش گوار اور صحت بخش ہے۔ مؤلف تاریخ شاہ جہاں پور اس کی آب و ہوا کے بارے میں لکھتے ہیں:

> "شاہ جہاں پور بہ اعتبار عمدگی و لطافت آب و ہوا ہمیشہ سے ضرب المثل ہے۔
> اس صوبے (یوپی) کا کوئی شہر بہ اعتبار عمدہ آب و ہوا کے شاہ جہاں پور سے برابری کا دعویٰ نہیں کر سکتا"۔ (ص ۲۰)

شاہجہاں پور کی سرزمین سے ہر دائرہ زندگی میں اعاظم رجال پیدا ہوئے۔ علماء وفضلاء صوفیہ و مشائخ، اولیائے کرام، پنڈت، سادھو سنت، محقق و مصنف، ادیب و شاعر، اطباء، وید، ڈاکٹر، وطن کے جاں نثار اور مجاہد، جن میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل ہیں۔ شاہ جہاں پور کی تاریخ کا قابلِ فخر سرمایہ ہیں۔ مؤلف تاریخ شاہجہاں پور لکھتے ہیں:

''یہاں کی خاک سے بڑے بڑے علمائے ربانی، خدا پرست صوفی، شہ سوار، شاعر اور اہل ہنر پیدا ہوئے''۔ (ص۲۱)

تہذیب، طرزِ زندگی، رسم و رواج، زبان وغیرہ میں شاہ جہاں پور کا اپنا انداز اور خاص سیرت ہے۔

تاریخِ شاہجہاں پور:

تاریخ شاہ جہاں پور کے مولف نے تاریخ کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا حصہ شہر اور ضلع کی تاریخ، اس کے قصبات و دیہات، تحصیلوں، تھانوں، آبادی، اس کے طبقات، انتظامی تقسیم، پیداوار، زراعت، تجارت، تعلیم، دریاؤں، سڑکوں، آثار قدیمہ، بانی شاہجہاں پور کے سوانح، شہر کی تعمیر، مسلمانوں اور ہندوؤں کے طبقات، ان کی آبادی کی ترتیب، پٹھانوں کے مختلف خیلوں اور ان کے محلوں کی آبادی، دیگر معلومات اور خصوصیات کے تذکرے میں ہے۔ پہلا حصہ ایک سو ستاون صفحات پر مشتمل ہے۔

دوسرا حصہ شاہ جہاں پور کے اکابر و مشاہیر کے تذکرے کے لیے وقف ہے اور طبقۂ مشائخ عظام، طبقۂ علمائے کرام، طبقۂ اطبا، طبقۂ شعرا، طبقۂ خوانین واہل فن، مشاہیر اہل ہنود، اصحابِ فنون لطیفہ میں سیکڑوں اشخاص کا تذکرہ مرتب کر دیا ہے۔ یہ حصہ تین سو اٹھاون صفحات میں ختم ہوا ہے۔

مؤلف تاریخ شاہجہاں پور:

اس کے مؤلف مولوی محمد صبیح الدین میاں خلیل شاہ جہاں پوری ہیں۔ تاریخ شاہجہاں پور، نامی پریس، لکھنؤ میں چھپی تھی اور دسمبر ۱۹۳۲ء میں شائع ہوئی تھی۔ مؤلف موصوف ایک خاص ذوق کے مالک تھے۔ وہ میونسپل بورڈ کے ممبر رہے، آنریری مجسٹریٹ ہوئے پھر انھیں اسپیشل مجسٹریٹ بنا دیا گیا ان تعلقات کی بنا پر ان کا مزاج اور انداز فکر ایک خاص سانچے میں ڈھل گیا تھا۔

مولف موصوف نے سالہا سال کی محنت و مشقت کے بعد ۱۵/ اکتوبر ۱۹۳۱ء کو تالیف مکمل کی۔ اگرچہ اس وقت تک ملک میں ایک عظیم انقلاب آچکا تھا۔ اور عوام کے دلوں سے انگریز کا خوف اور حکومت کا رعب نکل چکا تھا لیکن حکومت سے فاضل مولف کی وفاداری و بہی خواہی واخلاص اور عمل میں رواداری اور تعلقات میں استواری کا پیمانہ اس سے بلند تھا کہ وقت کی تحریکات اور سیاسی آب و ہوا اسے متاثر کرتی۔ انھوں نے شاہ جہاں پور کے سیاسی کیریکٹر کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے، اس میں ان کا مخصوص نقطہ نظر رہا ہے یا انھوں نے اس کے تذکرے سے قلم کو آلودہ ہونے سے بچایا ہے۔ کاش اس میں ایک باب شہدائے وطن اور مجاہدین آزادی کا بھی ہوتا!

مولوی محمد کفایت اللہ:

حضرت مفتی اعظم مولانا محمد کفایت اللہ کا تعلق اس مردم خیز سرزمین سے تھا۔ مولف تاریخ شاہ جہاں پور لکھتے ہیں:

> "مولوی کفایت اللہ صاحب، والد کا نام شیخ عنایت اللہ، مولد شاہ جہاں پور محلہ سن زئی ہے، مدرسہ دیوبند میں فراغ حاصل کیا۔ کچھ دنوں مدرسہ عین العمین شاہ جہاں پور میں کام کیا پھر دہلی جاکر مدرسہ امینیہ میں مدرس ہوگئے اور وہیں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ مشاہیر علمائے عصر میں آپ کا شمار ہے۔ جمعیت علمائے ہند کے صدر ہیں۔ آپ کے علم و فضل، حق گوئی و دین داری کی بیرون جات میں کافی شہرت ہے۔ قومی کاموں میں خاص طور سے دل چسپی ہے۔ جس کی وجہ سے اخباری دنیا میں بہت مشہور ہیں۔ ترک موالات کے حامی رہے ہیں۔ کاش! مولانا پالی ٹیکس سے علیحدہ رہتے اور اپنا سارا وقت درس و تدریس اور وعظ و پند میں صرف کرتے۔ کیوں کہ فی زمانا مسلمانوں کی علمی واخلاقی اصلاح کی سخت ضرورت ہے۔ کانگریس کی تحریک کی بدولت اکتوبر ۱۹۳۰ء میں چھ ماہ کا جیل ہوا اور لندن کانفرنس کے بعد لیڈران قوم کے ساتھ آپ بھی رہا ہوئے"۔
>
> (تاریخ شاہ جہاں پور، حصہ دوم، ص ۸۹-۱۸۸)

مولف کا سیاسی ذوق اور مکتبہ فکر خواہ کچھ ہو، انھوں نے آزادی کی جدوجہد میں

شاہجہاں پور کا کردار خواہ مسخ کر دیا ہو، خواہ پیش ہی نہ کیا ہو اور خواہ انھوں نے حضرت مفتی صاحب کے بارے میں خاندانی تعصب میں طنزیہ اسلوب اختیار کیا ہو اور اپنے ذوق کے مطابق یا کسی اور وجہ سے کوئی غلط توقع قائم کر لی ہو یا غلط خیر خواہانہ مشورہ بھی دے رہا ہو، لیکن ہمیں خوشی ہے کہ وہ چند اچھائیوں سے انکار نہ کر سکے اور حقیقتوں کا اعتراف انھیں کرنا ہی پڑا۔ مثلاً:

۱۔ مشاہیر علمائے عصر میں آپ کا شمار ہوتا ہے۔

۲۔ جمعیت علمائے ہند کے صدر ہیں۔

۳۔ آپ کے علم و فضل، حق گوئی و دین داری کی بیرون جات میں کافی شہرت ہے۔

۴۔ قومی کاموں میں خاص طور سے دل چسپی ہے۔

۵۔ ترک موالات کے حامی رہے ہیں۔

۶۔ کانگریس کی تحریک کی بہ دولت اکتوبر ۱۹۳۰ء میں چھ ماہ کا جیل ہوا۔

مفتی صاحب کی تعلیم:

حضرت مفتی صاحب نے ابتدائی تعلیم اپنے وطن مالوف شاہ جہاں پور کے مشہور مدرسہ عربیہ اعزازیہ میں حاصل کی۔ اس کے بعد وہ مراد آباد کے مدرسہ قاسم العلوم معروف بہ مدرسہ شاہی میں چلے گئے۔ البتہ فراغت انھوں نے دارالعلوم دیوبند سے کی تھی۔ تکمیل کا سال ۱۳۱۵ھ / ۱۸۹۷ء ہے۔

مدرسہ اعزازیہ شاہ جہاں پور میں حافظ بدھن خاں (ف ۱۹۲۱ء) اور مولانا عبید الحق خاں (۱۹۰۳ء) دارالعلوم دیوبند میں آپ کے اساتذۂ حدیث میں مولانا عبد العلی میرٹھی (ف ۱۹۲۸ء) اور شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی (ف ۱۹۲۰ء) رحمہما اللہ تعالیٰ اور دیگر علوم و فنون میں مولانا منفعت علی دیوبندی (ف ۱۹۰۹ء)۔ مولانا حکیم محمد حسن دیوبندی (ف......) مولانا غلام رسول خاں (بغوی) ہزاروی (ف ۱۹۱۸ء)، مولانا خلیل احمد (انبیٹھوی) سہارن پوری (ف ۱۹۲۷ء) وغیر ہم رحمہم اللہ تعالیٰ اجمعین تھے۔

دارالعلوم میں مولانا امین الدین اورنگ آبادی بانی مدرسہ امینیہ دہلی، مولانا محمد انور شاہ کشمیری، مولانا سید حسین احمد مدنی وغیر ہم نامور علماء آپ کے ہم درس تھے۔

حضرت مفتی کفایت اللہ اپنے ذوق علمی اور تفقہ میں حضرت شیخ الہند کے تمام

تلامذہ میں ایک خاص شان کے مالک اور دیگر علوم وفنون میں گہری نظر رکھتے تھے۔وہ بہ یک وقت محدث، فقیہ، مفسّر، مفتی، محقق، مصنف اور اردو، فارسی، عربی کے شاعر تھے۔سیاسیات میں خاص ذوق اور بصیرت کے مالک تھے۔ان کا علم گہرا، رائے صائب،، ذہن متوازن، فیصلوں میں اعتدال، مزاج میں منصفی اور میانہ روی ان کی شان تھی۔ترک موالات کا فتویٰ لکھنے کے لیے حضرت شیخ الہند نے اپنے جن دو تلامذہ پر اعتماد کیا تھا، ان میں پہلا نام حضرت مفتی کفایت اللہ کا تھا۔ علی گڑھ کے طلبہ کے استفتا کے جواب کا مسودہ حضرت مفتی صاحب ہی نے تیار کیا تھا۔جس پر حضرت شیخ الہند نے نظر ثانی فرما کر دستخط ثبت کیے تھے۔ مفتی صاحب کے تدبر اور اصابت رائے کے بارے میں یہ روایت مولانا سید محمد میاں شیخ الاسلام حضرت مدنی سے حضرت شیخ الہند کی یہ وصیت کفایت کرتی ہے کہ ارکان جمیعت علمائے ہند کو چاہیے کہ وہ دو آدمیوں کو کبھی نہ چھوڑیں۔" ان میں سے ایک حضرت مفتی صاحب تھے۔

مدرسہ عین العلم شاہ جہاں پور:

حضرت مفتی صاحب ۱۸۹۷ء میں دار العلوم دیوبند سے فارغ ہو کر شاہجہاں پور چلے گئے تھے۔اس وقت ان کے استاد مولانا عبید الحق خاں مدرسہ اعزازیہ سے الگ ہو کر محلہ مہمند ہدف میں اپنا مدرسہ عین العلم قائم کر چکے تھے۔ شفیق استاد نے ان کے پہنچتے ہی ان کے لیے مسند درس آراستہ کر کے شائقین علم کی ایک جماعت تعلیم وتربیت کے لیے ان کے حوالے کر دی تھی۔

مدرسہ امینیہ اسلامیہ دہلی سے تعلق:

حضرت مفتی اعظم نے اسی زمانے میں ایک رسالہ جاری فرمایا۔ بانی مدرسہ مولانا عبید الحق خان کے انتقال کے بعد مولانا امین الدین اورنگ آبادی ثم دہلوی کے اصرار پر مفتی صاحب شوال ۱۳۲۱ھ / ۱۹۰۳ء میں دہلی تشریف لے گئے۔جہاں انھیں صدر مدرس اور مفتی کے عہدے پر فائز کر دیا گیا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ بانی و مہتمم مدرسہ حضرت اورنگ آبادی نے مدرسہ کا تمام کام رفتہ رفتہ حضرت مفتی صاحب کے حوالے کر دیا تھا۔ بانی و مہتمم مفتی صاحب کے کام میں مداخلت نہ کرتے تھے اور خود حضرت کے مشورے کے بغیر کوئی قدم نہ اٹھاتے تھے اور ان کے انتقال (۱۹۲۰ء) کے بعد تو مفتی صاحب سیاہ وسپید کے مالک تھے، لیکن

حضرت کے اخلاص وایثار کا یہ عالم تھا کہ بیس روپے جو مشاہرہ مقرر کیا گیا تھا، وہ اڑتالیس برس کے بعد جمادی الاخری ۱۳۷۰ھ (اپریل ۱۹۵۱ء) تک ڈھائی سو روپے تک پہنچا تھا۔ اسی ماہ سے پچیس روپے اضافہ تجویز ہوا تھا، لیکن حضرت نے وہ اضافہ قبول نہیں کیا۔ ہر ماہ کی تنخواہ میں اضافہ لگایا جاتا تھا اور حضرت اضافی رقم مدرسے کے چندے میں جمع کرادیتے تھے۔ وفات تک ان کا یہی معمول رہا۔

خانوادۂ ولی اللّٰہی کی جانشینی:

حضرت مفتی صاحب اپنے ہم درس اور دوست مولانا امین الدین کے اصرار سے دہلی تشریف لے گئے تھے اور پھر ہمیشہ کے لیے دہلی کے ہوگئے۔ دہلی ان کا وطن ثانی بن گیا۔ دہلی ان کے وطن مالوف شاہ جہاں پور سے کم نہ تھا۔ شاہ جہاں پور کی زمین میں ان کے نسلی بزرگوں کی ہڈیاں دفن تھیں اور دہلی کی زمین ان کے دینی وروحانی بزرگوں کا مدفن تھی۔ شاہ عبدالرحیم، شاہ ولی اللہ، ان کے چار عظیم فرزند اور ان کے خانوادہ علمی ودینی کے کتنے ہی نامور دہلی کی خاک میں آسودہ خواب ابدی تھے۔ ہمیں حضرت مفتی صاحب کے شاہ جہاں پوری ہونے پر فخر ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کا اصل مرکز دینی وروحانی دہلی اور ان کا مقام علمی خانوادہ ولی اللّٰہی کی جانشینی اور اصل شرف ملت اسلامیہ کی رہنمائی تھا۔ انھوں نے دہلی میں رہتے ہوئے جو دینی وعلمی اور قومی وملی خدمات انجام دیں، وہ ولی اللّٰہی خاندان کے جانشین ہی کے شایان تھیں اور دہلی ہی میں وفات پاکر جوارِ رحمت الٰہی میں انھیں بزرگوں کے پاس پہنچ گئے۔ وہ اسی مقام کے سزاوار تھے۔

زندگی پر ایک نظر:

حضرت مفتی اعظم عیسوی کلینڈر کے حساب سے ۱۸۷۵ء میں پیدا ہوئے تھے اور بیسویں صدی کے پورے باون سال گزار کر اٹھہتر برس کی عمر میں انتقال فرمایا تھا۔

انھوں نے ۱۸۹۷ء میں دارالعلوم دیوبند سے فراغت حاصل کی تھی اور اسی سال شاہ جہاں پور کے مدرسہ عین العلم میں درس وتدریس سے عملی زندگی کا آغاز کیا تھا۔ اس طرح ان کی زندگی کے پچپن برس درس وتدریس اور دینی خدمت میں بسر ہوئے تھے۔

۱۹۰۳ء میں دہلی کے مدرسۂ امینیہ اسلامیہ میں صدر مدرس ومفتی کی حیثیت سے

ان کا تقرر ہوا تھا۔ اسی وقت وہ شاہ جہاں پور سے دہلی منتقل ہوئے تھے۔ اس لیے دہلی ان کا وطن مالوف ثانی بن گیا۔ زندگی کے بقیہ ایام انھوں نے دہلی میں گزارے۔ قیام دہلی سے ان کی زندگی کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ اسی دور میں ان کی سیاسی زندگی کا آغاز ہوا، ارتقاء کے مراحل طے ہوئے اور شہرت عام حاصل ہوئی۔ سیاست کے آغاز کی کوئی تاریخ متعین نہیں کی جاسکتی البتہ چند امور کی نشان دہی کی جاسکتی ہے:

۱- سیاسی ذوق انھیں حضرت شیخ الہند سے ورثے میں ملا تھا۔

۲- دہلی کی سیاسی آب و ہوا اور اس میں حکیم محمد اجمل خاں، ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی صحبتوں نے اسے پختہ کیا۔

۳- ۱۹۱۱ء کے بعد مولانا محمد علی کے کلکتہ سے انتقال مکانی، ہمدرد اور کامریڈ کے دہلی سے اجرا نے اس میں رنگ بھرا۔

۴- کلکتہ سے دارالحکومت کی تبدیلی اور دہلی کی سیاسی مرکزیت کے قیام، ملکی اور غیر ملکی مشاہیر وقت کی آمد و رفت، متعدد اخبارات و رسائل کے اجرا نے دہلی کو سیاسی سرگرمیوں کا مرکز بنا دیا تھا۔

۵- اس دوران میں دہلی کے اکابر اور ملک کے مشاہیر اہل سیاست اور اصحاب علم و نظر سے مفتی صاحب کے تعلقات نے نہ صرف ان کے سیاسی ذوق کو پختہ اور اس کے رنگ کو چوکھا کر دیا تھا بلکہ ان کی عملی سرگرمیوں میں بھی رفتہ رفتہ بہت اضافہ کر دیا تھا۔ نیز ان کی حیثیت نہ صرف ملک گیر ہو گئی تھی بلکہ ان کی شہرت اسلامی ممالک سے بھی آگے یورپ تک پہنچ چکی تھی۔

یکم جنوری ۱۹۵۳ء کو جب وہ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے احاطے کے قریب دفن کیے جا رہے تھے تو یہ شاہجہاں پور کے ایک سابق باشندے، دارالعلوم دیوبند کے ایک مولوی اور مدرسہ امینیہ اسلامیہ کے شیخ الحدیث اور مہتمم کی تدفین نہ تھی، بلکہ عالم اسلام کے ایک جید فقیہ، وقت کے مفتی اعظم، علوم و فنون اسلامی کے متبحر عالم و محقق، جنگ آزادی کے صف اوّل کے رہنما، عظیم محبِ وطن اور قوم پرور اور وقت کے بے مثال مدبر کی زندگی کی آخری رسوم کی ادائیگی کا عمل انجام دیا جا رہا تھا۔

اور تقریباً نصف صدی کی ایک سرگرم سیاسی زندگی گزارنے اور قوم و وطن کی

آزادی کا عظیم الشان کارنامہ انجام دینے کے بعد وطن کی تعمیر کا کام وطن کے نوجوانوں کو اور آزادی کی تاریخ لکھنے کا کام وقت کے مورخ کے سپرد کر کے ابدی راحت و سکون کی تلاش میں اس نے چادر کھینچ کر دنیا سے اپنا چہرہ چھپالیا تھا۔

ان کے شاگرد رشید اور مدرسہ امینیہ کے استاد مولانا ضیاء الحق دہلوی نے سوانح کے ٹھیک اسلوب میں بیان کیا ہے کہ زندگی کے آخری تین مہینے انھوں نے سخت علالت میں گزارے تھے۔ یکم اکتوبر ۱۹۵۲ء کو طبیعت کی گرانی شروع ہوئی تھی۔ مرض نے طول پکڑا۔ ڈاکٹروں اور طبیبوں نے پوری توجہ اور جاں فشانی کے ساتھ علاج کیا، لیکن وقتِ موعود قریب آ پہنچا تھا، کوئی معالجہ، کوئی جاں فشانی اور معالجین کی عقیدت و ارادت اسے روک نہ سکی۔

بالآخر ۳۱؍دسمبر ۱۹۵۲ء و یکم جنوری ۱۹۵۳ء کی درمیانی شب میں ساڑھے دس بجے خانوادۂ قاسمی کا یہ لعل شب چراغ ہمیشہ کے لیے بجھ گیا اور رنج و غم کی تاریکی وطن عزیز کی فضا پر محیط ہو گئی۔

☆☆☆

باب دوم:

خدمات کے مختلف میدان

مفتی صاحب کی جامعیت:

حضرت مفتی صاحب کو اللہ تعالیٰ نے علم و عمل کی بہت سی خوبیوں سے نوازا تھا۔ انھوں نے کئی ادارے خود قائم کیے، بعض کے قیام کی تحریک کی، دوسرے اداروں کے ساتھ تعاون کیا، تحریکوں میں ساتھ دیا اور اپنے مقاصد کے لیے بھی ان سے کام لیا۔ ذیل میں بعض اداروں اور جماعتوں کی صرف نشان دہی کی جاتی ہے۔

۱- جمعیت الانصار (دیوبند) کے وہ رکن اور معاون تھے۔

۲- حضرت مفتی صاحب ۱۹۰۳ء میں دہلی تشریف لائے تھے۔ وہ مدرسہ امینیہ میں صدر مدرس اور مفتی کے عہدے پر فائز تھے۔ شروع شروع میں ان کی سرگرمیاں مدرسے میں درس و تدریس اور طلبہ کی تعلیم و تربیت تک محدود رہیں۔ سب سے پہلے انھوں نے ۱۳۲۸ھ / ۱۹۱۰ء میں ایک مجلس تقریر و مناظرہ قائم کی جس کا مقصد یہ تھا کہ طلبہ کو تقریر وخطابت میں تربیت دی جائے اور فرق و مذاہب باطلہ کے داعیوں سے مقابلہ و مناظرہ کے لیے انھیں تیار کیا جائے۔ ہفتہ وار اس کا جلسہ ہوتا تھا۔ مفتی صاحب اس میں پابندی سے شرکت فرماتے تھے اور ان فنون میں طلبہ کی تربیت فرماتے تھے۔ کچھ عرصے کے بعد مجلس کے نام کو "انجمن اصلاح الکلام" سے بدل کر اس کے دائرۂ عمل کو تقریر و مناظرہ سے بڑھا کر تقریر و تحریر تک وسیع کر دیا گیا۔

اور جوں جوں آپ کے ذوق علم و عمل کی شہرت پھیلتی گئی بیرون مدرسہ بھی آپ کی سرگرمیاں بڑھنے لگیں اور رفتہ رفتہ یہ نوبت آگئی کہ مولانا محمد ظہور علی صاحب بھوپال کے بہ قول:

"۱۹۱۹ء سے ۱۹۵۲ء تک دہلی میں کوئی سیاسی اور مذہبی تحریک ایسی نہیں ہے

جس میں حضرت مفتی صاحب کی رہبری پوری صداقت و صفائی کے ساتھ نظر نہ آئے"۔ (مفتی اعظم کی یاد، ص ۱۷۴)

حقیقت یہ ہے کہ ان کی سیاسی و مذہبی سرگرمیوں کا دور ۱۹۱۹ء سے بہت پہلے شروع ہو گیا تھا۔ ۱۹۱۹ء تک تو ان کا ملک کے سربرآوردہ رہنماؤں میں شمار ہونے لگا تھا۔ ان کے سیاسی و مذہبی فتوؤں اور سیاسی ذوق و عمل اور اصابت رائے کی ملک میں شہرت پھیل گئی تھی۔

۳- انجمن اعانت نظر بندان اسلام دہلی، ۱۹۱۷ء میں قائم ہوئی تھی۔ حضرت مفتی صاحب اس کے قیام کے داعیوں اور بانیوں میں تھے لیکن انھوں نے اس کے ذمہ داروں اور عہدے داروں میں شامل ہونے کے بجائے اس کے معاونوں اور خدمت گذاروں میں شامل کر لیا تھا۔ اس کے اشاعتی منصوبوں کے مشیر و نگراں وہی تھے اور حضرت شیخ الہند کے سوانح اور حالات اسیری میں تاریخی رسالہ آپ ہی کی تالیف ہے۔

۴- ۱۹۱۸ء اور ۱۹۱۹ء میں مسلم لیگ، خلافت کمیٹی اور تحریک خلافت کے جلسوں اور ان کی سرگرمیوں میں حصہ لینے کے واقعات معلوم و مشہور ہیں۔

اسی زمانے میں جب جنگ عظیم کا خاتمہ ہوا اور برٹش گورنمنٹ نے بہ شمول برطانیہ، ہندوستان اور اپنے دیگر مقبوضات میں جشن فتح منانے کا فیصلہ کیا اور ہندوستان میں قدرے مختلف نام "جشن صلح" کے نام سے فریب دیکر اہل ہند کو اس میں شریک کرنے کی کوشش کی تو اس کے خلاف "انجمن اشاعت اختلاف جشن صلح، دہلی، کا قیام عمل میں آیا۔ اس کے صدر ڈاکٹر مختار احمد انصاری تھے اور لالہ شنکر سیکریٹری ہوم رول لیگ دہلی، تاج الدین ایڈیٹر تاج، جبل پور اور پروفیسر اندر ایڈیٹر وجے انجمن کے تین سیکریٹری مقرر ہوئے لیکن پس منظر میں سب سے بڑی کارگذار شخصیت مفتی محمد کفایت اللہ کی تھی۔

۵- جمعیت علمائے ہند کے وہ بیس سال تک صدر رہے تھے۔ وہ اس کے قیام کے داعی و محرک اور اس کے بانیان میں سے تھے اور ۱۹۳۹ء کے بعد جب کہ وہ اس کی صدارت سے سبک دوش ہو گئے تھے۔ اس کے سرگرم رکن اور اس کے بڑے رہنماؤں میں شامل تھے۔ بہ قول مولانا محمد ظہور علی (بھوپالی):

"آج کی جمعیت علماء مرحوم کی سیاسی و مذہبی اعلیٰ بصیرت اور ایثار و جانفشانی کی زندہ نشانی ہے"۔ (مفتی اعظم کی یاد، ص ۱۷۴)

۶- مجلس تحفظِ ناموس شریعت شدھی و سنگٹھن کے فساد کے زمانے میں مسلمانوں کے دماغ اور دین کے تحفظ کے لیے قائم کی تھی۔ یہ مجلس ۲۳-۱۹۲۲ء میں قائم ہوئی تھی۔ جب کبھی شریعت کے مسئلے میں تحریک چلانے کی ضرورت پیش آتی تھی اس کی طرف سے لٹریچر شائع کیا جاتا تھا۔ ایک مدت تک یہ مجلس سرگرمِ عمل رہی اور خاصا اہم لٹریچر بھی فراہم کیا۔ اور بعض مواقع پر اس کے زیر اہتمام "ڈے" بھی منائے گئے۔ سارداایکٹ کے خلاف اسی مجلس کے تحت تحریک چلائی گئی تھی اور ۱۷ر جنوری ۱۹۳۰ء کو ڈے منایا گیا تھا اور "قانونِ شریعت کی حفاظت" کے نام سے مفتی صاحب کی ایک نادر تحریر بھی شائع کی گئی تھی۔

۷- جمعیت علمائے ہند کے ایک ادارے کے طور پر تحریک فلسطین کے اجرا کے لیے "مجلس تحفظ فلسطین" کا قیام عمل میں آیا تھا۔

۸- شروع سے کانگریس کے ممبر تھے۔ تحریک آزادی اور دیگر قومی تحریکات مثلاً تحریک ستیہ گرہ (۱۹-۱۹۱۸ء)، تحریک سول نافرمانی، (۱۹۳۰ء وبعدہٗ)، سائمن کمیشن (۱۹۲۷ء) کی واپسی کی تحریک، شہزادہ ویلز کے مقاطعے کی تحریک (۱۹۲۱ء) ہندوستان چھوڑدو تحریک (۱۹۴۲ء) میں شریک و معاون تھے۔

۹- ایک زمانے میں کانگریس کے مسلمان ممبر مسلم لیگ کے ممبر بھی ہو سکتے تھے۔ حضرت مفتی صاحب، حکیم محمد اجمل خاں، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، مولانا محمد علی، مولانا ابوالکلام آزاد وغیرہم کانگریس اور مسلم لیگ دونوں جماعتوں کے ممبر رہے تھے۔ اور ایک وقت میں دونوں جماعتوں کے پلیٹ فارموں پر دیکھے جاتے تھے۔ اسی رعایت سے ڈاکٹر انصاری ۱۹۱۸ء میں لیگ کے سالانہ جلسے کے صدر مجلس استقبالیہ تھے اور ان کا خطبہ حضرت مفتی اعظم نے تحریر کیا تھا جو ضبط ہوا تھا۔

۱۰- بعد میں مسلم لیگ نے پابندی لگادی کہ مسلم لیگ کارکن کانگریس کا ممبر نہیں ہو سکتا۔ اس وقت ملک کی تمام حریت پسند جماعتوں اور ان کے رہنماؤں سے مفتی صاحب کے تعلقات نے مقاصد کی راہ میں کامیابی کو ممکن بنادیا۔ یہ جماعتیں ایک دو نہیں دسیوں تھیں۔ مثلاً:

پنجاب میں احرار اسلام، سرحد میں خدائی خدمت گار، سندھ میں یونائٹڈ اور بلوچستان میں وطن پارٹیاں، صوبہ یوپی میں مومن کانفرنس، مسلم مجلس، جمعیت القریش، شیعہ

پولیٹیل پارٹی، بہار میں انڈی پن ڈنٹ، بنگال میں پرجا پریشک وغیرہ پارٹیاں سیاست میں جمعیت علمائے ہند کی ہم نوا اور معاون تھیں۔ ان میں کئی جماعتیں آل انڈیا تھیں اور بعض کا دائرہ اثر ایک صوبے سے دوسرے صوبے تک وسیع تھا۔ حضرت مفتی صاحب کے ان جماعتوں کے رہنماؤں سے ذاتی تعلقات اور روابط تھے اور قومی و ملی کاموں میں ان کا تعاون حاصل تھا۔

۱۱-اس سلسلے میں مرکزی خلافت کمیٹی کا ذکر رہ گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کی زندگی کی سرگرمیاں بزرگانِ دیوبند کی فکری اور عملی رہنمائی کی رہین منت تھیں اور ۱۹۲۲ء کے بعد جوں جوں تحریک خلافت کی ضرورت ختم ہوتی گئی اور بزرگان دیوبند کا تدبر اس کا رہنمانہ رہا، خلافت کمیٹی محض ایک بے جان اور غیر موثر ادارہ بن کر رہ گئی یا ایک خاندان کا ذریعہ معاش! بہرحال کبھی خلافت کمیٹی ملک کا ایک سرگرم، پُرجوش اور نہایت موثر قومی ادارہ تھا۔ اس نے تحریک خلافت کے زمانے میں نہایت اہم کردار ادا کیا تھا۔

۲۳ر نومبر ۱۹۱۹ء کو دہلی میں خلافت کمیٹی کی جو کانفرنس مولوی فضل الحق کی صدارت میں ہوئی تھی، حضرت مفتی اعظم نے اس میں جشن صلح کے بائیکاٹ کی تجویز پیش کی جس کی علماء کے علاوہ سیٹھ محمد چھوٹانی اور کاندھی جی نے تائید کی اور تجویز پاس ہو گئی۔ بلا شبہ اس وقت کے حالات ایسے ہی تھے کہ ہوش سے کام لیا جاتا تو تجویز پاس ہو جاتی لیکن ہوش اور حکمت سے کام لینا اور وقت سے فائدہ اٹھانا حضرت مفتی صاحب کی ذہانت کا خاص جوہر تھا۔

دینی خدمات کے مختلف میدان:

دینی و ملی خدمات کا نصب العین بچپن سے ان کے سامنے تھا۔ طالب علمی کا سارا زمانہ اسی خدمت کے لیے تعلیم و تربیت کے نصاب پر مبنی تھا۔ ۱۸۹۷ء میں تعلیم سے فراغت کے بعد شاہجہاں پور پہنچے اور عملی خدمت کے دور کا آغاز ہوا جو زندگی کے آخری ایام تک تقریباً پچپن برسوں کے روز و شب پر محیط ہے۔ درس و تدریس، تصنیف و تالیف، وعظ و تقریر، مذاکرہ و مناظرہ اس خدمت کے اسالیب و طرق تھے۔ سب ایک دوسرے سے مربوط اور تمام بہ یک وقت جاری تھے۔

عیسائیوں سے مناظرے کا مقصد:

سب سے پہلے مدرسہ عین العلم میں مسند درس و تدریس آراستہ کی تھی کہ تھوڑے ہی عرصے میں عیسائیوں سے مناظرے، ان کے رد، اسلام کے دفاع اور اسلام کی دعوت

و تبلیغ کا میدان نمودار ہو گیا۔ حضرت مولانا اعزاز علی امروہوی علیہ الرحمہ، شیخ الادب والفقہہ دار لعلوم، دیوبند، نے جو حضرت مفتی صاحب کے نامور شاگرد ہیں، عیسائیوں سے مناظرے کے کئی واقعات بیان کیے ہیں۔ اسی طرح حافظ ذاکر علی وکیل شاہ جہاں پوری جو حضرت مفتی صاحب کے خصوصی تلامذہ میں سے تھے، کی روایت سے مولانا قاری محمد طیب قاسمیؒ نے ایک پادری سے مناظرے کا واقعہ بیان کیا ہے۔

قادیانیت کا تعاقب:

یوں تو پنجاب کی طرح قادیانیت کا ہنگامہ تو برپا نہ تھا، لیکن فتنہ موجود تھا اور علمائے حق اور اہل نظر اس سے غافل بھی نہ تھے۔ حضرت مفتی صاحب نے دینی عملی زندگی کے آغاز میں اس کے انسداد کی اہمیت اور ضرورت کو محسوس فرمالیا تھا۔ اس لیے سفر و حضر میں اس کے رد کے لیے ہمیشہ مستعد رہے۔ ان کی زندگی میں متعدد واقعات قادیانیوں سے مناظرے اور ان کے رد اور تردید کے ملتے ہیں۔ اس فرض کی ادائیگی کے لیے انھوں نے شاہجہاں پور سے البرہان نامی ایک ماہانہ بھی جاری کیا تھا۔ ”جس میں قادیانیت کے رد میں ایک مستقل و مسلسل مضمون بہ عنوان ”احسن البیان“ آپ خود تحریر فرماتے تھے۔“ (جمعیت علماء پر ایک تاریخی تبصرہ از مولانا حفیظ الرحمٰن واصف، دہلی (۱۹۶۹ء)، ص ۱۰۰

البرہان کے اجرا کا خاص مقصد ہی قادیانیت کی تردید تھا۔ مفتی صاحب خود اس کے ایڈیٹر تھے۔ اس کا پہلا پرچہ شعبان ۱۳۲۱ھ (نومبر ۱۹۰۳ء) میں شائع ہوا تھا۔ شوال میں حضرت مفتی صاحب دہلی چلے گئے۔ بہ قولِ حضرت واصف:

> یہ رسالہ آپ کے دہلی تشریف لے جانے کے بعد زیادہ عرصے جاری نہ رہ سکا“۔ (جمعیت علماء پر ایک تاریخی تبصرہ از مولانا حفیظ الرحمٰن واصف، دہلی، ۱۹۶۹ء، ص ۱۰۰)

رسالے کے مینیجر مولوی سلطان حسن میاں (حضرت کے شاگرد رشید مولانا مفتی مہدی حسن کے بڑے بھائی) تھے۔

دعوت و تبلیغ:

تحریک خلافت اور ترک موالات کے انتشار کے زمانے میں جب شدھی و سنگٹھن

اور تبلیغ، تنظیم کے زمانے میں حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ کے مساعی کے کئی میدان تھے۔ سب سے پہلے تو جمعیت علمائے ہند میں شعبۂ تبلیغ قائم کیا۔ اس کی طرف سے مبلغ مقرر کیے، انھیں مختلف علاقوں میں بھیجا، تبلیغی وفود مرتب کیے اور خود بھی وفود لے کر مختلف علاقوں میں تشریف لے گئے اور فتنہ پردازوں سے مقابلہ کیا اور جہاں ارتداد کے واقعات رونما ہوئے تھے۔ وہاں ان لوگوں سے ملے اور انھیں دوبارہ اسلام قبول کرنے پر آمادہ کیا۔ اس سلسلے میں ان کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے کانگریس کو اس طرف متوجہ کیا اور سنجیدہ برادران وطن کو اس ہنگامے کے عواقب ونتائج اور ملک کا امن اور قومی اتحاد غارت کرنے میں برٹش بیورو کریسی کی کامیابی پر توجہ دلائی کہ اہل وطن آپس میں لڑ رہے ہیں اور دشمن دور کھڑا خوشی سے تالیاں بجا رہا ہے! وہ اپنی کوشش میں ناکام نہیں رہے۔ ۱۹۲۴ء کی اتحاد کانفرنس حضرت مفتی صاحب کے انھیں مساعی کا نتیجہ تھی۔

☆☆☆

باب سوم:

جمعیت علمائے ہند کے داعی اوّل

(سیاسی زندگی کا آغاز)

حضرت مفتی صاحب نے جمعیت علمائے ہند کے اراکین میں سب سے پہلے ملکی سیاست میں حصہ لینا شروع کیا تھا۔ جمعیت کے قیام سے بھی تقریباً تین سال پہلے مفتی صاحب نے لیگ کانگریس کے میثاق لکھنؤ پر جو تبصرہ لکھا تھا وہ ان کے تدبر، نکتہ رسی اور سیاسی ذوق کی واضح مثال ہے۔

غالباً یہ پہلا نقش تھا جو ان کے سیاسی ذوق و تدبر نے ملک کے سیاسی ذہن پر ثبت کیا اور اسی کا نتیجہ تھا کہ ۱۹۱۹ء میں جمعیت علمائے ہند کے کاروان نے ملک اور قوم کی خدمت کی راہ میں اپنے سفر کا آغاز کیا تو میر کارواں کی حیثیت سے حضرت مفتی صاحب کا انتخاب عمل میں آیا۔

جمعیت علمائے ہند کے داعی:

نومبر ۱۹۱۹ء میں خلافت کانفرنس کے موقع پر دہلی میں ملک کے جو اکابر علمائے دین جمع ہوئے تھے، ان میں حضرت مفتی صاحب شامل ہوئے تھے۔ ان علما نے جمعیت کے قیام کا فیصلہ تو کر لیا تھا لیکن مستقل صدر اور دیگر عہدے داروں کا انتخاب عمل میں نہیں آیا تھا۔ یہ مرحلہ امرتسر کے جلسہ دسمبر ۱۹۱۹ء میں طے پایا۔ اس موقع پر مولانا عبدالباری فرنگی محلی کی صدارت میں جلسہ ہوا اور مستقل صدر کی حیثیت سے حضرت مفتی صاحب کو چن لیا گیا۔ یہ کسی جلسے کی صدارت کا محض رسمی انتخاب نہ تھا بلکہ ہندوستان میں مختلف مکاتب فکر کے سب سے بڑے مجمع علماء کے صدر کا انتخاب تھا۔ حضرت مفتی صاحب کو منتخب کیا جانا ان کے سیاسی ذوق، کمالِ تدبر اور اس منصب کے لیے ان کی اہلیت و صلاحیت کو ملک کے اکابر علمائے دین، اصحابِ فکر اور اہلِ نظر و رائے کا خراج تحسین بھی تھا۔

حضرت مفتی صاحب جمعیت علمائے ہند کے صدر ہی نہیں، اس کے بانیان میں

سر فہرست داعی و محرک اوّل اور سب سے سر گرم رکن وہی تھے۔ ان کا مدرسہ امینیہ جمعیت کا مرکز اور ان کا کمرۂ خاص اس کا دفتر تھا اور وہ دفتر کے ریکارڈ کے ذمہ دار اور مالیات کے محاسب تھے۔

مولانا حفیظ الرحمٰن واصف نے لکھا ہے کہ مفتی صاحب کو علمائے ہند کی ایک جماعت کے قیام کا خیال اس وقت آیا تھا جب وہ نظر بندان اسلام کے تعارف کے سلسلے میں ۱۹۱۸ء میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن کے حالات میں ایک رسالہ لکھ رہے تھے۔ یہ بات انھوں نے مولانا احمد سعید دہلوی کے حوالے سے لکھی ہے۔ واصف نے مزید لکھا ہے:

> ''جمعیۃ علمائے ہند کی تاسیس کے وقت آپ کو نائب صدر بنایا گیا تھا۔ اور جمعیۃ کی صدارت حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب کے لیے محفوظ رکھی گئی تھی جو اُس وقت مالٹا میں نظر بند تھے۔ چنانچہ جمعیۃ کے دوسرے اجلاس منعقدۂ دہلی کی صدارت حضرت شیخ الہند نے فرمائی۔ اگرچہ علالت کی وجہ سے جلسہ تشریف نہ لا سکے۔ اور اجلاس کے بعد ہی حضرت کا وصال ہو گیا۔ اس کے بعد ۱۹۳۹ء تک حضرت مفتی صاحب جمعیۃ کے صدر رہے آپ کی بے نفسی و خلوص کی ایک ادنیٰ مثال یہ ہے کہ اپنی صدارت کے طویل زمانے میں آپ نے سالانہ اجلاسوں کی صدارت نہیں کی بلکہ بہت سے گوشہ نشین علماء کو صدارت کے ذریعہ سے عوام میں روشناس اور سیاسی دنیا میں متعارف کرایا''۔ (جمعیت پر ایک تاریخی تبصرہ، ص ۱۰۱)

حضرت شیخ الہند کی وطن واپسی (جون ۱۹۲۰ء) کے بعد عام طور پر یہ خیال تھا کہ جمعیت کا مستقل صدر انھیں کو بنایا جائے گا لیکن حضرت رحمۃ اللہ کی زندگی نے وفا نہ کی۔ جمعیت کے دوسرے سالانہ جلسہ دہلی (۱۹، ۲۰، ۲۱ر نومبر ۱۹۲۰ء) کے بعد ایک عشرے میں حضرت نے مقام اعلیٰ علیین کا سفر اختیار فرمایا اور جوار رحمت الٰہی میں ابدالآباد تک کے لیے جا آباد ہوئے۔ حضرت کے سفر آخرت اختیار فرمانے کے بعد حضرت مفتی صاحب ہی کی رہنمائی اور کار فرمائی پر ملک کا اتفاق ہوا۔ اور ۱۹۳۹ء تک اس منصب رہنمائی پر آپ ہی فائز رہے۔ اس دوران میں جمعیت علماء کے بارہ سالانہ جلسے ہوئے، لیکن مفتی صاحب نے ایک بار بھی صدر بننا گوارا نہ کیا۔ ہر بار اپنا دامن بچالیا اور دوسرے کو صدر بنوایا۔ یہ مفتی صاحب کے کمال بے نفسی کی بڑی دلیل ہے۔ اور جب ۱۹۳۹ء میں صحت کی کمزوری اور بعض دیگر وجوہ سے

(تفصیل کے لیے دیکھیے: مفتی اعظم کی یاد میں، مضمون مولانا حفیظ الرحمٰن واصف، ص ۲۰۲)
جمعیت کی مستقل صدارت سے سبک دوشی کا قطعی عزم فرمالیااور شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی پر صدارت کی ذمہ داری آپڑی، تب بھی اسی دلچسپی اور سرگرمی کے ساتھ فرصت اور صحت کی حد تک جمعیت کی خدمت میں مصروف رہے۔

خدمات جلیلہ کااعتراف:

جمعیت کی صدارت سے سبک دوشی پر جمعیت کے بارہویں اجلاس منعقدہ جون پور میں مفتی صاحب کی خدمات کے اعتراف میں ایک قرارداد میں کہا گیا:

> ''جمعیت علمائے ہند کا یہ عام اجلاس حضرت علامہ مفتی کفایت اللہ صاحب متع اللہ المسلمین بطول بقائیہ کی ان خدمات جلیلہ کا صدق دل کے ساتھ اعتراف کرتا ہے جو انھوں نے ابتدائے قیام جمعیت علمائے ہند کے وقت سے بہ حیثیت مستقل صدر جمعیت علمائے ہند مذہبی وملی خدمات مخلصانہ طور پر انجام دی ہیں اور جمعیت علمائے ہند کو یقین ہے کہ یہ حضرت ممدوح کی خداداد قابلیت اور صلاحیت اور حسن تدبیر سے ہمیشہ مستفید ہوتی رہے گی''۔

(جمعیت علمائے ہند (دستاویزات-۴۵-۱۹۱۹ء، مرتبہ پروین روزینہ، قومی ادارہ برائے تحقیق تاریخ وثقافت، اسلام آباد، ۱۹۸۱ء جلد دوم، ص ۷۰۳)

ایک بھرپور علمی وعملی زندگی:

حضرت مفتی اعظم نے ایک بھرپور سیاسی زندگی گزاری، لیکن وہ جلسوں اور جلوسوں کی رہنمائی، صدارتوں اور استقبالیوں اور دعوتوں کی تحسین وآفرین کے ہنگاموں سے ہمیشہ الگ تھلک رہے۔ انھوں نے تحریکوں میں حصہ لیا۔ دومرتبہ جیل بھی گئے، سزا بھی بھگتی۔ لیکن ان کی رہنمائی کاانداز دوسروں سے قطعی مختلف تھا۔ تقریر وخطابت سے ان کے شوق کا پتا نہیں چلتا۔ لیکن وہ کمیٹیوں اور مذاکروں کی بحث میں حصہ لیتے تھے۔ رپورٹیں مرتب کرتے، دستور بناتے اور قواعد وضوابط ترتیب دیتے تھے، تجویزیں اور قراردادیں مرتب کرتے تھے۔ فیصلوں پر نقد کرتے تھے۔ سیاسی مسائل پر بحث کرتے تھے، استفسارات کے جواب لکھتے، اخبارات میں مراسلات اور بیانات دیتے تھے۔ اندرون وبیرون ملک قومی اور ملی کانفرنسوں

میں شریک ہوتے اور سرگرم حصہ لیتے تھے۔ سب کمیٹیوں اور وفود میں شامل ہوتے تھے اور ضرورتاً سفر بھی کرتے تھے، لیکن ان کا اصل ذوق درس و تدریس، تصنیف و تالیف، ذکر واذکار اور گوشہ نشینی اور خدمت گزینی تھا۔

۱۹۳۰ء میں حضرت مفتی صاحب پہلی مرتبہ گرفتار ہوئے تو جمعیت علمائے ہند کے قائم مقام صدر کی حیثیت سے حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی نے فرائض انجام دیے۔ ۱۵، ۱۶؍ جنوری ۱۹۳۱ء کو حضرت شیخ الاسلام کی صدارت میں مجلس عاملہ کا جو جلسہ ہوا تھا، اس میں حضرت مفتی صاحب کی اسارت پر ان کے لیے تہنیت کی قرارداد پاس کی گئی۔ اس قرارداد میں مفتی صاحب کی مذہبی و ملکی خدمات اور اسارت کے مصائب کو عزم واستقلال کے ساتھ برداشت کرنے پر انھیں ہدیۂ تبریک پیش کیا ہے۔ قرارداد میں کہا گیا تھا:

> ”جمعیۃ علماء ہند کی مجلس عاملہ کا یہ جلسہ حضرت علامہ مفتی محمد کفایت اللہ صاحب صدر جمعیۃ علماء ہند کی مخلصانہ خدمات مذہبی و ملکی اور ملی کا صدق دل سے اعتراف کرتا ہے۔ اور آزادی کی رہنمائی کے سلسلہ میں اسارت فرنگ کے مصائب کو عزم واستقلال کے ساتھ برداشت کرنے پر ان کی خدمت میں ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہے اور ان کی اس سیرت جلیلہ کو امت مسلمہ بالخصوص علماء امت کے لیے قابلِ تقلید اسوۂ حسنہ یقین کرتا ہے۔ (جمعیت العلماء کیا ہے؟ حصہ دوم، ص ۱۷۵)

حضرت مفتی صاحب اپنی سیاسی زندگی میں دو مرتبہ گرفتار ہوئے۔ پہلی بار چھ ماہ کی اور دوسری بار ڈیڑھ برس کی، کل دو برس کی سزا ہوئی۔

قید و بند کی آزمائش:

آج تو سیاسی زندگی ایک شوق، دلچسپ مشغلہ، ایک تفریح اور پیشہ بھی ہے۔ اگر کوئی کامیاب نہ ہو اور مسند اقتدار تک نصیب یاوری نہ کرے تو حزب اختلاف بن لینا بھی گھاٹے کا سودا نہیں، لیکن جس زمانے میں حضرت مفتی صاحب نے میدان سیاست میں قدم رکھا تھا، سیاست دانوں کے لیے خطرات ہی خطرات تھے۔ قید اور مشقتیں تھیں، نظر بندی کی تنہائی اور بیکاری تھی، جائداد کی ضبطی اور ذرائع معاش کی تباہی اور دار و رسن کا خطرہ تھا۔

حضرت مفتی صاحب کو دو مرتبہ قید و بند کی آزمائش سے گزرنا پڑا۔ اور تقریباً ڈھائی برس کے لیے جیل جانا پڑا۔

☆ پہلی دفعہ سول نافرمانی کی تحریک میں بہ قول مولانا حفیظ الرحمٰن واصف:

"۱۹۳۰ء کی تحریک سول نافرمانی میں آپ بے انتہا باغیانہ اور خطرناک تقریریں کرنے کے جرم میں ۱۱؍اکتوبر کو اپنے دولت خانہ واقع کوچہ چیلان سے رات کے چار بجے گرفتار کیے گئے"۔

گرفتاری کے انتظامات کی تفصیل کے بعد مولانا واصف لکھتے ہیں:

"تقریباً چار بجے کوتوال، مجسٹریٹ وغیرہ آپ کے دولت خانے پر آئے۔ گھر کی عورتیں، بچے وغیرہ سب خوف زدہ تھے اور آپ نہایت استغنا کے ساتھ ان کے ہمراہ تشریف لے جا رہے تھے... دہلی جیل میں مجسٹریٹ نے آپ کو چھ ماہ قید بامشقت اور اے کلاس کا حکم سنایا اور گجرات جیل میں منتقل کر دیا۔ ڈاکٹر مختار احمد انصاری، خان عبدالغفار خان، مولانا احمد سعید دہلوی، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، مسٹر آصف علی وغیرہم گجرات جیل میں آپ کے ساتھ تھے"۔ (مفتی اعظم کی یاد، ص ۹۰-۸۹)

☆ ۱۹۳۲ء میں دوسری مرتبہ سول نافرمانی کی تحریک شروع ہوئی، جمعیت علماء میدان میں آئی اور آپ کو پہلا ڈکٹیٹر بنایا گیا تو بہ قول واصف صاحب:

"دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی کے لیے ۱۱؍مارچ ۱۹۳۲ء بروز جمعہ جلوس اور جلسہ کا اعلان کیا گیا۔ جامع مسجد شاہجہانی میں بعد نماز جمعہ جلسہ ہوا اور آپ نے جلوس میں پُرامن طریقے اختیار کرنے کی تلقین فرمائی۔ اور جامع مسجد سے یہ عظیم الشان جلوس چلا جس میں ایک لاکھ نفوس تھے۔ جلوس کی رہنمائی آپ خود فرما رہے تھے۔ آزاد پارک عقب ٹاؤن ہال جلوس پہنچا اور وہاں جلسہ مرتب کیا گیا۔ وہاں دیوی دیال (کوتوال شہر) اور عبدالواحد قادیانی، سب انسپکٹر پولیس کی بڑی بھاری جمعیۃ کے ساتھ موجود تھے۔ آپ ایک بنچ پر کھڑے ہو کر اپنا طوفانی بیان پڑھنا چاہتے تھے کہ پولیس نے بے تحاشا لاٹھی چارج شروع کر دیا۔ نتیجے عوام سراسیمہ ہو گئے۔ لاٹھی چارج بہت شدید تھا۔

سیکڑوں آدمی زخمی اور ادھ موئے ہوگئے۔ آپ کے بائیں طرف مولانا عبدالحلیم صدیقی اور دائیں طرف ماسٹر ہلال احمد زبیری تھے اور سامنے راقم الحروف آکر کھڑا ہو گیا تھا۔ مولانا عبدالحلیم کے کئی چوٹیں آئیں۔ زبیری صاحب کی کلائی کی ہڈی ٹوٹی اور راقم الحروف کے کندھے اور بازوؤں پر کئی لاٹھیاں پڑیں۔ ڈیڑھ دوماہ تک علاج جاری رہا۔

پولیس کے بے رحمانہ لاٹھی چارج سے جب عوام منتشر ہوگئے تو کوتوال آپ کو گرفتار کر کے کوتوالی لے گیا اور وہاں سے جیل بھیج دیا گیا۔ سیاسی اسیروں کے مقدمات کے لیے جیل میں عدالت قائم کی جاتی تھی۔ آپ کو ۱۸ ماہ قید با مشقت اے کلاس کا حکم سنایا گیا۔ اور نیو سنٹرل جیل ملتان میں رکھا گیا"۔

(مفتی اعظم کی یاد، ص۹۱-۹۰)

قید و بند سے گریز اور اس کا سبب:

حضرت مفتی اعظم کی طویل سیاسی زندگی، پے در پے تحریکات کے ہنگاموں اور ان میں مفتی صاحب کی سرگرمیوں کو دیکھتے ہوئے ان کی گرفتاریوں کی تعداد اور قید و بند کے ایام بہت کم ہیں۔ اگر سیاست میں کسی کے مقام کے تعین کے لیے ان کی تعداد کو معیار بنایا جائے تو ان کے مقابلے میں جمعیت علماء کے کئی دوسرے رہنما اور کارکن ان سے آگے ہوں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک سیاست دان کی حیثیت اور مقام کے تعین کے لیے تنہا یہی معیار کافی نہیں ہے۔ ایک شخص تنہا اپنی زندگی میں بہت بے دھڑک اور نڈر ہو سکتا ہے۔ وہ آگ میں کود سکتا ہے اور سمندر میں چھلانگ لگا سکتا ہے۔ لیکن اگر اس پر ایک جماعت کی رہنمائی کی ذمہ داری ڈال دی جائے، ایک تحریک کو چلانے کا فرض سونپ دیا جائے۔ اسے صرف تیغ آزمائی نہ کرنی ہو بلکہ اسے ایک فوج کو لڑانا پڑے تو پھر اسے اپنی بے باکی، بے خوفی، دشمن سے تنہا تیغ آزمائی اور بہادری کو ایک ضابطے کا پابند کرنا پڑے گا۔ اب اس کا مقصد اپنی جان نثار کر دینا ہی نہیں، سیکڑوں سپاہیوں کی جانوں کا تحفظ بھی اس کا فرض ہوگا۔ ایک سپاہی کے لیے تو یہ شرف ہو سکتا ہے کہ اس کے جسم پر زخموں کو شمار کر لیا جائے لیکن ایک سپہ سالار کی خوبی یہ ہوگی کہ اس نے ایک چھوٹی فوج سے اور اپنے سپاہیوں کے کم سے کم نقصان پر کتنی بڑی کامیابی حاصل کی۔

ایک سیاست داں بھی بہ یک وقت کئی باتوں کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ وہ جماعت کے نظم کو برقرار رکھتا ہے۔ جماعت کے مختلف کاموں کو جاری کرتا ہے، انھیں آگے بڑھاتا ہے۔ تحریک کے مختلف محاذوں کی نگرانی کرتا ہے، علمی اور فکری محاذ پر اپنے مقدمے کو مضبوط بناتا ہے اور عملی قوتوں سے استعمار پر یلغار کر کے اسے پسپا ہونے پر مجبور کرتا ہے۔ جو کارکن محاذ پر ہوں اور جو ان سے آگے جیل جاچکے ہوں، ان کے پس ماندگان کی دیکھ بھال کرتا ہے اور نئے کارکنوں کو تیار کرتا ہے۔ انتظامات، ان کی نگرانی اور رسد کی فراہمی کا ایک ختم نہ ہونے والا سلسلہ ہوتا ہے۔ ان سب کاموں کے لیے ہمہ وقت توجہ، ان کے جزو کل پر نظر، کار فرما دماغ اور ایک منتظم شخصیت کی ضرورت ہوتی ہے۔

حضرت مفتی اعظم میں ان مختلف ذمہ داریوں کو اٹھانے کی بہترین صلاحیتیں بہ درجہ اتم موجود تھیں۔ وہ اپنی ذات سے تحریک میں شریک ہونے اور گرفتاری پیش کردینے کے مقابلے میں اس سے بڑے کاموں کو انجام دینے کی قابلیت رکھتے تھے۔ اس لیے ایک طے شدہ حکمت عملی کے تحت انھیں پس پردہ کام کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی تھی۔ مولانا حفیظ الرحمٰن واصف مرحوم نے اپنے مقالے میں اس طرف اشارہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> "رولٹ بل ۱۹۱۹ء کے خلاف جب گاندھی جی نے خلافت کمیٹی کی شرکت میں تحریک ستیہ گرہ شروع کی تو حضرت مفتی صاحب بڑے انہماک سے اس تحریک میں حصہ لے رہے تھے۔ آپ کے دولت خانے پر لیڈروں کے بڑے بڑے اہم مشورے ہوتے تھے مگر آپ حکمت عملی کے ساتھ پوشیدہ کام کرتے رہے گرفتاری کا موقع نہیں آنے دیا۔ آپ کے رفقائے کار (حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر ایم۔ اے انصاری، مولانا محمد علی،) ہرگز آپ کی گرفتاری کو پسند نہیں کرتے تھے۔ کیونکہ پس منظر میں بیک وقت خلافت کمیٹی اور جمعیت علمائے ہند کے روح رواں آپ ہی تھے"۔
>
> (نقش حیات، مقالہ، مشمولہ، مفتی اعظم کی یاد، ص ۸۹)

☆☆☆

باب چہارم:

تحریکیں اور کانفرنسیں

بزرگانِ دیوبند کی سیاسی تحریک:

علمائے دیوبند کے حوالے سے اگر جمعیت علمائے ہند کی تحریک کے پس منظر پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سید احمد شہید کی تحریک اصلاح و نفاذ سے بزرگان دیوبند کا شدید ذہنی ربط و تعلق تھا۔ اس تحریک کے عقیدت مندوں نے ۱۸۵۷ء کے معرکے میں حصہ لیا تھا۔ شاملی کے جہاد میں ان کے بزرگوں کو قید، ہجرت اور شہادت کی آزمائشوں سے گزرنا پڑا تھا۔ ان میں سے جن حضرات نے دارالعلوم دیوبند کی بنیاد ڈالی تھی، ان کے ذہن میں خصوصاً حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کے ذہن میں آئندہ سیاسی جدوجہد کے لیے ایک مرکز کے قیام کی ضرورت کا تصور ضرور موجود تھا۔ اس تصور کے مطابق انھوں نے اپنے شاگرد رشید مولانا محمود حسن کی تربیت کی تھی۔ مولانا محمود حسن نے ۱۸۸۰ء میں ثمرۃ التربیت کے قیام سے اس ذوق کی تخم ریزی کی اور نشوونما کا آغاز کیا اور ۱۹۰۹ء میں جمعیت الانصار کی تحریک سے نئے دور کی تاریخ کا ورق اٹھا۔ ان کا اگلا قدم افغانستان اور ترکی کی حکومتوں اور ہندوستان کے حریت پسند انقلابی گروہ میں روابط کا قیام تھا۔ ان حالات کا لازمی تقاضا ایک نئی جماعت کا قیام تھا۔ جو آئینی حدود کے اندر رہتے ہوئے استعمار کے خلاف جدوجہد کے نئے دور کا آغاز کر سکے۔ یہ محض اتفاق تھا کہ ملک میں غیر دیوبندی علماء کی ایک تعداد موجود تھی جس نے اسی انداز میں سوچا تھا اور فکر کے اسی مقام پر پہنچ چکی تھی کہ سیاست کے نئے دور کا آغاز کیا جائے۔ مولانا مفتی محمد کفایت اللہ شاہ جہاں پوری کی تحریک سب کے لیے اقدام و سعی کا موجب بن گئی اور جمعیت علمائے ہند کا قیام عمل میں آگیا۔ اگر مختلف مکاتب فکر کے علماء اقدام میں تساہل کرتے اور معیت نہ کرتے جمعیت علمائے ہند کا قیام تب بھی عمل میں آتا۔ اس لیے کہ ثمرۃ التربیت کے قیام سے فکر کی تخم ریزی کا جو عمل صالح انجام دیا گیا تھا اس نے

نشو ونما کا ایک دور مکمل کر لیا تھا اور اگر اس وقت کے علمائے دیو بند بھی وقت کے اس تقاضے کو محسوس نہ کرتے تو اقدام وسعی میں سبقت کا یہ شرف دوسرے حاصل کر لیتے۔ نئے دور کے تقاضے کا احساس عام تھا۔ خواہ سیاسی اور ذہنی و فکری تربیت دوسروں کی علمائے دیو بند جیسی نہ ہو۔ ۱۹۱۳ء میں علمائے فرنگی محل (لکھنؤ) کی انجمن خدام کعبہ اور مولانا ابوالکلام آزاد کی جماعت حزب اللہ کا قیام اس کا بین ثبوت ہے۔

بہت تھوڑے فرق کے ساتھ جمعیت علمائے ہند کی تحریک دار العلوم دیو بند کی تحریک یا اس کی ایک شاخ تھی۔ ٹھیک ٹھیک اسی طرح دیو بند کے وہ علمائے کرام جنھوں نے تحریک پاکستان میں حصہ لیا تھا، ان کے دعوے کو بالکل رد نہیں کر دیا جا سکتا کہ پاکستان کی تحریک بھی بزرگان دیو بند کے سیاسی مقاصد ہی کی ایک شکل تھی۔ اس لیے کہ دونوں گروہوں میں اختلاف آزادی کے نصب العین اور آزادی کے بعد مسلمانوں کی آبرو مندانہ اور اجتماعی اسلامی زندگی کے قیام کے باب میں نہ تھا۔ اصل نزاع یہ تھا کہ مطلوبہ اسلامی زندگی متحدہ ہندوستان میں میسر آسکتی ہے یا نہیں؟ بلاشبہ جمعیت علمائے ہند کے بزرگوں کے دلائل بہت قوی تھے اور نصف صدی سے زیادہ کی تاریخ نے انھیں کی اصابت رائے پر مہر صداقت ثبت کی ہے۔ لیکن انصاف یہ ہے کہ:

(۱)- لیگی رہنماؤں کی بے دینی اور بداعمالیوں کے لیے ہم مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا ظفر احمد تھانوی، مفتی محمد شفیع کو الزام نہیں دے سکتے۔ کیا شریف اور دین دار آدمی دھوکا نہیں کھا سکتا؟

(۲)- ہم اس سے بھی انکار نہیں کر سکتے کہ انسان خواب بھی دیکھتا ہے اور زندگی میں خوش فہمیوں کا بھی ایک مقام ہوتا ہے۔

(۳)- ہم اس کے لیے بھی کسی کو الزام نہیں دے سکتے کہ مطلوبہ نتائج کسی خاص مدت میں کیوں حاصل نہیں ہو گئے۔ اگر پاکستان میں اسلامی نظام یا حکومت الٰہیہ کا قیام تیسری نسل کے جوان ہو جانے تک عمل میں نہیں آسکا تو آئندہ صدی تک کامیابی سے ہم کیوں مایوس ہو جائیں۔ زندگی میں تجربات کی بھی اہمیت ہوتی ہے۔ پچپن برس کے تجربات سے فائدہ اٹھا کر بائیسویں صدی کو ہم قریب لا سکتے ہیں۔

لیکن افسوس کہ پاکستان میں اسلامی نظام اور حکومت الٰہیہ کے قیام کی یہ منزل بہت

دور ہو چکی ہے اور اس تک عدم رسائی کا احساس روز بہ روز عام ہوتا جارہا ہے۔

حضرت مفتی اعظم نے کامل بیس سال تک جمعیت علمائے ہند کی رہنمائی کی اور جب وہ جمعیت کی صدارت سے الگ ہوئے تو سیاست انھوں نے ترک نہیں کردی تھی۔ وہ اس کے بعد بھی وفات تک اپنی صحت اور فرصت کی گنجائش کی حد تک سیاست میں حصہ لیتے رہے۔ انھوں نے سیاسی دعوت اور عمل دونوں میدانوں میں اپنے تدبر اور پختہ سیرت کا ثبوت پیش کیا ہے۔

جشن صلح کے خلاف تحریک (۱۹۱۹ء):

جنگ عظیم اول میں دول متحدہ کی فتح ہوئی۔ اس کی غیر مسلم ریاستیں اس سے الگ کردی گئی اور اسے صلح کی شرائط میں اس طرح جکڑ دیا گیا کہ اس کے اقتدار کی نفی تک بات پہنچ گئی۔ برطانیہ اور اس کے مقبوضات و نو آبادیات میں جشن فتح یا بہ عنوان دیگر جشن صلح منانے کا فیصلہ کیا گیا۔ لیکن ہندوستان کے بیدار مغز اور حریت پسند طبقے نے کہا کہ شکست کے زخم اس لیے نہیں بھلائے جاسکتے کہ ان کے لیے ایک خوبصورت اصطلاح وضع کرلی گئی ہے۔ ترکی کو شکست کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ اس پر جشن نہیں سوگ منانا چاہیے۔ مسلمانوں کی رسوائی پر صف ماتم بچھانی چاہیے نہ کہ جشن مسرت کا اہتمام کیا جائے! مسلم لیگ حریت پسندوں نے جشن صلح کے مقاطعے کا فیصلہ کرلیا، خلافت کمیٹی کے پلیٹ فارم سے حضرت مفتی صاحب نے مقاطعے کی تجویز پیش کی اور پاس ہوگئی۔ کانگریس کا فیصلہ وہی تھا جو خلافت نے کیا تھا۔ ہندو مسلم کانفرنس زیر صدارت گاندھی جی خلافت کانفرنس کے دوسرے روز ۲۴/نومبر کو دہلی ہی میں تھی اس نے بھی مقاطعے کا متفقہ فیصلہ کردیا۔ اس وقت جمعیت علمائے ہند کا نقش تو ظہور پذیر نہ ہوا تھا لیکن اس کو وجود میں لانے والے تمام کار فرما دہلی میں موجود تھے اور دونوں کانفرنسوں میں شریک اور تحریک مقاطعہ جشن صلح کی نقش آرائی ذوق تدبر اور حریت نفسی کا نتیجہ تھا۔ اہل وطن کو ان کے اخلاص و تدبر پر اعتماد تھا۔ وہ انھیں کے ساتھ تھے۔ ہندوستان متحد تھا۔

حضرت مفتی صاحب نے خلافت کانفرنس (۲۳/نومبر ۱۹۱۹ء دہلی) میں جو تحریک مقاطعہ پیش کی تھی اور اس پر جو تقریر کی تھی ہم اسے "انجمن اشاعت اختلاف جشن صلح۔ دہلی" کے کتابچے "مسئلۂ خلافت و جشن صلح" سے نقل کرتے ہیں:

"مولانا کفایت اللہ صاحب دہلی نے تحریک پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ:

"شرعاً ایسی حالت میں کہ مقامات مقدسہ خلیفۃ المسلمین کے قبضے سے باہر ہیں اور بغداد شریف و بیت المقدس و نجف اشرف وغیرہ غیر مسلموں کے قبضے میں ہیں۔ مسلمان کسی طرح ایسی صلح کی خوشی میں شریک نہیں ہو سکتے۔ جس کا نتیجہ اس وقت تک اس کے سوا کچھ نہیں نکلا کہ امیر المومنین خلیفۃ المسلمین کے قبضۂ اقتدار سے ان کے ممالک نکال لیے گئے ہیں اور اسلام کی دنیاوی طاقت واقتدار کو زائل کیا جارہا ہے۔

آپ نے فرمایا:

"میں طبقۂ علماء سے ہوں اور شرعی نقطہ سے کہتا ہوں کہ مسلمان کسی طرح ایسی صلح کی خوشی میں شریک نہیں ہو سکتے اور اگر ہوں گے تو شرعاً گناہگار ہوں گے"۔ (صفحہ ۱۹-۱۸)

اس تقریر کے بعد مفتی صاحب نے ریزولیوشن پیش کیا تھا، وہ یہ ہے:

"یہ جلسہ ان دل دوز واقعات کو پیش نظر رکھ کر جو سلطنت ترکی کی خلافت، مقاماتِ مقدسہ اور سلطنت ایران کے متعلق اس صلح کے نتیجے کے طور پر پیش آئے مذہبی نقطہ نظر سے تجویز کرتا ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو جشن فتح میں کوئی حصہ نہ لینا چاہیے"۔ (ایضاً ص ۲۱)

اس کے علاوہ آصف علی سیکریٹری خلافت کمیٹی دہلی کے ایک استفتا کے جواب میں مفتی صاحب نے جشن فتح میں شرکت کے عدم جواز میں ایک فتویٰ بھی لکھا تھا جس کی تصدیق و توثیق میں پنجاب، سندھ، یوپی، بہار، وغیرہ کے بہت سے علمائے کرام نے دستخط فرمائے تھے۔ مفتی صاحب نے فتوے میں تحریر فرمایا تھا:

"یہ حالت موجودہ مسلمانوں کو تاوقتیکہ معاملات کا فیصلہ شرعی نقطہ نظر سے ان کے جذبات کے موافق نہ ہو جائے، جشن صلح یا فتح کی خوشی اور مسرت میں شریک ہونا قطعاً ناجائز ہے

فقط

محمد کفایت اللہ غفرلہ،

ایضاً، ص ۲۲

تحریک ستیہ گرہ (مقاومت بالصبر):

بیسویں صدی کی پہلی دودھائیوں کے اختتام تک پرجوش نوجوانوں کے سامنے قوت کے زور پر آزادی چھین لینے کا پروگرام تھا، لیکن زمانہ بہت آگے بڑھ گیا تھا۔ وقت کا تقاضا دوسرا تھا۔ ملک کے نہتے اور مسائل میں گرفتار عوام کے لیے کسی ایسے پرامن پروگرام کی ضرورت تھی جسے اختیار کر کے وہ دنیا کی سب سے بڑی اور جابر قوت کو رولٹ ایکٹ کے جابرانہ قوانین اور ان کے تحت حکومت کو نہایت ظالمانہ اختیارات واپس لینے پر مجبور کردیا جائے۔ یہی طریقۂ آزادی کے حصول کا تھا۔ اگرچہ یہ ایک طویل اور صبر آزما طریقہ تھا۔ ہندی میں اس کے لیے ستیہ گرہ "اور اردو میں "مقاومت بالصبر" کی ترکیب استعمال کی گئی تھی۔ کسی زبان کا کوئی لفظ یا ترکیب کسی شخص کے فہم کے لیے خواہ کتنا ہی نامانوس اور استعمال کے لیے خواہ کتنا ہی دشوار ہو، لیکن نام کے بدل جانے سے حقیقت نہیں بدل جاتی۔

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ اور ان کے رفقانے از خود اس پروگرام کی اہمیت اور افادیت وقت کے حالات میں محسوس کر کے جمعیت علمائے ہند کے قیام سے پہلے حصہ لیا تھا۔ ۱۹۲۰ء میں اور اس کے بعد تو یہ ہندوستان کی ایک معروف تحریک بن گئی تھی اور عام طور پر حریت پسند جماعتوں نے اسے اختیار کرلیا تھا اور رفتہ رفتہ انقلابی اور خفیہ جماعتیں بھی اس کی قائل ہوتی چلی گئیں۔

تحریک تطہیر حجاز:

شریف (گورنر) مکہ حسین نے خلافت اسلامیہ ترکی سے بغاوت کر کے جون ۱۹۱۷ء میں حجاز پر اپنا تسلط قائم کرلیا تھا۔ اس بغاوت پر اسے نہ صرف برطانیہ نے اکسایا تھا بلکہ پوری پوری مدد کی تھی۔ اس کے اس فعل سے نہ صرف ممالک اسلامیہ میں بلکہ ہندوستان کے مسلمانوں میں سخت بے چینی پھیل گئی تھی۔

قبضے کے بعد اس نے انتظام کی درستگی پر ضروری توجہ نہ دی۔ اس وجہ سے عالم اسلام بہ شمول مسلمانِ ہند میں اضطراب پھیلتا اور بڑھتا ہی رہا۔ اس کے علاوہ اس نے بعض ایسے اعمال انجام دیئے مثلاً، سابق ترکی حکام پر مظالم، ان کی گرفتاری اور انھیں انگریزوں کے حوالے کردینا، امن کے قیام سے غفلت، حضرت مولانا محمود حسن اور ان کے رفقا کو گرفتار

کر کے برطانوی حکام کے حوالے کر دینا اور جزیرہ مالٹا میں ان کی اسارت وغیرہ جن سے اس کے خلاف نفرت کے جذبات پھیلتے رہے۔

ان حالات نے امیر عبدالعزیز ابن سعود آل فیصل کو اس کے استیلا پر آمادہ کر دیا اور آٹھ سال کے اندر اندر اس کے اقتدار کا خاتمہ کر دیا اور مزید ایک سال کے اندر پورا عرب وحجاز امن وامان کا گہوارہ بن گیا۔ ابن سعود کے انتظام سے عالم اسلام اور ہندوستان کے مسلمانوں میں اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔ ہندوستان میں دیوبند کے حنفیوں اور دہلی، پنجاب کے اہلِ حدیث علماء نے عرب وحجاز کو حسین کے وجود سے پاک کرنے اور اس کے اقتدار کے نقش کو مٹانے میں خاص مدد کی تھی۔ چونکہ ۱۹۲۵ء کے اواخر تک عرب وحجاز ایک انقلاب سے گزر کر ایک نئے دور میں داخل ہو چکے تھے۔ تطہیر حجاز کے تمام اعمال حضرت مفتی صاحب کے دور صدارت میں انجام پائے تھے۔ اس سے وہ ہندوستان کے مسلمانوں کی جانب سے ان خدمات کے لیے داد وستد اور تحسین کے بجا طور پر سزاوار ہیں۔

عرب کو اپنے تحفظ میں لینے کے بعد ابن سعود نے ۲۶/ ذی قعدہ ۱۳۴۴ء / ۷ جون ۱۹۲۶ء کو مکہ مکرمہ میں عالم اسلام کے مطالبے پر ایک موتمر بلائی تھی۔ اس میں حضرت مفتی صاحب کی سربراہی میں جمعیت علمائے ہند کا ایک وفد شریک ہوا تھا۔ موتمر کے لیے جو سبجیکٹ کمیٹی تشکیل دی گئی تھی اس میں مفتی اعظم فلسطین کے بعد آپ کا نام تھا۔ حضرت مفتی صاحب نے موتمر کی کارروائی میں سرگرم حصہ لیا اور اپنے علم وتدبر، بصیرت اور اصابت رائے، اعتدال پسندی اور میانہ روی کا نقش موتمر کے تمام شرکاء کے قلوب پر نقش کر دیا، جس کا اعتراف عام طور پر کیا گیا۔

تبلیغ وتنظیم کی تحریک شدھی سنگٹھن کے جواب میں شروع کی گئی تھی جو انگریزی حکومت کے اشارے پر شروع کی گئی تھی اور جب شروع کر دی گئی تو مسلمانوں میں بھی ایسے لوگ مل گئے جنھوں نے فتنے کی آگ بھڑکانے میں کوئی کمی نہ کی۔ جمعیت علماء کے لیے ان حالات میں سخت آزمائش تھی۔

اسلام تبلیغی مذہب ہے۔ تبلیغ ہر مسلمان پر حسب استعداد فرض ہے اور اتحاد بین المسلمین اور نظم جماعت اور اعتصام بحبل اللہ سب مسلمانوں کی تنظیم ہی کے اعمال حقہ ہیں۔ مسلمانوں کی کسی آبادی میں، محلے کی چھوٹی سی مسجد میں قیام صلوٰۃ، نماز جمعہ کے اہتمام، عیدین

کے اجتماعات، حج کے مناسک، زکوٰۃ کے وصول و تقسیم کے شرائط نظم جماعت کے سلسلے ہی کے اعمال ہیں۔ ان سے ایک مسلمان ایمان کے دعوے کے ساتھ کیوں کر دست بردار ہو سکتا ہے۔ لیکن ۲۴-۱۹۲۲ء میں جو ہنگامہ برپا کر دیا گیا تھا وہ ایک سخت آزمائش تھی۔ یہ تبلیغ و تنظیم جو شدھی سنگٹھن کے جواب میں شروع کی گئی تھی۔ فرقہ وارانہ اتحاد کے خلاف برٹش استعمار کا ایک حربہ تھا جسے ہندوؤں اور مسلمانوں کے دونوں دائروں میں انگریزی حکومت کے بہی خواہوں نے استعمال کیا تھا۔ ان حالات نے ملک اور قوم کے بہی خواہوں کو ایک سخت آزمائش میں ڈال دیا تھا جو مسلمان حکومت کی ڈپلومیسی سے واقف تھے ان کے لیے سخت مشکل تھی، وہ نہ تبلیغ و تنظیم کی مخالفت کر سکتے تھے کہ اسلامی فرائض میں شامل تھے اور نہ تائید کرتے بنتی تھی۔ علمائے حق نے جن کے سرخیل اس وقت حضرت مفتی اعظم تھے جس تدبر سے وقت کے نازک حالات میں رہنمائی فرمائی ان کی اعلیٰ قیادت کے اعتراف کے لیے کافی ہے۔

مذکورہ موتمر میں شرکت کے لیے حضرت مفتی صاحب کی سربراہی میں جو وفد مکہ مکرمہ گیا تھا۔ اس میں ذیل کے اراکین مختلف حیثیتوں سے شریک تھے:

۱- مولانا مفتی کفایت اللہ شاہ جہاں پوری ثم دہلوی (رئیس وفد)
۲- مولانا عبدالحلیم صدیقی (پرائیوٹ سکریٹری رئیس وفد)
۳- مولانا محمد عرفان ہزاروی (سکریٹری وفد)
۴- علامہ شبیر احمد عثمانی دیوبندی (رکن وفد)
۵- مولانا احمد سعید دہلوی (رکن وفد)
۶- مولانا نثار احمد کانپوری (رکن وفد)

تحریک خلافت اور ترک موالات (۲۴-۱۹۲۲ء):

ترکی خلافت کے اقتدار کے استحکام، مملکت کی سرزمین اور اس کے حدود کے تحفظ، اقتدار واختیارات کے کامل نفوذ کے لیے اہل ہند کی منظم کوششوں - اور اس کے حدود مملکت میں مداخلت، اس کے محروسات میں بغاوت پھیلانے کی کوششوں اور اس کے مقبوضات کو اس سے الگ کرنے کی سازشوں، غیر مسلم رعایا - خاص طور پر عیسائیوں کو ترکی کے خلاف بھڑکانے کی حرکات، اس پر جنگ مسلط کر دینے کے خلاف منظم اعمال انجام دینے کا جو فیصلہ کیا

گیا تھا اس کا نام تحریک خلافت تھا۔

ترکی کے مقابل چوں کہ برطانیہ صف آرا اور محارب فریق تھا اور یہی مستعمرانہ قوت ہندوستان پر قابض تھی جس سے نجات کی ایک زوردار قومی تحریک چل رہی تھی، اس لیے خلافت کمیٹی کے مقاصد میں ہندوستان کی آزادی کا حصول بھی شامل کر لیا گیا تھا۔

تحریک خلافت کو کامیاب بنانے کے لیے جو پروگرام تجویز کیا گیا تھا، اس کا عنوان "ترک موالات" تھا۔ ترک موالات فی نفسہٖ مقصد نہ تھا۔ مقصد کے حصول کا ذریعہ تھا۔

یہ تحریک جمعیت علمائے ہند کے قیام سے پہلے سے چل رہی تھی اور علمائے دیوبند نے دامے، درمے، قدمے اور سخنے اس میں حصہ لیا تھا اور جمعیت کے قیام کے بعد حضرت مفتی صاحب کے زیر صدارت زیادہ منظم طریقے پر اس تحریک کو تقویت پہنچائی گئی تھی۔ اس لیے بہ حیثیت جماعت اگر کوئی تحسین کا مستحق تھا تو جمعیت علمائے ہند اور بہ حیثیت مکتبہ فکر کے کوئی حزب اس تحریک میں جان و مال سے خدمت انجام دے رہا تھا تو وہ دیوبندی حزب تھی۔ دیوبند کے علما اپنی ذہنی اور دماغی صلاحیتوں، علمی قابلیتوں، وقت و مال کے ایثار سے، جنگ میں مجاہدین کی حیثیت سے شریک ہو کر، زخمیوں کی مرہم پٹی کر کے، تحریروں، تقریروں، احتجاجوں سے کام لے کر، یورپ وفد بھیج کر، خلافت کمیٹی کے کاموں میں مدد دے کر، اس کے پروگراموں میں تعاون کر کے اس تحریک کو کامیاب بنانے کی کوشش کی تھی۔

۱۹۱۳ء میں جنگ بلقان کے موقعے پر جب دارالعلوم دیوبند کو بند کر دیا گیا تھا اور ترکوں کی امداد کے لیے چندوں کی فراہمی کی خاطر دارالعلوم کے اساتذہ اور طلبہ کے وفود مرتب کیے گئے تھے تو حضرت مفتی صاحب نے بھی مدرسہ امینیہ بند کر دیا تھا اور اساتذہ و طلبہ کو خدمت ملی کے اسی کام پر لگایا تھا۔ ان مساعی کے نتیجے میں جنگ بلقان میں ترکوں کے لیے مدرسہ امینیہ کی جانب سے جو امداد فراہم کی گئی تھی وہ تین ہزار آٹھ سو چورانوے روپے آٹھ آنے نو پائی تھی۔

حضرت مفتی صاحب دارالعلوم دیوبند کے فرزند عظیم کی حیثیت سے، مدرسۂ امینیہ کے شیخ الحدیث اور جمعیت علمائے ہند کے صدر کی حیثیت سے بھی تحریک کے صف اول کے رہنماؤں میں تھے اور اس کے مستحق کہ ان کا تاریخ میں تذکرہ اور ان کی خدمات کی تحسین کی جائے۔

مولانا قاری محمد طیب صاحب نے لکھا ہے:

''علمی اور درسی مصروفیات نے آپ کو قومی درد اور قومی خدمات سے بھی غافل نہیں رکھا۔ تحریک خلافت کے وقت آپ نے نہ صرف ملک و قوم کی سیاسی خدمات انجام دیں بلکہ جماعت علماء میں سیاسی تحریکات اور قومی خدمات کے سلسلے میں آپ کی حیثیت ایک بانی کی حیثیت ہے''۔

(مفتی اعظم کی یاد، ص ۱۲۸)

تحریک کشمیر (۱۹۳۱ء):

''تحریک کشمیر تاریخ احرارِ اسلام کا ایک عظیم اور قابلِ فخر باب ہے''۔

(سید ابو معاویہ ابوذر بخاری ابن امیر شریعت مولانا سید عطاءاللہ شاہ بخاری)

بلاشبہ اس میدان کے مرد احرار ہی تھے۔ انھوں نے اس تحریک کو شروع کیا اور اس راہ میں قربانیاں دیں، جیل گئے، نہایت تکلیفیں اٹھائیں اور مخالفتیں مول لیں۔ اس میدان میں انھیں چومکھی لڑنی پڑی۔ کشمیر کی حکومت، پنجاب کی حکومت، ہندوستان کی مرکزی حکومت، مسلم لیگ، قادیانی، یونینسٹ پارٹی، فرقہ پرست، سبھی ان کے مخالف تھے۔ لے دے کے ایک جمعیت علمائے ہند ان کی ہم خیال، ان کے دکھ درد کی شریک اور ان کے اخلاص وایثار کی معترف تھی۔ لیکن اس کے اپنے مسائل اور پروگرام تھے۔ وہ ان سے ہم دردی کر سکتی تھی، تھوڑا بہت تعاون بھی ممکن تھا۔ لیکن وہ اپنے کل وسائل اور تمام قوتوں کے ساتھ تحریک میں شریک نہیں ہو سکتی تھی۔

۱۹۳۱ء میں احرار اسلام نے تحریک کشمیر شروع کی تو ملک کے گوشے گوشے سے احرار رضاکاروں کا تانتا بندھ گیا۔ کشمیر حکومت کے لیے بڑا مسئلہ پیدا ہو گیا اور مرکزی اور پنجاب حکومتوں کے ایوانوں کے در و دیوار ہل گئے۔ بہ قول مولانا سید ابوذر غفاری:

''جب پون لاکھ احرار سرفروشوں کی یلغار نے کشمیر اور پنجاب کے جیلوں کا تمام نظام ڈھیلا کر کے رکھ دیا۔ اور اس کے دوررس سیاسی اور اقتصادی اثرات نے ملک کے عوام اور خواص سب کو جھنجھوڑ کر احرار سے ہم آہنگ ہونے پر مجبور کر دیا تو انگریز نے اکابر احرار سے گفتگوئے مصالحت کا ڈول ڈالا اور

جمعیت علمائے ہند کے بزرگوں کو واسطہ بنانے پر آمادگی ظاہر کی"۔

چنانچہ نومبر ۱۹۳۱ء کے اواخر سے جنوری ۱۹۳۲ء کے اختتام تک حضرت مفتی اعظم محمد کفایت اللہ اور سحبان الہند مولانا احمد سعید دہلی (صدر اور ناظم جمعیت علمائے ہند) نے وزیر اعظم کشمیر (ہری کشن کول) اور اسیر رہنمایان احرار سے ملاقاتیں اور مراسلت کر کے ہر چند کوشش کی کہ تصفیے کی کوئی راہ نکل آئے، لیکن یہ بیل منڈھے نہ چڑھی۔ اندازہ ہوا کہ واقعی تصفیے کی راہ حکومت کی مصلحتوں نے روک رکھی ہے۔ حکومت احرار سے تصفیہ کرنا نہیں چاہتی۔ تصفیے کی کوششوں سے ملک کے عوام کو فریب دینا اور مقاصد کی راہ میں احرار کے بے لچک رویے کو بہانہ بنا کر احرار کو بدنام کرنا اس کا مقصد ہے۔

کشمیر میں مسلم حقوق کی بحالی کے لیے جمعیت علمائے ہند کی ہمدردیاں اور تعاون ہمیشہ احرار رہنماؤں کے ساتھ رہا۔ جمعیت کے بزرگوں نے تحریک کشمیر اور آزادی کی راہ میں احرار رہنماؤں کے اخلاص، تدبر اور حکمت عملی پر اعتماد اور ان کی بے پناہ قوت عمل اور قربانیوں کا اعتراف کیا ہے۔

تحریک اتحاد:

اتحاد ہر ملک اور قوم کی ایک دائمی اور ناگزیر ضرورت ہے۔ اتحاد ملکی تعمیر و ترقی کی مستحکم بنیاد ہے۔ اس کے بغیر زندگی کا سکون حاصل ہو سکتا ہے۔ نہ کوئی قوم اپنی اجتماعی ترقی کا سفر جاری رکھ سکتی ہے۔ ہندوستان جیسے کثیر المذاہب ملک میں تحریک اتحاد کے کئی محاذ تھے اور کئی مرحلوں میں تقسیم تھی استعماری مصالح و مفادات نے ہر محاذ پر مشکلات اور ہر مرحلے میں رکاوٹیں پیدا کر دی تھیں۔

۱- پہلا مرحلہ یہ تھا کہ مسلمان اپنے ملّی دائرے میں اتحاد و ایتلاف کی رسی سے اس طرح بندھے ہوئے ہوں کہ ہفتاد و دو قالب ہونے کے باوجود یک جان ہوں۔ اگر ملت کے ایک فرد کی انگلی میں پھانسی لگے تو چبھن دوسرا محسوس کرے۔ ان کے اتحاد میں کوئی دراڑ نہ ہو اور نہ انھیں کوئی ایک دوسرے سے جدا کر سکے۔

۲- متحدہ ہندوستان کے دورِ آخر میں مسلمانوں کی آبادی نو کروڑ تک پہنچ چکی تھی۔ لیکن وہ ملک کی تنہا قوم نہ تھے۔ ان سے دوگنا سے زیادہ تعداد غیر مسلموں کی تھی۔ قومی ترقی کی بنیاد نہیں رکھی جا سکتی تھی، جب تک وہ ملک کی سیاسی، سماجی، معاشی، اقتصادی زندگی میں

برادران وطن کے ساتھ مل کر ایک متحدہ قومیت کے سانچے میں نہ ڈھل جائیں۔ مسلمانوں کے ملی مقاصد کے حصول کا دارومدار بھی قومی اتحاد پر تھا۔ بین الاقوامیت یا متحدہ انسانیت کے فروغ کا تقاضا بھی یہی تھا کہ سب سے پہلے ایک ملک کے حدود میں مختلف اہل مذاہب باہم ایک دوسرے کے ہم درد و غم گسار ہوں اور ایک کو دوسرے کا اعتماد حاصل ہو۔

۳- اسلام ایک عالمگیر مذہب ہے۔ مسلمان دنیا کے تمام ملکوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ان کے مذہبی عقائد اور اسلامی تعلیمات نے تمام مسلمانوں کو ایک دوسرے سے رشتہ اخوت میں منسلک کر دیا ہے۔ اقوام و مذاہب عالم میں ان کے تاریخی، تہذیبی اور ملّی امتیازات ہیں۔ ان کے یہ امتیازات ان کے فخر کا مجرد سرمایہ نہیں، بلکہ بین الممالک اتحاد اور بین الاقوامی روابط کے ضامن، تعمیر و ترقی کے محرک اور متحدہ انسانیت کے قیام کے موجب بھی ہیں۔ کسی ملک میں مسلمانوں کی ترقی صرف انھیں کی ترقی نہیں بلکہ اس ملک کی اجتماعی ترقی کا حصہ ہوتی ہے۔ اور ایک قومی عنصر کی ترقی دوسرے عناصر کے لیے ایک اہم سبق اور موثر دعوت بھی ہوتی ہے۔

حضرت مفتی اعظم ذہن و فکر اور تدبر و بصیرت اور علم و سیرت کے خصائص کی ایک جامع شخصیت تھے۔ انھوں نے ملی، قومی اور بین الممالک اور بین الاقوامی زندگی کی ہر سطح پر اتحاد کی تحریک کی رہنمائی۔ مسلمان فرقوں کے اختلاف کو دور کیا اور ان کے سامنے اسلام کی صراط مستحکم کو پیش کیا۔ ملک میں امن و سکون کی زندگی کے حصول کے فرقہ وارانہ اتحاد میں اعتدال کی راہ کی نشان دہی کی۔ وہ اتحاد اسلامی کے ہمیشہ داعی رہے، اسلام کے دکھ درد میں شریک اور ان کے مسائل کے حل میں ساعی رہے۔ جمعیت علمائے ہند کے لٹریچر میں تحریک کے تینوں محاذوں پر حضرت مفتی اعظم اور دوسرے رہنمایان کرام کے افکار و مساعی کے نقوش موجود ہیں۔

تحریک فلسطین (۱۹۳۸ء):

برطانیہ نے فلسطین کو تقسیم کیا اور اس کے علاقے میں یہودیوں کی حکومت قائم کر دی۔ فلسطین کے عربوں اور عالم اسلام میں سخت ہیجان پیدا ہوا۔ ہندوستان کے مسلمانوں میں اس واقعے نے خاص طور پر بے چینی اور اضطراب پیدا کر دیا۔ جمعیت علمائے ہند نے مجلس

تحفظ فلسطین قائم کی۔ شہدائے فلسطین کے لیے چندہ جمع کیا اور ۲۶/اگست ۱۹۳۸ء کو پورے ملک میں یوم فلسطین منایا اور تقسیم فلسطین کے خلاف جلسوں اور اخباروں میں سخت احتجاج اور مظاہرہ کیا۔ برطانیہ نے مجبور ہو کر مسئلے پر غور و مشورہ اور عالم اسلام کے اطمینان کے لیے ایک کانفرنس بلانے کا فیصلہ کیا۔ یہ کانفرنس "موتمر البرطانیه المصریه للدفاع عن فلسطین" کے عنوان سے ۱۷/اکتوبر ۱۹۳۸ء کو قاہرہ میں علی علوبہ پاشا کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ جمعیت علمائے ہند نے حضرت مفتی صاحب کی صدارت میں ایک وفد بھیجا۔ مفتی صاحب اپنی بیماری اور کمزوری کے باوجود اس میں شریک ہوئے۔ مجلس مضامین اور عام اجلاس میں سرگرمی سے حصہ لیا۔ جلسے میں اسٹیج پر صدر کے برابر داہنی جانب آپ کو جگہ دی گئی۔ آپ کا خطبہ مولانا عبدالحق مدنی نے پڑھا۔ حاضرین پر خطبے کے مطالب، آپ کی تجاویز اور مشوروں کا بہت اثر ہوا۔ اسے نہایت توجہ سے سنا گیا اور آپ کے تدبر اور اصابت رائے کا اعتراف کیا گیا۔ اس کانفرنس میں عالم اسلام کے تقریباً ساڑھے تین ہزار منتخب نمایندوں نے شرکت کی۔ حضرت نے اپنے خطبے میں برصغیر کے مسلمانوں کی ترجمانی کرتے ہوئے فرمایا:

> "اگر خدانخواستہ فلسطین کے عرب تقسیم فلسطین پر راضی ہو جائیں تب بھی ہم ہندوستانی مسلمان اس پر ہرگز راضی نہ ہوں گے۔ یہ مسئلہ صرف فلسطین کے عربوں ہی کا نہیں، بلکہ کل عالم اسلامی کا مسئلہ ہے۔ مسلمان فلسطین کے کسی حصے میں اپنے اقتدار کی دست برداری سے مطمئن نہیں ہو سکتے۔ اس فیصلے کے نتائج نہایت بھیانک ہوں گے۔ اور فلسطین کو ایک دائمی فساد اور عالم اسلام کو عذاب میں مبتلا کر دیا جائے گا"۔

اس واقعے پر ترسٹھ چونسٹھ برس کا عرصہ گزر چکا ہے۔ تقسیم فلسطین کے نتیجے میں حضرت مفتی اعظم نے جس فساد کی طرف اشارہ کیا تھا اور عالم اسلام کے جس عذاب میں مبتلا کر دیئے جانے کی پیشین گوئی کی تھی، وہ حرف بہ حرف پوری ہو چکی ہے۔ اور فساد کے رفع ہونے اور عذاب سے نجات کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔

ہم نے قومی و ملی اور اندرون و بیرون ملک کی کچھ تحریکوں کا خاص طور پر تذکرہ کیا ہے، جن میں کم و بیش حضرت مفتی صاحب نے حصہ لیا اور جمعیت علمائے ہند کے صدر یا اپنی ذاتی علمی اور مدبرانہ حیثیت میں جن کی رہنمائی کی تھی۔

عملی سیاسیات میں تحریکات کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ تحریکیں سیاسیات میں فسردگی اور گرمی کی خبر دیتی ہیں۔ اور قوم کے جوش وولولہ اور عزائم کی بلندی کا پتادیتی ہیں۔ تحریکیں ملی، قومی اور بین الاقوامی زندگی کے چھوٹے بڑے حوادث اور مسائل ہوتے ہیں۔ ان مسائل کی اہمیت اور موثرات تحریکوں کو چھوٹا یا بڑا بناتے ہیں۔ کسی مدبر کی سیاسی شخصیت کے مقام کے تعین میں تحریکات کا بڑا حصہ ہوتا ہے۔ تحریک وہ بھٹی ہوتی ہے جس سے شخصیت کندن بن کر نکلتی ہے یا جل کر بھسم ہو جاتا ہے۔ تحریک کسی مدبر کی عظمت پرکھنے کی کسوٹی ہوتی ہے۔ تحریکات میں حصہ لیے بغیر کوئی مدبر مفکر کی حیثیت اور فلسفی کے مقام سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔

حضرت مفتی اعظم محمد کفایت اللہ ذوق اور عمل ہر دو لحاظ سے ایک بلند پایہ سیاست دان تھے۔ ان کے سامنے ایک اعلیٰ نصب العین تھا۔ انکا اندازِ فکر درست تھا۔ ان میں عملی سیاست کے تقاضوں کے فہم، مصائب کے تحمل اور مقابلہ کرنے کی قوت اور رہنمائی کی قابلیت تھی۔ ان کے فکر میں یہ پختگی اور عمل میں استقامت اس لیے پیدا ہوئی تھی کہ وہ تحریک کی بھٹی سے کندن بنکر نکلے تھے۔ وہ شیر قالین نہ تھے بلکہ شیر بیشۂ سیاست تھے۔ انھوں نے سیاست میں قدم رکھنے کے بعد تحریکات میں حصہ لینا اور رہنمائی کرنا سیکھ لیا تھا۔

اتحاد مدارس اسلامیہ کی تحریک:

ایک زمانے تک مسلمانوں کی تعلیم بالکل آزاد تھی۔ علمائے کرام اپنے ذوقِ علمی کے مطابق اپنے گھروں پر، مسجدوں میں، خانقاہوں میں بیٹھ جاتے اور رفتہ رفتہ ان کے درس کی خصوصیات کی شہرت دور دور تک ہو جاتی اور طالبانِ علم کا عام رجوع ہوتا اور بڑے بڑے مجامع درس وجود میں آجاتے۔ امراء وسلاطین اور خلفاء انھیں دیکھ کر ان کی افادیت اور ضرورت محسوس کر کے ان کے اخراجات کے لیے جائدادیں وقف کر دیتے تھے۔ وہ بھی علماء ومدرسین کو کسی نظام کا پابند نہ بناتے تھے اور اصحاب درس خود بھی کسی نظام کا پابند ہونا گوارا نہ کرتے تھے۔ بہت سے امرا اور اہل مناصب بھی اپنے ذوق کے منتخب طلبہ کے حلقے قائم کر لیتے اور فارغ اوقات میں انھیں پڑھاتے تھے۔ بعض اوقات یہ حلقے کافی وسیع ہو جاتے اور انھیں دوسرے اساتذہ کی مدد حاصل کرنی پڑتی تھی۔ یہ ضروری نہیں تھا کہ مختلف علوم وفنون کی اعلیٰ تعلیم کسی ایک ہی تعلیم گاہ میں حاصل ہو جائے۔ شائقین علم کو اپنے ذوق کی تکمیل کے لیے

مختلف شہروں میں مختلف اساتذہ سے رجوع کرنا پڑتا تھا۔

بعد کے دور میں ہندوستان کے بعض علاقوں میں درس نظامی کے نام سے ایک نصاب کی شہرت ہوگئی تھی۔ یہ بھی رسماً اور روایتاً تھا، نہ کہ کسی نظام کے جبر کے تحت۔ یہ نصاب بھی ہندوستان کے بعض خاص علاقوں میں رائج تھا اور جہاں تک مشہور تھا۔ ان مدارس میں بھی اصحاب درس وتدریس نے اس میں اتنی تبدیلی کردی تھی کہ درس نظامی کا صرف نام رہ گیا تھا۔

دارالعلوم دیوبند ایک خاص سوچ سمجھے منصوبے کے تحت قائم کیا گیا تھا اور یہ منصوبہ پورا نہیں ہوسکتا تھا۔ جب تک پورے ملک میں مدارس کا ایک جال نہ پھیلا دیا جائے۔ چنانچہ اس منصوبے کے مطابق ملک میں جو سیکڑوں مدارس قائم کیے گئے ان کے نصاب میں بھی یکسانیت پیدا ہوگئی اور نظاماً بھی ایک دوسرے سے قریب آ گئے۔ اس طرح شمالی ہند سے لیکر پنجاب اور سرحد وسندھ اور مشرق بنگال اور بہار تک ایک فکری ہم آہنگی قائم ہوگئی۔ اس کے باوجود دیوبندی فکر کے تمام مدارس بھی کسی ایک کل ہند اجتماعی نظام اور مقررہ نصاب کے پابند نہ تھے۔ ہر مدرسہ اپنے نصاب اور نظام میں آزاد ہی رہا۔ جیسا کہ تحریکوں میں عام طور پر نشیب وفراز آتے رہتے ہیں، وقت گزرنے کے ساتھ یہ تحریک بھی کمزور پڑ گئی۔

حضرت مفتی صاحب نے ۱۳۲۲ھ / ۱۹۰۵ء میں مدارس اسلامیہ کے اتحاد کی تحریک کو ازسرِ نو زندہ کیا اور ان مساعی میں کافی حد تک کامیابی ہوئی۔ اس کامیابی کا مظاہرہ دارالعلوم دیوبند کے عظیم الشان اجتماع ربیع الثانی ۱۳۲۸ھ / ۱۹۱۱ء میں ہوا۔ اس اجتماع میں مدرسہ امینیہ کے دس فارغ التحصیل طلبہ کی دستار بندی کی گئی۔

اسی زمانے میں جمعیت الانصار کے ذیلی ادارے "قاسم المعارف" کے مقاصد کے تحت اتحاد و تنظیم اور نئے مدارس کے قیام کی تحریک شروع ہوگئی تھی۔ جمعیت الانصار سے حضرت مفتی صاحب کا تعلق تھا۔ حضرت شیخ الہند کی نسبت سے بانی قاسم المعارف مولانا عبید اللہ سندھی اور شیخ الحدیث مدرسہ امینیہ حضرت مفتی اعظم ایک دوسرے کے خواجہ تاش تھے۔ ایک ہی مقصد کے لیے دونوں حضرات کی جدوجہد کا زمانہ ایک تھا۔ کیا تعجب کہ دونوں کے مساعی ایک فکر اور تحریک کے برگ وبار ہوں؟

☆☆☆

دستوری تحریکات

ہندوستان میں جس مسئلے نے سب سے زیادہ پیچیدگی اختیار کی اور اہلِ نظر واصحاب تدبر کو پریشان کیا، وہ ملک کا فرقہ وارانہ مسئلہ تھا۔ برٹش حکومت نے سب سے زیادہ اسی سے فائدہ اٹھایا۔ حکومت کی پالیسی ''لڑاؤ اور حکومت کرو'' میں سب سے زیادہ تباہ کن ہتھیار کا کام اسی نے کیا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے روایتی مذہبی جوش اور اپنی اپنی تہذیبوں پر ان کے تفخر نے اس مسئلے کے حل میں بار بار رکاوٹ ڈالی۔ اور بعض اوقات تو مذہب کے نام پر بعض معاشرتی مسائل اور رسوم نے اختلافات کی خلیج کو چوڑا کیا۔ یہاں تک کہ رواداری نام کی کوئی چیز ہندوؤں اور مسلمانوں میں باقی نہ رہی۔ چھوٹے چھوٹے مسائل اتحاد و محبت اور رواداری کے فروغ میں رکاوٹ بن گئے۔ مثلاً

عام گذرگاہ پر مسجد کے سامنے باجا بجانا، عام اور کھلی ہوئی جگہ پر گائے ذبح کرنا، کسی راستے میں تعزیے کو اٹھانے والوں کے کندھوں سے ذرا نیچے کر کے گزارے جانے سے انکار اور پیپل کی لٹکتی ہوئی کوئی شاخ کاٹنے سے انکار، اسی طرح کی نئے راستے سے تعزیے کا جلوس نکالنا اور ان جگہوں پر ذبیحہ گاؤ پر اصرار جہاں پہلے کبھی ذبیحہ نہ ہوا تھا۔

ان اختلافات کے نتیجے میں فسادات بھی ہوئے اور بارہا جانوں کا نقصان ہوا۔ حالاں کہ ان میں سے کوئی مسئلہ بھی نہ خالص اسلامی تھا کہ اس پر اصرار کیا جاتا اور نہ ہندومذہب کے تقدس پر حرف آتا تھا کہ اس میں رکاوٹ اور انکار مانع ہو۔ ان میں سے کوئی مسئلہ معاشرتی رواداری، آپس کے بھائی چارے، اتحاد واتفاق اور امن وامان سے زیادہ اہمیت نہ رکھتا تھا۔ اس کے بدلے میں انسانی خون بہانے کا تصور بھی نہ کیا جاسکتا تھا۔ عجیب بات ہے کہ یہ مسئلہ نوعیت کے قدرے اختلاف کے ساتھ پاکستان میں مسلمان گروہوں میں اس سے زیادہ شدت کے ساتھ جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے بیچ میں تھی موجود ہے۔

مسلمانوں کے بعض رہنما جو مذہبی عقائد واعمال اور عام رہن سہن اور ذوق واطوار میں ہندوؤں سے زیادہ بلند سطح اور کوئی امتیاز واختصاص نہ رکھتے تھے اپنی مذہبیت کے اظہار اور

مذہب کے نام پر سیاسی، اقتصادی، معاشی جنگ میں راسخ العقیدہ مسلمانوں اور باعمل علمائے دین سے زیادہ پرجوش نظر آتے تھے۔ پاکستان بنالینے کے بعد بھی ان کی زندگیوں میں کوئی ادنیٰ تبدیلی نظر نہ آئی اور مذہبی زندگی کی سعادتوں سے وہ دور ہی رہے۔ اسلامی زندگی کے نمونے علمائے دین ہی کی زندگیوں میں نظر آتے تھے۔ اور مشاہدے اور تجربے میں یہی بات آئی کہ علمائے دین اپنی قدیم روایتی اور دینی تعلیم کے باوجود زیادہ فراخ دل، بلند حوصلہ، وسیع الخیال اور غیر متعصب تھے۔

لیگی سیاست دانوں کے مقابلے میں مدبر علمائے دین کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ جس اسلامی زندگی اور جس مسلم تہذیب وروایات کے تحفظ کی بات کرتے تھے، وہی ان کی زندگی بھی تھی۔ ان کی ایک خوبی یہ تھی کہ وہ قومی زندگی کی بقا کے لیے صرف دستوری تحفظات ہی کو کافی نہیں سمجھتے تھے۔ دستوری تحفظات کسی قوم کے حقوق کے تعین کے ساتھ حق تلفیوں اور سازشوں کے مقابلے کے لیے میدان اور ایک اعلیٰ اتھارٹی کے سامنے شکایت کرنے اور ان کا ازالہ کرانے کا استحقاق مہیا کرتے ہیں۔ تحفظات کسی قوم کو زندگی فراہم نہیں کرسکتے۔ زندگی کے لیے خود قوم میں عزم وحوصلہ اور ہمت ومقاومت کی صلاحیت اور خود اپنے اوپر اعتماد کو ضروری سمجھتے تھے۔ اس لیے انھوں نے مسلمانوں کو ملک کی اکثریت سے ڈرانے کے بجائے ان سے تعلقات درست کرنے اور اپنی زندگی کے لیے خود اپنے اوپر اعتماد کرنے کی ہمیشہ تلقین کی اور اس تلقین کے ساتھ دستور تحفظات کے لیے بھی ہمیشہ ساعی رہے۔

چناں چہ جمعیت علمائے ہند کا کوئی سالانہ اور ورکنگ کمیٹی کا کوئی جلسہ شاید ہی ایسا ہوا ہو جس میں مسلمانوں کے سیاسی، مذہبی، معاشرتی، تہذیبی، معاشی، اقتصادی حقوق، ان کے تحفظ اور ان کے لیے دستور سازی کا کوئی نہ کوئی مسئلہ پیش نہ آیا ہو۔ جمعیت علمائے ہند کی تاریخ گواہ ہے کہ اس کے قیام کے اول روز سے دستور سازی کا کوئی نہ کوئی مسئلہ ہمیشہ ترجیحی طور پر اس کے سامنے رہا ہے۔ اس کے علاوہ جب اجتماعی طور پر ملک کی کسی دوسری پارٹی نے اقلیتوں کے حقوق ومسائل پر غور وفکر کے لیے کوئی قدم اٹھایا تو جمعیت علمائے ہند کے بزرگوں نے اس میں سرگرمی کے ساتھ حصہ لیا۔

۱- میثاق لکھنؤ (۱۹۱۶ء):

میثاق لکھنؤ پر حضرت مفتی اعظم نے نقد و تبصرہ کا قلم اس لیے اٹھایا تھا کہ اس میں ہندو مسلم اکثریت اور اقلیت کے حقوق کے تصفیے کے لیے جو حل پیش کیا گیا تھا۔ وہ نہ صرف یہ کہ کافی نہیں تھا، بلکہ درست بھی نہیں تھا۔

۲- نیشنل پیکٹ (۱۹۲۳ء):

فرقہ وارانہ مسائل کے تصفیے کے لیے ۱۹۲۳ء میں دو کوششیں عمل میں لائی گئیں

(الف) پہلی کوشش میثاق ملیہ ہند" (نیشنل پیکٹ آف انڈیا) کے عنوان سے لالہ لاجپت رائے اور ڈاکٹر مختار احمد انصاری پر مشتمل ایک کمیٹی نے تجویز کیا تھا۔ یہ کمیٹی کانگریس کے خصوصی اجلاس مورخہ ۲۳/ ستمبر ۱۹۲۳ء منعقدہ دہلی (زیر صدارت مولانا ابوالکلام آزاد) کی ایک تجویز کے مطابق قائم کی گئی تھی۔

(ب) دوسری کوشش بنگال کی سطح پر "بنگال پراونشل کانگریس کمیٹی" کے ذریعے عمل میں آئی تھی۔ اس کا عنوان "میثاق ملیہ ہند مجوزہ بنگال پراونشل کانگریس" تھا۔

یہ میثاق سوراج کمیٹی نے مرتب کیا تھا اور بنگال پراونشل کانگریس میں ایکٹ پاس کر کے درخواست کی گئی تھی کہ اسے کوکناڈا کانگریس (۱۹۲۳ء) میں منظوری کے لیے بھیج دیا جائے۔

یہ میثاق الماس پریس دہلی سے شائع بھی کر دیا گیا تھا۔

جمعیت علماے ہند کے پانچویں اجلاس مورخہ ۳۰/ دسمبر ۱۹۲۳ء لغایت ۲/ جنوری ۱۹۲۴ء منعقدہ کوکناڈا میں ان دونوں مواثیق پر غور کیا گیا تھا۔ دوسرے میثاق پر بحث کرتے ہوئے سی آر داس (دیش بندھو، وفات ۱۶/ جون ۱۹۲۵ء دارجلنگ) نے نہایت پرزور اور مدلل تقریر فرمائی۔ انھوں نے کہا:

"نمائندگی کا اصول صرف آبادی کے تناسب پر طے کیا جا سکتا ہے اور کوئی صورت نہیں۔ جب بنگال میں مسلمانوں کی آبادی زیادہ ہے تو یقیناً ان کی نمائندگی زیادہ ہو گی۔ یہ بالکل غلط ہے کہ آج ۲۵/ فیصد ان کو دو، کل ۳۰ فیصد کرو اور پرسوں ۳۵ فیصد بنادو۔ دفتری حکومت بھی تو یہی کرتی ہے۔ ہم کو تو یہ شایان نہیں ہے۔ اگر واقعی ہندو مسلم اتحاد کے بغیر

سوراج نہیں ہو سکتا تو پھر اس اتحاد کو مضبوط بنیاد پر قائم کرو اور جس کا جو حق ہے اخلاص وصداقت کے ساتھ اسے دے دو۔ اور اس مسئلے میں ہر صوبہ اپنی حالت کو دیکھ کر خود طے کرے۔ ان معاملات میں ہر صوبے کو آزادی ہونی چاہیے"۔

(جمعیت علماء کیا ہے؟ (حصہ دوم، ص ۷۹)

۳- بین المذاہب اتحاد کانفرنس، دہلی (۱۹۲۴ء):

اس کانفرنس کے انعقاد کا مقصد یہ تھا کہ فرقہ وارانہ اختلاف کے بنیادی اسباب تلاش کر کے اتحاد کے لیے زمین ہموار کی جاسکے۔ اس کانفرنس پر اسی مضمون میں زیادہ تفصیل کے ساتھ ایک مقام پر گفتگو کی جارہی ہے۔ اس لیے یہاں یہ تذکرہ چھوڑ دیا جارہا ہے۔

۴- نہرو کمیٹی کی رپورٹ (۱۹۲۸ء):

نہرو کمیٹی کا قیام اسی مقصد سے عمل میں آیا تھا کہ فرقہ وارانہ اختلافات کو دور کر کے ملک کے لیے ایک متفقہ دستور بنایا جاسکے۔ جمعیت علمائے ہند کے اہم رہنماؤں نے خصوصاً اس کے صدر مولانا مفتی اعظم کفایت اللہ نے اس کی کارروائیوں میں حصہ لیا اور کمیٹی کی رپورٹ پر نہایت مثبت انداز میں تبصرہ کیا اور ترامیم پیش کیں۔

۵- مسلم کانفرنس کا دستوری فارمولا (۱۹۲۹ء):

۱۹۲۹ء کی ابتداء ہی میں جب دہلی میں تمام مسلمان جماعتوں کا ایک اہم جلسہ "مسلم کانفرنس" کے نام سے اس غرض سے منعقد ہونا طے پایا کہ ہندوستان کے مجوزہ دستورِ حکومت میں مسلمانوں کے مذہبی اور قومی حقوق کے تحفظ کے لیے مسلمانوں کا ایک متفقہ فارمولا تیار کرایا جائے تو جمعیت علمائے ہند کی مجلس عاملہ نے اس کانفرنس میں شرکت کے لیے اپنے نمائندے منتخب کیے۔ اس کانفرنس میں خلافت کمیٹی، جمعیت علماء اور شفیع لیگ نے پورا حصہ لیا۔ البتہ جناح لیگ نے اس کانفرنس کا بائیکاٹ کیا مگر یہ کانفرنس مولانا مفتی کفایت اللہ مولانا محمد علی اور شفیع کی انتھک کوششوں سے پوری کامیاب ہوئی اور اس وقت کے اعتبار سے ایک بہتر فارمولا تیار ہو گیا۔ جس پر تمام جماعتوں کا اتفاق تھا۔ جب لندن میں گول میز کانفرنس کا انعقاد ہوا تو یہی فارمولا تھا جو کانفرنس کے مسلمان نمائندوں کے ہاتھ میں تھا جس کی بناء پر

کانفرنس کی گفتگو میں وہ حصہ لے سکتے تھے۔ لیکن افسوس! وہ اپنی کوتاہی سے اسے دستور حکومت میں شامل نہیں کرا سکے۔ تاہم ۱۹۳۵ء کے انڈیا ایکٹ کے تحت مسلمانوں کو جو کچھ ملا، وہ ایک حد تک اسی فارمولے پر مبنی تھا۔ جو ۱۹۲۹ء کی اس کانفرنس میں جمعیت علمائے ہند اور اسکے صدر کی کوششوں سے طے پایا تھا۔ اس کی تیاری میں اگرچہ مسٹر جناح اور ان کی لیگ کا کوئی حصہ نہ تھا، لیکن جب شفیع لیگ اوز جناح لیگ میں اتفاق ہو گیا تو وہی فارمولا جناح صاحب کے چودہ نکات کے نام سے موسوم ہو گیا۔ (جمعیت علما کیا ہے؟ (حصہ اول) ص ۱۶-۱۵)

۶- جمعیت علمائے ہند نے فرقہ وارانہ مسئلے کے حل اور مسلمانوں کے مذہبی، ثقافتی، تہذیبی حقوق کے تحفظ کے لیے اگست ۱۹۳۱ء میں جمعیت کی مجلس عاملہ کے اجلاس سہارن پور میں ایک فارمولا پیش کیا تھا۔ یہ فارمولا بہت مختصر مگر جامع تھا اور چودہ دفعات پر مشتمل تھا۔ بعد میں یہی فارمولا مزید غور و فکر کے بعد چند تشریحات کے ساتھ جمعیت کی مجلس عاملہ منعقدہ دہلی مورخہ ۳۱ر جنوری تا ۲ر فروری ۱۹۴۵ء میں پاس کیا گیا اور جمعیت کے اجلاس عام لاہور میں مورخہ ۴ تا ۷ر مئی ۱۹۴۵ء میں پیش کر کے پاس کرایا گیا۔

۷- مستقبل کے دستور ہند اور اس میں مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے مسئلے پر جمعیت علما کے رہنما برابر غور کرتے رہے اور اپنی حلیف قوم پرور جماعتوں کے ساتھ صلاح و مشورے کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ ۱۹۴۶ء میں جب کیبنٹ مشن ہندوستان آیا تو ملک کے آئندہ دستور اور نظام سیاسی کے مسئلے پر جمعیت علمائے ہند کے صدر مولانا حسین احمد مدنی مشن کی دعوت پر ۱۶ر اپریل کو اس سے ملے اور اپنا فارمولا پیش کیا۔ اس میں مسلمانوں اور ملک کی اقلیتوں کے مسائل کے حل کے لیے ایک نئے انداز میں دستور کے اہم نکات پیش کیے۔ جس میں ملک کے لیے وفاقی نظام، صوبائی خود مختاری، مرکز کے پاس صرف چند امور اور اسمبلی میں ہندو مسلم ارکان کی مساوات کے اصول کو پیش نظر رکھا گیا تھا۔ جب مشن کا فارمولا شائع ہوا تو معلوم ہوا کہ بعض ترمیمات کے ساتھ مشن کا منصوبہ انہی اصول پر مبنی تھا جو جمعیت نے اپنے منصوبے میں پیش کیے تھے۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: جمعیت علماء کیا ہے؟ (حصہ اول) ص ۸۰-۷۵ و ضمیمہ حصہ دوم، ص ۳۲ - ۲۸ و علمائے حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے (حصہ دوم از مولانا سید محمد میاں)

اسلام کے معاشرتی قوانین:

ہندوستان کے مختلف صوبوں میں قانون سازی کے مختلف مراحل میں خود مسلمان زمیندار اور جاگیرداروں نے ایمان کی کمزوری یا دوسری قوموں کے رسوم ورواج سے متاثر ہوکر گورنمنٹ کو یہ لکھ کردے دیا تھا کہ وہ اسلام کے قانونِ وراثت کے بجائے رواج پر عمل کرتے ہیں جس کے مطابق باپ کے ترکے میں بیٹیوں کو حصہ نہیں ملتا۔ چنانچہ صوبۂ پنجاب اور بمبئی (اسوقت اس میں سندھ بھی شامل تھا) میں رواج پر عمل کی وجہ سے لڑکیوں کو اسلامی قانونِ وراثت سے فائدہ اٹھانے سے محروم کردیا گیا تھا۔

چنانچہ جمعیت علمائے ہند کے رہنماؤں نے اپنے خطبات وتقاریر، اجلاسوں کی تجاویز، اخبارات میں مضامین اور اسمبلیوں میں دستور سازی کی کوششوں کے ذریعے اس قانون کو بدلوانے کی جو کوششیں جمعیت کے ابتدائی زمانۂ قیام سے صوبائی اور کل ہند سطح پر شروع کی تھیں، وہ آخر تک جاری رہیں۔ مولانا سید محمد میاں لکھتے ہیں:

"صوبہ سرحد وصوبہ پنجاب وصوبہ بمبئی وغیرہ میں اسلام کے معاشرتی قوانین کے بجائے بہت سے مسلمان غیر اسلامی رواج پر عمل درآمد کرتے تھے اور برطانوی عدالتیں اسلامی قانون کے معاملے میں رواج کو ترجیح دیتی تھیں۔ مثلاً لڑکیوں کو ماں اور باپ کے متروکہ میں سے اسلامی قانون وراثت کی بنیاد پر کوئی حصہ نہیں ملتا تھا۔

جمعیت علمائے ہند نے بارہا مسلمانوں کو اس رواج کو توڑنے اور شریعت اسلامیہ پر عمل کرنے کی طرف توجہ دلائی، علمائے حق نے وعظوں میں مسلمانوں کو نصیحتیں کیں۔ اخبارات میں مضامین لکھے، مگر کوئی مفید نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ کیونکہ برطانوی عدالتیں رواج کے مطابق فیصلہ کرنے پر آمادہ تھیں۔ آخر مجبور ہوکر سب سے پہلے جمعیت علمائے صوبہ سرحد نے ایک آئینی قدم اٹھایا اور علامہ مفتی محمد کفایت اللہ صاحب صدر جمعیت علمائے ہند کی رہنمائی میں ایک مسودۂ قانون "شریعت بل" کے نام سے تیار کیا۔ جس کا منشا یہ تھا کہ مسلمانوں پر نکاح، طلاق، مہر اور ترکہ وغیرہ میں اسلامی قانون نافذ ہو۔ چنانچہ الحمدللہ صوبہ سرحد کی اسمبلی میں جمعیت علمائے صوبہ سرحد اور

مسلمانانِ سرحد کی کوششوں سے یہ شریعت بل قانون بن گیا، جس سے
اسلامی قانون کا وقار ایک حد تک قائم ہو گیا اور بہت سے مسلمان گناہ عظیم
سے بچ گئے"۔

(جمعیت علماء کیا ہے؟ حصہ اول، ص ۱۷)

اسلام کے معاشرتی قوانین کے دائرے میں جمعیت علمائے ہند سب سے زیادہ منظم اور مسلسل کوششیں عمل میں لائی ہے۔ ایسا ہونا بھی چاہیے تھا۔ اسلام ایک جامع اور مکمل حیات قائم کرنا چاہتا ہے۔ اس کے دائرۂ اثر و نفاذ سے زندگی کا کوئی گوشہ بچا ہوا نہیں رہ جاتا۔ زندگی کی ضرورتیں صرف چند مسائل تک محدود نہیں۔ ہزارہا مسائل ہیں جن سے زندگی میں سابقہ پڑتا ہے اور ہر روز نئے نئے مسائل پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ یہ مسائل فکری، اصولی، اور عملی ہوتے ہیں اور مختلف طریقوں سے ہماری زندگی کے کسی نہ کسی پہلو پر اثر ڈالتے ہیں اور پیچیدگیاں پیدا کرتے ہیں۔ انھیں حل کرنے کے لیے ایک مستعد جماعتی نظام اور بیدار مغز رہنما کی ضرورت ہوتی ہے، جو کسی مسئلے کی اہمیت کے مطابق بروقت کارروائی عمل میں لا سکیں۔ جمعیت علمائے ہند ایک ایسی جماعت اور اس کے رہنما ایسے ہی لوگ تھے۔ جمعیت علما اور اس کے رہنماؤں نے ہمیشہ بہت بہادری، مستقل مزاجی اور بیدار مغزی کے ساتھ مسائل کا سامنا کیا اور مسائل کی حیثیت اور اہمیت کے مطابق ان پر بروقت اور ضروری توجہ کی۔ ویسے تو ہر ملک میں ہر مسئلے کی ایک دستوری اور قانونی حیثیت ہوتی ہے، لیکن ہندوستان جیسے بے شمار مذہبوں، فرقوں، طبقوں اور ہزاروں پیشوں کے ملک میں ہر مسئلے کی دستوری اور قانونی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے۔ ان کی پیچیدگیوں کا اندازہ کرنا کوئی آسان نہ ہوتا۔ اس لیے تمام ایسے مسائل کو زیر نظر و بحث لانا ممکن نہیں۔ مولانا سید محمد میاں کی تالیف "جمعیت علماء کیا ہے؟ سے ایسی تحریکات اور مسائل کی ایک فہرست دی جاتی ہے جن کا تعلق کسی نہ کسی اعتبار سے دستور و آئین سے ضرور تھا اور جن کے لیے جمعیت کو ڈپارٹمنٹل یا صوبائی یا مرکزی حکومت کی سطح پر قانونی جنگ لڑنی پڑی تھی۔

اسلام کے معاشرتی قوانین کے سلسلے میں محاکم شرعیہ کے قیام، شریعت بل، قاضی بل اور نکاح و طلاق، میراث اور تبنیت وغیرہ کے قانون سازی اور دستوری مسائل، سول میرج اور ساردا ایکٹ وغیرہ کے سلسلے میں مختلف سطحوں کی کوششیں آتی ہیں۔ یہاں مختصراً

جمعیت علماء ہند کے بعض مساعی پر ایک نظر ڈالی جاتی ہے۔

(الف)-اسلامی نظم جماعت کے قیام کے سلسلے میں جمعیت علمائے ہند کی وہ تمام کوششیں آتی ہیں جو جمعیت کے دوسرے سالانہ اجلاس کے بعد سے نہ صرف ۱۹۴۷ء تک بلکہ اس کے بعد بھی جاری ہیں اور جمعیت علماء اب تک اس منصوبے سے دست بردار نہیں ہوئی۔ نظم جماعت کی تحریک مولانا ابوالکلام آزاد نے ۱۹۱۳ء میں شروع کی تھی اور اس کی امارت کی ذمہ داری کیلیے حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن کو آمادہ کرلیا تھا۔ لیکن ستمبر ۱۹۱۵ء میں حضرت شیخ الہند عرب تشریف لے گئے اور مولانا ابوالکلام کو اپریل ۱۹۱۶ء میں رانچی میں نظر بند کر دیا گیا۔ مولانا نے رانچی پہنچ کر تحریک کو جاری رکھا۔ یکم جنوری ۱۹۲۰ء کو رہائی کے بعد اس پر خاص توجہ دی اور جون ۱۹۲۰ء میں حضرت شیخ الہند کی وطن واپسی کے وقت تک بنگال، بہار، یوپی، پنجاب، سندھ میں ان کے ماذون و مجاز مقرر ہو چکے تھے۔ لیکن حضرت شیخ الہند وطن پہنچے تو معلوم ہوا کہ حضرت کی صحت تباہ اور مرض الموت کا آغاز ہو چکا ہے۔ حضرت نے منصب امام الہند یا امیر الہند قبول فرمانے سے معذرت کرلی اور اگرچہ مولانا ابوالکلام کے لیے ایما فرمادیا تھا لیکن حضرت کے انتقال کے بعد یہ مسئلہ آپس کے اختلاف، اہمیت کے عدم فہم اور انتشار فکر کی نذر ہو گیا۔ مولانا آزاد اس مسئلے کو جمعیت علمائے ہند کے سپرد کر کے خود ذمہ داری سے الگ ہوگئے۔ البتہ اس مسئلے کے حل کے لیے جمعیت کو ان کا تعاون برابر حاصل رہا۔

بہار میں "امارت شرعیہ" کا قیام اس سلسلے کی کڑی تھا۔ پنجاب میں بھی مولانا سید عطاءاللہ شاہ بخاری کو امیر شریعت مقرر کر لیا گیا تھا۔ لیکن نظام کا قیام عمل میں نہ آسکا۔

(ب)-سارداایکٹ، نابالغ بچوں کی شادی کے اختیار کے خلاف قانون۔ اس قانون کے خلاف حضرت مفتی اعظم کی خدمات کا ذکر اسی مضمون میں ایک دوسری جگہ آیا ہے۔

(ج)- سول میرج ایکٹ (شادی) بین المذاہب کا قانون: سول میرج کا قانون انیسویں صدی کے آخر سے موجود تھا۔ اس میں مختلف اوقات میں ترمیم اور تبدیل کا عمل ہوتا رہا اور لیجس لیٹو میں زیر غور آتا رہا اور جب ایسا ہوا۔ عوام میں خصوصاً مسلمانوں میں نقد و نظر کا موضوع بنتا رہا۔ اس کے نفاذ کی ایک تاریخ اور پس منظر ہے۔ مقصد یہ تھا کہ ہندوستان میں عیسائی مذہبی انقلاب نہ لایا جاسکے تو مذاہب کو ایسا خلط ملط کر دیا جائے کہ کوئی

شخص ہندو یا مسلمان بھی نہ رہے اور رفتہ رفتہ ملک میں ایک لادین معاشرہ وجود میں آجائے۔
اس قانون کے نفاذ کا نتیجہ مشنری تحریک کے خطرناک نتائج سے بھی زیادہ خطرناک اور ہندوستان کی سیاسی غلامی کی تباہی سے زیادہ تباہ کن تھا۔ علمائے ہند نے اول روز سے اس قانون کی خطرناکی کا اندازہ کرلیا تھا اور اس کے عمل و نفاذ کے خلاف تحریر و تقریر اور کونسل میں مسلمان اور راسخ العقیدہ ارکان کے ذریعے انتہائی کوشش کہ اگر اس کے نفاذ کو نہ روکا جائے تو اس کے دائرہ اثر سے مسلمانوں کو الگ رکھا جائے۔ لیکن بعض لیگی ارکان خصوصاً مسٹر محمد علی جناح نے ان کوششوں کو ناکام بنادیا۔ اور ایک ترمیم کے ذریعے اس کے دائرۂ اثر و نفاذ کو مسلمانوں تک وسیع کردیا گیا۔ اس مسئلے میں شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی اور مولانا اظہر علی مظہر کے رسائل کا مطالعہ نہایت مفید ہے۔

☆☆☆

بین المذاہب اتحاد کانفرنس

اتحاد کانفرنس:

تحریک خلافت کے دور میں ہندو مسلم اتحاد کے مناظر ملک کے لیے خواہ کتنے ہی خوش کن ہوں لیکن برٹش استعمار کے لیے وہ ہر گز گوارا اور قابل برداشت نہیں ہو سکتے تھے۔ حکومت کو ہمیشہ سے بعض تو مستقل طبقات ہی میسر آ گئے تھے جنھیں یونین جیک کے لہراتے ہوئے منظر سے کوئی دل خوش کن نظارہ نہ تھا اور کچھ مذہب مفرق کے علما تھے۔ جنھیں دنیا کی ہر اچھی اور بری چیز گوارا ہو سکتی تھی لیکن ہندو مسلم اتحاد ان کی آنکھوں میں سوئیاں بن کر کھٹکتا تھا۔ کچھ ان کے وقتی مصالح کا تقاضا تھا۔ لیکن سنجیدہ و محب وطن اور قوم پرور رہنماؤں کی وجہ سے اور عوام کے جوش میں توان کے مساعی نامسعود کا تو کوئی نتیجہ نہ نکلا، لیکن جوں ہی تحریک کا جوش ٹھنڈا ہونا شروع ہوا استعمار کے بہی خواہوں کی کوششوں کے برگ و بار پیدا ہونے شروع ہو گئے۔

(ا)-۱۹ر ستمبر ۱۹۲۱ء کو مولانا محمد علی کی صدارت میں خلافت کانفرنس کا کراچی میں انعقاد ہوا۔ حکومت کے خلاف اور ترک موالات کے پروگرام کے حق میں پر جوش تقریریں ہوئیں۔ جلسے کے بعد اس کے اور دیگر مقررین اور موئیدین و مجوزین کو گرفتار کر لیا گیا۔ ان کے خلاف بغاوت کا مقدمہ چلا اور تقریباً دو دو برس کے لیے انھیں جیل بھیج دیا گیا۔ ماخوذین یہ حضرات تھے:

۱- مولانا محمد علی (صدر) ۲- مولانا شوکت علی ۳- مولانا سید حسین احمد مدنی ۴- جگت گرو شنکر اچاریہ ۵-ڈاکٹر سیف الدین کچلو ۶- مولانا نثار احمد کانپوری ۷- پیر غلام مجدد سرہندی (سندھی)۔

اسی طرح پنجاب میں لالہ لاجپت رائے، یوپی میں موتی لال نہرو، بنگال میں سی آر داس اور مولانا ابوالکلام آزاد اور اسی طرح بمبئی، بہار میں کوئی سر برآوردہ رہنما ایسا نہ تھا

جو گرفتار نہ کرلیا گیا۔ اور دسمبر کے ختم ہونے سے پہلے پورے ملک میں صوبائی اور ملکی سطح کے تمام باا ثر سرگرم رہنماؤں اور اتحاد کے پرجوش داعیوں سے میدان صاف ہو چکا تھا۔

(۲)۔ شہزادہ ویلز کی آمد کے موقع پر (اواخر نومبر ۱۹۲۱ء) میں ہندو مسلم اتحاد کے مناظر اور عوام میں جوش و خروش اپنے عروج پر تھا، لیکن جس زور کا مد تھا اس کا جزر بھی ویسا ہی تھا۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ پورے ملک میں خصوصاً جن شہروں میں شہزادے کا جانا ہوا وہاں صف اول کے رہنماؤں سے لیکر کارکنوں تک کو گرفتار کرلیا گیا تھا۔ رضا کار تنظیموں اور والنٹیر کورز کو توڑ دیا گیا تھا۔ پرجوش عوام کا ایک بے پناہ سیلاب تھا لیکن اسے کوئی روکنے والا نہ تھا۔ گرفتار شدہ کارکنوں کے لیے جیلوں میں جگہ نہ تھی، باہر ان کا کوئی رہنما نہ تھا۔ حکومت کے لیے بہت آسان تھا کہ عوام کے جوش و جذبات کو غلط راہوں پر ڈال دے۔ اس نے یہی کیا اور ملک کا اتحاد انتشار اور فرقہ وارانہ فساد کی نذر ہو گیا۔

قاضی عدیل احمد عباسی نے اپنی تالیف "تحریک خلافت" میں ملک کے مختلف علاقوں میں تحریک کے رہنماؤں اور کارکنوں کی گرفتاریوں، مقدموں وغیرہ کی تفصیل بیان کی ہے تو تفصیلی مطالعے کے لیے دیکھیے کتاب کا دسواں باب "حکومت کا رد عمل" ص ۹۸-۱۸۳۔

(۳)۔ حکومت نے ایک قدم اور بڑھایا۔ کچھ ہندو اور مسلمان رہنماؤں کو دھرم اور مذہب کی خدمت کے نام پر شدھی سنگھٹن اور تبلیغ و تنظیم کے نام پر لگا دیا۔ ایسا سیلاب تھا کہ دین و ملت کو فتنے سے بچانے والے خود بھی اس سیلاب میں بہہ گئے۔

(۴)۔ گاندھی جی ان حالات سے پریشان تھے کہ چوراچوری کے واقعے نے انھیں ہلا کر رکھ دیا۔ اب ملک کو تباہی سے بچانے اور عوام کو حکومت کے تشدد اور آپس کے کشت و خون سے بچانے کی کوئی صورت اس کے سوا نہ تھی کہ تحریک کو ملتوی کر دیا جائے! گاندھی جی نے کانگریس کا اجلاس بلایا اور حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری وغیرہ کے مشورے سے تحریک کو عارضی طور پر واپس لے لیا لیکن یہ مسئلہ ایسا نہ تھا کہ گاندھی جی یا کانگریس فیصلہ کر دیتی اور ملک اسے تسلیم کر لیتا۔ خلافت کمیٹی اور جمعیت علمائے ہند دو جماعتیں اور ان کے رہنما بھی تھے جن کا ملک کے عوام پر گہرا اثر تھا۔ ترک موالات کی ان حلیف جماعتوں کو نظر انداز کر کے کوئی فیصلہ حتمی اور ملک کے لیے قابلِ قبول نہیں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ خلافت کمیٹی نے بمبئی میں اجلاس بلایا اور اس نتیجے پر پہنچی، جمعیت علمائے ہند کی مجلس عاملہ کا اجلاس اجمیر میں بلایا گیا، جس میں

علامہ معین الدین اجمیری، مولانا عبد الباری فرنگی محلی (لکھنؤ) جیسے اکابر شریک ہوئے اور اس نتیجے پر پہنچے کہ فی الوقت تحریک کو ملتوی کردینے کے سوااور کوئی چارہ کار نہیں ہے۔

کئی اکابر علمائے کرام اور رہنمایانِ عظام نے اس فیصلے کو پسند نہیں۔ وہ رنجیدہ خاطر ہوئے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان حالات میں اس کے سوادوسرا فیصلہ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

حکومت اور تحریک کے مخالفوں نے اس فیصلے کو بھی ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان خلیج کو وسیع کرنے کے لیے استعمال کیا۔ وہ اگرچہ تحریک کو ختم کردینے کے خوددرپے تھے لیکن اب اسے گاندھی جی نے ملتوی کردیا تھا تو یہ گاندھی جی کی اسلام دشمنی بن گئی تھی۔ حال آں کہ انصاف کی بات تو یہ تھی کہ انھیں خوش اور گاندھی جی کا شکر گزار ہونا چاہیے تھا۔

قومی رہنما ابھی تک بیشتر جیلوں میں تھے۔ وہ محض بے بس اور لاچار تھے۔ جو رہنما جیلوں سے باہر تھے، حالات ان کے قابو میں نہ تھے۔ فرقہ وارانہ فسادات پھوٹ پڑے تھے۔ حکومت انھیں ختم کرنے کے بجائے ہوادے رہی تھی۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ تمام مادۂ فساد اسی کا پیدا کردہ تھا۔ گاندھی جی ان حالات سے سخت رنجیدہ تھے۔ آخر کار انھوں نے حالات کو سدھارنے کے لیے ۲۱ دن کا برت رکھنے کا فیصلہ کرلیا۔ اس خبر کے عام ہوتے ہی ملک کے قومی حلقے میں تہلکہ مچ گیا اور مسئلے کے حل کی تلاش کے لیے اتحاد کانفرنس بلانے کا فیصلہ کیا گیا۔

یہ کانفرنس ۲۶ر ستمبر تا ۲ر اکتوبر ۱۹۲۴ء دہلی میں منعقد ہوئی۔ کانفرنس کے صدر پنڈت موتی لال نہرو اور استقبالیہ کمیٹی کے صدر مولانا محمد علی تھے۔ اس میں مسلم زعماء میں سے علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد، حکیم محمد اجمل خاں، جمعیت علمائے ہند کے رہنماؤں سے مولانا مفتی کفایت اللہ، مولانا سید حسین احمد مدنی اور مولانا احمد سعید دہلوی اور ملک کے بہت سے ہندو اور مسلمان رہنماؤں نے اس کانفرنس میں شرکت کی تھی۔

کانفرنس کے ایجنڈے میں:

فرقہ وارانہ فسادات کا سدباب،

مذہبی تبلیغ کی آزادی،

توہین بزرگانِ مذاہب سے گریز

مرتد کے قتل کی سزا

ذبیحہ گاؤ ـــــ وغیرہ مسائل شامل تھے۔

کانفرنس چار روز تک مسلسل جاری رہی۔ تمام اہل مذاہب نے سرگرمی سے حصہ لیا اور تمام مسائل کا متفقہ حل تلاش کر لیا گیا۔ اگر چہ ان فیصلوں کو جلد ہی فراموش بھی کر دیا گیا اور وقت کا دھارا اپنی بنائی ہوئی راہ پر بہتا رہا۔

اجلاس میں نو قرار دادیں پاس ہوئی (تفصیل کے لیے دیکھیے: کفایت المفتی، جلد نہم، کتاب السیاست ''اتحاد کانفرنس''ص ۶۲-۲۴۳)

حضرت مفتی صاحب نے اس کانفرنس میں سرگرمی سے حصہ لیا اور کیا کارنامہ انجام دیا، اس کا اندازہ حضرت کے اس خط سے ہوتا ہے، جو انھوں نے مولانا عبدالباری فرنگی محلی کے ایک خط کے جواب میں تحریر فرمایا تھا اور مولانا فرنگی محلی کے اس تبصرے سے بہ خوبی ہو جاتا ہے جو جواب الجواب کے طور پر مولانا مرحوم نے فرمایا تھا۔ حضرتؒ مفتی صاحب کا مکتوب گرامی اور اس پر حضرت مولانا فرنگی محلی کا تبصرہ یہ ہے:

۱- حضرت مفتی اعظم کا مکتوبِ گرامیؒ:

دہلی

۱۱ربیع الاول ۱۳۴۳ھ (۱۰/اکتوبر ۱۹۲۴ء)

مولانا المحترم! دامت فیوضکم، السلام علیکم ورحمتہ اللہ

مجھے سخت ندامت اور افسوس ہے کہ میں مفصل طور پر جناب کے تاروں کا جواب اس سے قبل نہ دے سکا۔ ایک اجمالی تار ارسالِ خدمتِ اقدس کر دیا تھا۔ جناب کے تاروں سے جناب والا کا تیقظ اور اسلامی غیرت اس پائے کا ثابت ہو گیا کہ اس کی نظیر ملنی مشکل ہے۔

مولانا! واقعہ یہ ہے کہ پہلے دن کے اجلاس موتمر میں خاکسار اگر چہ شریک تھا۔ مگر پہلا ریزولیوشن انگریزی میں پڑھا گیا اور اس کا اردو ترجمہ یا حاصل مطلب بیان کیا گیا۔ مگر میں حلفاً عرض کرتا ہوں کہ مجھے اس فقرے کا جو سزائے ارتداد کے متعلق ہے، اس وقت بالکل علم اور احساس نہ ہوا، واللہ اعلم کہ اردو میں وہ بیان سے رہ گیا یا میں نے نہیں سنا اور تجویز پاس ہو گئی۔

دوسرے روز جناب کا تار ملا۔ اس سے مجھے فوری خیال ہوا۔ اور میں نے پہلی تجویز کو تلاش کر کے دیکھا تو اس میں وہ الفاظ موجود تھے۔ سخت افسوس ہوا۔ اگر چہ معاملہ سب کا سب ہندوستان کے متعلق تھا، تاہم الفاظ میں عموم ضرور تھا۔ میں سخت کشمکش میں پڑ گیا۔

بالآخر سوائے اس کے کوئی تدبیر نہ کر سکا کہ ریزولیوشن نمبر ۴ کی تمہید میں میں نے اپنی ترمیم بہ ایں الفاظ پیش کی اور صدر صاحب کو معاملہ سمجھا کر اور ہاؤس اور اپنے بعض مہربانوں سے بحث ومباحثہ کر کے یہ الفاظ بڑھوائے کہ:

”ریزولیوشن نمبر ا میں ہندوستان کی مختلف قوموں کے تعلقات کو بہتر بنانے کے لیے جو عام اصول قرار دیے گئے ہیں... الخ“۔

اب ریزولیوشن نمبر ۴ بتاتا ہے کہ ریزولیوشن نمبر ا کا عموم قطعاً نہیں ہے۔ بلکہ وہ ہندوستان کے ساتھ مقید ہے ،اور ہندوستان سے بھی برٹش انڈیا مراد ہے۔ ہندوستانی ریاستیں بھی اس میں داخل نہیں ہیں۔

نیز جبکہ بعض ہندو مقررین کی طرف سے یہ مضمون بیان کیا گیا کہ جب تک مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے کہ وہ مرتد کو واجب القتل سمجھتے رہیں گے اور گویا قتل کرتے ہیں، اس وقت تک ہندو مسلمانوں میں نباہ نہیں ہو سکتا! میں نے بھرے مجمع میں اس کا جواب دیا کہ بیشک اسلام میں مرتد کی سزا قتل ہے اور ارتداد اسلام کے نزدیک ہولناک گناہ اور بدترین جریمہ ہے اور یہ اسلام کا ایک کھلا ہوا روشن اصول ہے میں اس کے ظاہر کرنے اور بیان کرنے میں کسی قسم کا تامل نہیں (کرتا)۔ مگر یہ کہنا کہ ہندوستان کے فسادات اس عقیدے کے نتائج ہیں اور مسلمان اس لیے ہندوؤں سے لڑتے ہیں کہ ان کے ارتداد یا اشاعت ارتداد کی سزا دیں، غلط ہے اس لیے کہ جیسا یہ اسلام کا مستحکم اصول ہے کہ ارتداد کی سزا قتل ہے۔ اسی طرح یہ بھی اسلام کا اصول ہے کہ اس سزا کو جاری کرنے کا اختیار سلطانِ اسلام کو ہے۔ پس موجودہ حالت میں ہندوستان میں مرتد کی سزا قتل ہونے سے کوئی تعلق نہیں۔ جس طرح تمام حدود اور قصاص یہاں جاری نہیں، اسی طرح مرتد کی سزا بھی جاری نہیں اور نہ مسلمان اس پر قادر ہیں۔ اس پر مولانا ابوالکلام صاحب نے فرمایا کہ مولانا یہ تو فرمایئے! بعد سوراج کیا ہوگا؟

میں نے کہا: سوراج کے بعد واضعانِ قانون کے اختیارات کی جو نوعیت ہو گی، اس کے مطابق فیصلہ ہوگا۔ اگر سوراج کے بعد اسلامی قانون کی ترویج کا کوئی موقع ہوا تو یقیناً اس کے موافق احکام جاری ہوں گے اور نہ ہوا تو حالت جس کی مقتضی ہو گی، وہ ہوگا!

تبلیغ کے متعلق میں نے صاف کہہ دیا کہ اسلام کی بنیاد تبلیغ پر ہے اور اس کے خمیر میں تبلیغ داخل ہے۔ وہ ایک کھلا ہوا تبلیغی مذہب ہے۔ اس کا دروازہ تمام دنیا کے لیے کھلا

ہوا ہے اور اس کے دامن کے نیچے تمام بنی آدم آسکتے ہیں۔ اس کو حق تبلیغ سے کوئی نہیں روک سکتا۔ اور ہندوستان کی موجودہ فضا میں مسلمانوں کو بھی یہ موقع نہیں کہ وہ کسی کو تبلیغ مذہب سے روک سکیں۔ ہاں! جس طرح اسلام کی تبلیغ جبر واکراہ، اطماع وخداع وغیرہ سے پاک ہے، اسی طرح دوسرے بھی ان ذمائم سے علیحدہ رہ کر صرف تبلیغ کرسکتے ہیں۔ یہ ذمائم درحقیقت تبلیغ مذہب کے لیے نہیں بلکہ اغراض نفسانی کے لیے کام میں لائے جاتے ہیں۔

"ان مضامین کو میں نے بھرے مجمع میں پوری بلند آہنگی اور وضاحت کے ساتھ بیان کردیا۔ حتی کہ سوامی شردھانند اور پنڈت مدن موہن مالویہ وغیرہ بڑے بڑے ہندوؤں نے بھی کہہ دیا کہ اب ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔ ہاں! پنڈت رام چندر جی نے کہا کہ کیوں صاحب اگر سلطان اسلام کے حکم کے بغیر کوئی مسلمان مرتد کو قتل کردے تو اس کی کوئی سزا ہے؟ میں نے کہا: "ہاں! وہ انتیات علی السلطان کے جریمہ کا مرتکب ہے اور اس کی سزا بادشاہ کی رائے پر ہے۔"

ہاں! مفتی محمد صادق قادیانی نے کہا کہ اسلام میں مرتد کی سزا قتل نہیں ہے، بلکہ اسلام ہر شخص کو ضمیر کی آزادی دیتا ہے، تو اس پر مولانا حسین احمد صاحب نے نہایت بلند آہنگی سے اور میں نے بھی کہہ دیا کہ یہ آپ کی رائے ہے، اسلام کا اصول نہیں ہے۔ اسلام میں بیشک مرتد کی سزا قتل ہے۔

مولانا! ایک ہفتے تک رات دن معاملات کو سلجھانے اور حقوقِ اسلامیہ وقومیہ کی حفاظت کی غرض سے کام کرنے میں جن دقتوں کا سامنا ہوا، اس کا بیان مشکل ہے۔ جن حضرات نے دیکھا ہے، وہی اندازہ کرسکتے ہیں۔ میں صرف اس قدر عرض کرسکتا ہوں کہ میری شرکت شخصی حیثیت سے تھی اور اس کی تصریح بھی کردی گئی تھی اور میں نے اپنی عقل فاتر اور فہم قاصر اور اپنی بساط کے موافق مذہبی اور قومی حقوق کی حفاظت میں کوئی فروگزاشت نہیں کی۔ اپنوں سے بھی اور غیروں سے بھی پوری نبرد آزمائی ہوئی۔ ہاؤس میں تقریراً اور بحثاً ہر طرح حقوق کی حفاظت کی۔ مطمحِ نظر صرف یہ تھا کہ ہندوستان میں آپس کا نفاق اور جنگ وجدل بند ہو اور ہر فریق اپنی جگہ اپنے فرائض مذہبی میں آزاد ہو اور دوسروں کے لیے رکاوٹ نہ ڈالے۔ ہندوستان کی موجودہ حالت میں ہماری یہی پوزیشن ہے اور اسی کو پیش نظر رکھ کر تجاویز مرتب کی گئی ہیں۔

باوجود اس کے اگر مجھ سے کوئی غلطی یا فروگزاشت ہوئی ہو تو میں اس کے اعتراف کے لیے تیار ہوں۔ امید کہ جناب والا دعا سے فراموش نہ فرمائیں گے۔

خاکسار

محمد کفایت اللہ غفرلہٗ

(۲)-اس خط کا جواب من جانب مولانا عبدالباری فرنگی محلی:

مولانا المحترم! السلام علیکم

گرامی نامہ آیا۔ کاش میرے تار کے جواب میں فوراً کوئی اطمینان بخش جملہ آجاتا تو مجھے تین چار روز تک بے اطمینانی نہ رہتی۔ اور مزید اصرار کی ضرورت نہ ہوتی۔

اس میں شک نہیں کہ جناب نے پوری سعی فرمائی، اور اپنے فرائض کو بہت خوبی سے انجام دیا۔ یہ واقعات جو جناب نے تحریر فرمائے، مجھے معتبر ذرائع سے معلوم ہو چکے ہیں۔ میرے نزدیک کوئی ادنیٰ لغزش جناب سے نہیں ہوئی۔ علام الغیوب اگر کسی لغزش سے واقف ہو تو اس کے رحم کا مقتضیٰ ہے کہ معاف فرمائے۔ مسلمانوں کو تو آپ کا شکر ادا کرنا واجب ہے۔

(دستخط مولانا) عبدالباری

(کفایت المفتی، جلد نہم، ص ۶۳-۵۹)

☆☆☆

باب پنجم

تصنیفات و تالیفات

چند نادر سیاسی تحریرات:

حضرت مفتی اعظم عالم کی حیثیت میں جتنے بڑے اور جامع الصفات ہیں۔ مصنف کی حیثیت سے اتنے ہی کوتاہ قلم ہیں۔ ان کی تصنیفات نہ تعداد کے لحاظ سے کثیر ہیں نہ صفحات کے اعتبار سے ضخیم! اگرچہ ان کے مجموعہ فتاویٰ نے جو نو جلدوں میں ان کے خلف رشید مولانا حفیظ الرحمٰن واصف نے ان کی وفات کے بعد مرتب کر کے چھپوادیا ہے۔ ان کی کوتاہ قلمی کی تلافی کر دی ہے۔ اس کا تذکرہ آئندہ صفحات میں اپنے مقام پر آئے گا۔ ان کی دوسری تالیف تعلیم الاسلام کے نام سے چار حصوں میں بچوں سے لے کر بڑوں تک کے لیے نہایت اہم، مفید اور اسلامی تعلیمات و مسائل میں معلومات کا خزانہ ہے۔ اسلامی تعلیمات پر اتنی جامع اور مستند تالیف نہ صرف اردو میں بلکہ وقت کی کئی زبانوں میں کوئی نہیں۔ متعدد زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ ایک چھوٹا سا رسالہ جواہر الایمان بھی اسلامی عقائد و ارکان میں لاجواب ہے۔ لیکن میرا موضوع حضرت مرحوم کی سیاسی زندگی کا مطالعہ ہے اس لیے میں یہاں اس مقام پر ان کی چند سیاسی نوعیت کی تحریرات کے بارے میں بعض اشارات کرنا مناسب سمجھوں گا۔

۱- میثاق لکھنؤ ۱۹۱۶ء میں مسلم لیگ اور کانگریس کے مابین طے پایا تھا۔ میثاق کی سب سے بڑی اور واحد خوبی یہ تھی کہ اس کے مطابق پنجاب اور بنگال میں جہاں مسلمانوں کی معمولی اکثریت تھی، وہاں بھی مسلمان اقلیت قرار پائے تھے۔ بلاشبہ مسلم اقلیت کے صوبوں میں انھیں چند زیادہ سیٹیں مل گئی تھیں لیکن اس سے مسلم اکثریت کے صوبوں میں مسلمانوں کو جو نقصان پہنچا تھا اس کی تلافی نہیں ہوئی۔

محمد علی جناح کا فلسفہ یہ تھا کہ سرمایہ دار کو مزید سرمایہ دار بنانے کا کیا فائدہ تھا؟ لیکن یہاں کسی کو مزید سرمایہ دار کہاں بنایا گیا تھا۔ اس سے جو کچھ لیا گیا تھا اس سے وہ تو غریب ہو گیا تھا اور جسے دیا گیا تھا اس سے اس کی غربت دور نہ ہوئی تھی اس لیے سرمایہ دار سے سرمایہ چھیننے

کا کیا فائدہ ہوا؟ اور اگر ایک سے چھین کر ہی دوسرے کو دیا جاسکتا ہے اور یہی سیاست کا اصول ٹھہرے تو پھر سیاست اور تدبر کیا ہوا؟

پنجاب اور بنگال میں مسلم سیٹیں کم کردینے کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمان پورے ملک میں اقلیت میں ہوگئے اور اکثریت میں ہونے کے باوجود وہ فائدے سے محروم ہوگئے۔ اور مسلم اقلیت کے صوبوں میں مسلمانوں کی چند سیٹیں بڑھادینے کا انھیں کوئی فائدہ نہیں پہنچا اس معاہدے کو کسی حلقے میں بھی پسند نہیں کیا گیا۔

حضرت مفتی صاحب نے اس پر مثبت انداز، سنجیدہ زبان اور مہذب اسلوب بیان میں تنقید کی جو تمام حریت پسند مسلمانوں کے دل کی آواز تھی۔

۲- ۱۹۱۷ء میں حضرت مفتی صاحب کا ایک رسالہ "مسلمانوں کے مذہبی اور قومی اغراض کی حفاظت" کے نام سے دلی پرنٹنگ ورکس، دہلی میں چھپا تھا۔ اس کے نام سے اس کے مضامین اور مقصد تحریر کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

۳- انجمن اعانت نظر بندان اسلام (۱۹۱۷ء) کے محرک اور کار فرما حضرت مفتی اعظم تھے۔ لیکن اس سلسلے میں انھوں نے اپنا نام کہیں نہیں آنے دیا۔ یہاں تک کہ حضرت شیخ الہند کے حالات وسوانح میں جو رسالہ لکھا تھا اور انجمن کی طرف سے شائع ہوا۔ اس پر بھی اپنا نام نہیں دیا۔ لیکن اب یہ بات راز نہیں رہی کہ یہ تاریخی کتابچہ (شیخ الہند، حضرت مولانا محمود حسن صاحب قبلہ محدث دیوبندی کے مختصر سوانح اور حالات اسیری) حضرت مفتی صاحب کے قلم کا شاہ کار و یادگار ہے۔

اس رسالے کے آخر میں حضرت شیخ الہند کی شان میں عربی میں جو مدحیہ اشعار ہیں وہ حضرت مفتی صاحب کی عربی شاعری کا نمونہ ہیں۔ یہ رسالہ دلی پرنٹنگ ورکس، دہلی سے ۱۹۱۸ء میں شائع ہوا تھا۔

(۴)- ۱۹۱۸ء میں مسلم لیگ کا گیارہواں اجلاس دہلی میں منعقد ہوا تھا۔ اس کے صدر مولوی فضل الحق (آف بنگال) تھے اور استقبالیہ کمیٹی کے صدر ڈاکٹر مختار احمد انصاری تھے۔ ان کا خطبہ استقبالیہ لکھنے میں حضرت مفتی صاحب نے ان کی مدد کی تھی۔ مرزا اختر حسن مؤلف تاریخ مسلم لیگ نے لکھا ہے کہ بد نصیبی سے آپ کا خطبہ حکومت صوبہ متحدہ (یوپی) نے ضبط کرلیا۔ اس وجہ سے مرزا صاحب نے صرف چند باتیں درج کی ہیں جن پر کوئی قانونی

گرفت نہیں کی جاسکتی تھی۔ اس جلسے کی ایک خوبی یہ بیان کی گئی ہے کہ اس میں بہت سے علمائے کرام شریک ہوئے تھے۔

جو شخص حضرت مفتی صاحب کے ذوق اور افکار سیاسی سے واقف ہے وہ اندازہ کر سکتا ہے کہ انھوں نے خطبہ استقبالیہ میں کیا کچھ شامل کر دیا ہوگا۔ مولانا منظور علی نے لکھا ہے:

"یہ خطبہ اپنی اہمیت اور جامعیت کے لحاظ سے مسلم لیگ اور سیاسیات ہند کی تاریخ میں خاص مقام رکھتا ہے"۔ (مفتی اعظم کی یاد، ص ۱۷۳)

اب ہمیں اس خطبے کے ضبط ہونے یا مولف تاریخ مسلم لیگ کی مجبوری اور بد نصیبی پر افسوس کرنے کی مطلق ضرورت نہیں۔ اس لیے کہ قاضی عدیل احمد عباسی نے اپنی تالیف "تحریک خلافت" میں اس خطبے کے تمام اہم حصے ترتیب دے دیے ہیں۔ (ص ۹۶-۱۰۳)

(۵)- آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کے مذہبی، تعلیمی، سیاسی، سماجی، اقتصادی حقوق اور ان کے پرسنل لا کا تحفظ جمعیت علمائے ہند کے پیش نظر ہمیشہ ایک ترجیحی مسئلے کے طور پر رہا۔ اس سلسلے میں ہمیشہ غور و فکر کیا جاتا رہا اور جمعیت کے آغاز سے اس کا کوئی عام اور مجلس عاملہ کا اجلاس ایسا نہیں ہوا جس میں کوئی ایسا مسئلہ زیر غور و بحث نہ آیا ہو۔

۱۹۲۷ء میں سائمن کمیشن کے ہندوستان میں آنے کے بعد ملک کے سامنے ایک متفقہ دستور کا چیلنج سامنے آیا، جسے پورے عزم کے ساتھ قبول کر لیا تھا۔ پنڈت موتی لال نہرو کی صدارت میں مختلف جماعتوں کے نمایندوں پر مبنی ایک کمیٹی تشکیل دی گئی۔ اس نے جو دستور بنایا، اس پر سخت تنقیدیں ہوئیں۔ اس میں اقلیتوں، خصوصاً مسلمانوں کے حقوق کے تعین اور ان کے تحفظ کا پیمانہ جمعیت علمائے ہند کے کم سے کم تصور سے بھی فروتر تھا۔ نہرو کمیٹی کی رپورٹ (ہندوستان کے مجوزہ دستور) پر جمعیت کی مقررہ کمیٹی کی رپورٹ حضرت مفتی صاحب نے تالیف فرمائی تھی۔ اس کی اصل خوبی تنقید کا توازن، غیر فرقہ وارانہ انداز، حقیقت پسندانہ رویہ اور الفاظ کی جامعیت تھی۔

نہرو کمیٹی کی رپورٹ کو واپس لینے میں جو وجوہ بنیاد بنے تھے، ان میں حضرت مفتی اعظم کی یہ تنقید بھی تھی۔ ۱۹۲۹ء کے اجلاس کانگریس (لاہور) میں یہ رپورٹ واپس لے لی گئی اور آزادی کامل کا ریزولیوشن پاس ہوا۔ ۱۹۳۰ء سے جدوجہد آزادی تاریخ کے نئے دور میں

داخل ہوئی۔

(۶)- کفایت المفتی (مجموعۂ فتاویٰ نو جلدیں):

حضرت مفتی اعظم رحمہ اللہ نے سیاسی مسائل، میں متعدد اہم رسالے تحریر فرمائے۔ ان کی علمی، فکری اور تاریخی سیاسی اہمیت مسلم ہے۔ لیکن جس چیز نے مسلمانوں کی سیاسی تربیت میں سب سے زیادہ اور موثر حصہ لیا، وہ حضرت کے فتوے تھے جو لوگوں کے استفسارات کے جواب میں بھیجے جاتے تھے اور اخبارات و رسائل میں شائع بھی ہوتے تھے۔ ان فتوؤں کا مجموعہ کفایت المفتی کی جلد نہم کا باب "کتاب السیاسیات" ہے۔ یہ اگرچہ کل فتوے نہیں ہیں لیکن ان کی تاریخی سیاسی اہمیت اور ان کے وسیع دائرہ اثر کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

مفتی صاحب کی سیاسی فتویٰ نویسی کا دور جمعیت علمائے ہند کے قیام کے ابتدائی زمانے ہی سے شروع ہو گیا تھا اور مفتی صاحب کی زندگی کے آخر دور تک جاری رہا۔ یہ مفتی صاحب کے نام سیاسی استفسارات جمعیت علمائے ہند کے دفتر میں، مدرسۂ امینیہ کے دارالافتاء میں اور اخبار الجمعیۃ کے اجرا کے بعد اس کے دفتر میں آتے تھے۔ ان استفسارات میں چوں کہ وقت کے سیاسی حالات اور کسی نہ کسی طرح جمعیت کی پالیسی زیر بحث آتی تھی اور ملکی اور قومی مسائل میں شریعت اسلامیہ کی رہنمائی مطلوب ہوتی تھی۔ اس لیے جمعیت علماء کے دفتر اور اخبار الجمعیۃ کے دفتر میں آئے ہوئے خطوط بھی حضرت مفتی صاحب کی خدمت میں بھیج دیے جاتے تھے اور حضرت مفتی صاحب مرحوم اپنی صحت کی کمزوری، مدرسے میں درس وافتا اور اہتمام کی مصروفیات اور جمعیت علماء کے فکری اور علمی کاموں کے انتہائی ہجوم میں بھی یہ فریضہ ہمیشہ انجام دیتے رہے۔

اگرچہ ایک زمانے میں کام کی اہمیت اور حضرت کی صحت کی کمزوری کے خیال سے یہ طے پاگیا تھا کہ کسی عالم دین کی خدمات حاصل کرلی جائیں اور اسے جمعیت علماء کا مفتی مقرر کردیا جائے۔ لیکن سعی بسیار کے باوجود ایسا کوئی عالم دین میسر نہ آسکا، جس کے مطالعہ و تدبر پر حضرت مفتی صاحب جیسا اعتماد کیا جاسکے۔ چونکہ یہ منصب مجرد فتویٰ نویسی کا نہ تھا بلکہ جمعیت علمائے ہند کی دینی اور اس کے سیاسی مسلک کی ترجمانی اور وکالت کا بھی تھا۔ اس کے لیے یہی کافی نہ تھا کہ مفتی مصنف اور مقرر ہو۔ اس لیے دینی علوم میں صاحبِ رسوخ اور سیاست میں پختہ ذوق اور گہری نظر کا حامل کوئی شخص جو حضرت مفتی صاحب کا جانشین بن سکے، نہ میسر

آیا، نہ کسی کا تقرر ہو سکا اور نہ مفتی صاحب کو فتویٰ نویسی کی ذمہ داری سے نجات مل سکی۔ ۱۹۴۵ء کے ایک استفسار (مطبوعہ زمزم - لاہور) میں مفتی صاحب نے خود وضاحت فرمائی ہے کہ وہ اس خدمت کے لیے کوئی تنخواہ یا اعزازیہ وصول نہیں کرتے۔

حضرت مفتی اعظم نے ہزاروں سیاسی استفسارات کے جوابات تحریر فرمائے۔ کفایت المفتی کی نویں جلد کا ایک طویل اور مستقل باب "کتاب السیاسیات" انہیں جوابات کا مجموعہ ہے۔ یہ جوابات مختصر اخبارات کی تیس پینتیس برس کی جلدوں میں پھیلے ہوئے تھے۔ اور کچھ کی نقول مدرسہ امینیہ کے دارالافتاء کے رجسٹروں میں محفوظ تھیں۔ حضرت مفتی صاحب کے خلف الرشید اور جانشین صادق مولانا حفیظ الرحمٰن واصف نے نہایت کاوش اور تلاش و تحقیق کے بعد انھیں مرتب کر دیا ہے۔ لیکن ابھی سیکڑوں جوابات اب بھی کچھ تو اخبارات کی فائلوں ہی میں اور سیکڑوں ملک کے لوگوں کے خانوادوں میں ہوں گے اور سیکڑوں اب تک ضائع بھی ہو چکے ہوں گے۔ یہ مجموعہ (کفایت المفتی جلد نہم) ملت اسلامیہ ہند کی، خصوصاً اسلامی تعلیمات کے حوالے سے ایسی تاریخ ہے جس کی مثال موجود نہیں۔ اس میں ہزاروں قومی و ملکی مسائل میں دو ٹوک رائے دی گئی ہے اور شریعت اسلامیہ کی روشنی میں مسلمانوں کی سیاست کی صراطِ مستقیم کو واضح کیا گیا ہے۔ اور یہی وہ فلسفہ ہے جس پر جمعیت علمائے ہند کی رہنمائی کی بنیاد قائم ہے۔

کفایت المفتی کی نویں جلد ۴۶۰ صفحات اور صرف دو کتب۔ کتاب الحظر والاباحۃ و کتاب السیاسیات پر مشتمل ہے۔ اور جلد کے ۲۸۸ صفحوں (۲۷۳ تا ۴۶۰) میں سیاسی مسائل و افکار کے سلسلے میں استفسارات کے جوابات ہیں۔

(۷)- تحریرات ثلاثہ متعلق سارد اایکٹ:

ہندوستان کی بعض اقوام میں لڑکیوں کی شادی بچپن ہی میں کر دینے کا رواج تھا۔ اس سے بے شمار شخصی، خاندانی اور سماجی مفاسد پیدا ہوتے تھے۔ نیز جسمانی عوارض لاحق ہونے کے علاوہ بعض اوقات اموات تک واقع ہو جاتی تھیں۔ اسلام میں اولیاء کو اجازت ہے کہ مصالح کا تقاضا ہو تو بچپن میں بھی بچوں کا نکاح کر دے سکتے ہیں۔ یہ اجازت ہے، حکم نہیں، لیکن بلوغ سے پہلے رخصتی کی اجازت نہیں۔ نیز بلوغ کے بعد لڑکی کو حق ہے کہ اپنے عقد نکاح پر غور کرے اور عدم رضامندی کی صورت میں اسے علیحدگی کا اختیار ہے۔

اس سے بچپن میں لڑکیوں کے نکاح کی اجازت سے ان کی ذاتی زندگیوں میں، ان کے خاندانوں میں اور معاشرے میں وہ مفاسد پیدا نہیں ہوتے جن سے اول الذکر صورت میں بچنا مشکل ہو جاتا ہے۔ البتہ مصالح ضرور حاصل ہوتے ہیں۔ بچپن کی شادیوں سے مسلم معاشرے کے سوا ان مفاسد کے انسداد کے لیے سارد ابل پیش کیا گیا تھا بل کے مجوزہ محرک کے پیش نظر اس کا دائرہ اثر ہندوستان کا صرف غیر مسلم معاشرہ تھا لیکن اسمبلی کے جدت پسند مسلمان ممبران اور لیگی اراکین نے جن کی نظر اسلامی قوانین ازدواج اور ان کے مصالح و حکم پر نہ تھی، مسلمانوں تک اس کا دائرہ اثر بڑھانے کی ترمیم منظور کروا کے چھوڑی۔ یہ حکومت کی مسلمانوں کے پرسنل لا میں صریح مداخلت تھی۔ اس پر مسلمانوں نے شدید احتجاج کیا۔ جلسوں میں تقریروں، مجلسوں میں قراردادوں، اخبارات میں مضمونوں: کتابچوں کے ذریعے اس ظلم کے خلاف احتجاج کیا گیا، لیکن لچس لیٹو میں مسلم لیگ کے بااثر ارکان کے مساعی سے بل کو ایکٹ بنا کر بہ شمول مسلمانان ہند ملک میں نافذ کر دیا گیا۔

جمعیت علمائے ہند کے صدر حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ شاہ جہاں پوری ثم دہلوی نے اس سلسلے میں تین تحریرات تالیف فرمائی تھیں۔ ان تینوں تاریخی تحریرات کا ذیل میں تعارف کروایا جا رہا ہے۔ یہ تحریرات مولانا حفیظ الرحمٰن واصف خلف الرشید حضرت مفتی اعظم نے کفایت المفتی کی پانچویں جلد میں مرتب کر دی ہیں۔ ان کی تفصیل یہ ہے:

۱- تحریری بیان بر قانون تعیین عمر رضامندی — کتاب النکاح، باب ۲۲، ص ۴۳-۳۴۴

۲- مکتوب بنام وائسرائے — ،، — ،، — ص ۶۰-۳۴۴

۳- سادرابل کی حقیقت — ،، — ،، — ص ۸۱-۳۶۰

پہلی تحریر: شادی کی عمر کے تعیین کے بارے میں رائے عامہ کی تحقیق کے لیے گورنمنٹ کی مقرر کردہ کمیٹی کے سوال نامے کے جواب میں حضرت مفتی صاحب کی تاریخی تحریر۔

دوسری تحریر: یہ وائسرائے کے نام حضرت مفتی صاحب کا خط ہے جس میں اسلامی شریعت میں اس بل کے ذریعے گورنمنٹ کی مداخلت اور مسلمانوں کے لیے اس بل کی سنگینی کے مسئلے پر مفصل اور بہت مدلل روشنی ڈالی ہے۔ اور اس سے مسلمانوں کی بے زاری پر بحث کی ہے۔ یہ خط اسی زمانے میں ناظم جمعیت علمائے ہند نے اقبال پرنٹنگ ورکس دہلی میں چھپوا کر شائع بھی کر دیا تھا۔ اس پر ناظم (مولانا احمد سعید دہلوی) کے قلم سے مختصر تمہید اور اختتامیہ بھی ہے

(صفحات ۲۸)۔ نیز الجمعیۃ دہلی ۱۹ اور ۱۳ر نومبر ۱۹۲۹ء کی دواشاعتوں میں بھی چھپ گیا تھا۔

تیسری تحریر "ساردا بل کی حقیقت" کے عنوان سے اسی مسئلے میں ہے اور وائسرائے کے نام خط لکھنے سے پہلے ۲ر اکتوبر کو لکھ کر رسالے کی صورت میں چھپوائی گئی تھی۔

گورنمنٹ نے مسلمانوں کے احتجاج اور ان کی گذارشات پر کوئی توجہ نہیں کی ساردا ایکٹ بنادیا گیا۔ جمعیت علمائے ہند کی شاندار خدمات کے سلسلے میں حضرت مفتی اعظم کی یہ تینوں تحریرات تاریخ اسلامیانِ ہند میں ہمیشہ یادگار رہیں گی۔

۸- ایڈون مانٹیگو برطانوی پارلیمنٹ کے لبرل ممبر اور لائڈ جارج کابینہ میں سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا تھے۔ عالمی جنگ کے شروع ہونے سے پہلے دارالامرا میں ایک تقریر میں انھوں نے کہا تھا: "ہندوستان ..... دینا ممکن نہیں۔ اس وقت کے آنے سے پہلے بہت سال اور کئی نسلیں ختم ہوجائیں"۔

اسی تقریر میں انھوں نے یہ پر معنی جملہ بھی کہا تھا:

"اب ہندوستان کے مختلف حصوں کو مختلف انداز میں چلانا پڑے گا"۔

لیکن جنگ نے برطانیہ کو جس حال میں پہنچادیا تھا، وہ مجبور تھا کہ ہندوستان کے مسئلے پر غور کرے۔ چنانچہ اگست ۱۹۱۷ء میں اعلان کیا گیا کہ "برطانیہ کا مقصد ہندوستان میں ذمہ دار حکومت کا قیام ہے۔" اس فیصلے کے مطابق مانٹیگو نے لارڈ چیمس فورڈ (وائسرائے ہند) کے ساتھ صلاح ومشورہ کرکے "ہندوستان کی دستوری اصلاحات سے متعلق رپورٹ تیار کی اور جولائی ۱۹۱۸ء میں شائع ہوا۔ رپورٹ کی تجاویز پر مبنی "گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۱۹ء" منظور ہوا۔ اس دستور کے تحت صوبوں میں دو عملی نظام حکومت نافذ ہوا اور بلدیات کو خود مختاری دی گئی تھی"۔

(تاریخ تحریک آزادی (جلد سوم) ڈاکٹر تاراچند، نئی دہلی، ۱۹۸۵ء، ص ۳۱-۳۰)

حضرت مفتی صاحب نے اس ایکٹ پر تنقید میں ایک رسالہ لکھا تھا۔ مولانا حفیظ الرحمن واصف نے اپنے مقالے (مطبوعہ، مفتی اعظم کی یاد" ص ۸۵) میں اس کا ذکر کیا ہے۔

☆☆☆

دینی کتب ورسائل ۱۹۱۶ء

۱- کف المومنات عن حضور الجماعات:

حضرت مفتی صاحب کا یہ فتویٰ عورتوں کے مجالس وعظ میں شرکت کے باب میں ہے اور جمعات وعیدین کے اجتماعات میں شرکت کے جواز وعدم جواز کا مسئلہ بھی زیر بحث آیا ہے۔ حضرت مفتی صاحب کی تحقیق عدم جواز پر روشنی ڈالتی ہے۔ یہ فتویٰ ۱۳۳۴ھ (۱۹۱۶ء) میں کتابی شکل میں حاجی عبدالرحمٰن نے شائع کر دیا تھا۔ حضرت مفتی صاحب کا یہ فتویٰ حنفی مسلک کے مطابق تھا۔

۲- صلوٰۃ الصالحات:

حضرت مفتی صاحب کا یہ رسالہ کف المومنات پر ایک تنقید کے جواب میں ہے۔ مولوی عبدالستار کلانوری نے "عید احمدی" کے نام سے جو تنقید لکھی تھی۔ مفتی صاحب نے اس کے مغالطات کے رفع میں قلم اٹھایا اور اوسط ضخامت کا ایک رسالہ مورخہ یکم ذی الحجہ ۱۳۳۴ھ (۲۹؍ ستمبر ۱۹۱۶ء) کو رقم فرما دیا۔ یہ رسالہ بھی اسی زمانے میں چھپ گیا تھا۔

ان رسائل کی کتابی اشاعتیں تو نادر و نایاب ہیں البتہ مولانا حفیظ الرحمٰن واصفؔ نے کفایت المفتی جلد پنجم میں مرتب کر دیا ہے۔ دیکھیے:

پہلا رسالہ: کف المومنات..... مشمولہ کتاب الحجاب: ص ۳۹۱-۴۰۷

دوسرا رسالہ: صلوٰۃ الصالحات: " ص ۴۰۸-۴۴۱

۳و۴- النفائس المرغوبہ فی حکم الدعاء بعد المکتوبہ:

سنن ونوافل کے بعد اجتماعی دعا کے مسئلے میں حضرت مفتی صاحب کا یہ نہایت محققانہ فتویٰ ہے، جو مشاہیر علمائے سنت کی تصدیقات کے ساتھ جون ۱۹۱۶ء میں پہلی بار شائع ہوا تھا اور دینی حلقوں میں بہت مقبول ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ایک ضمیمہ ہے اسی زمانے میں ایک رسالہ "اللطائف المطبوعہ" کے نام سے حضرت مفتی صاحب کی نظر سے گزرا جو "النفائس المرغوبہ" پر تنقید میں تھا۔ مفتی صاحب نے اس کے تسامحات کی نشاندہی اور بعض مطالب

کے ایراد میں ایک تحریر بہ عنوان ''الصحائف المرفوعہ فی جواب اللطائف المطبوعہ'' تالیف فرماکر اپنے رسالے کی دوسری اشاعت میں شامل کر دی۔

دوسری بار یہ رسالہ جید برقی پریس، دہلی سے ۱۳۴۹ھ (۱۹۳۱ء) میں شائع ہوا تھا۔ بعد میں یہ رسالہ کئی ناشرین نے چھاپا۔ میرے سامنے مکتبۂ رشیدیہ۔ کراچی کی اشاعت ہے۔ اس کی تقطیع ۳۰×۲۰/۱۶ اور ضخامت ۱۲۸ صفحات ہے۔

۵و۶- مجموعہ رسائل مفیدہ و مبارکہ:

یہ اس مجموعہ رسائل کا نام نہیں۔ مجموعے کے سرورق اور صفحہ اوّل پر نام اس طرح درج ہے:

دلیل الخیرات فی ترک المنکرات

خیر الصلات فی حکم الدعاء الاموات

یہ ایک فتویٰ ہے جو حضرت مفتی اعظم نے رنگون سے آنے والے ایک استفتا کے جواب میں تحریر فرمایا تھا۔ اس فتوے میں میت کی تدفین سے قبل اور بعد خاص طریقے سے دعاؤں کے اہتمام کے بارے میں شریعت اسلامیہ حقہ کا حکم دریافت فرمایا تھا۔ جواب استفتاء سے پہلے بہ طور مقدمہ بدعت کی تعریف، رسوم کے ایجاد و لزوم پر تنبہ اور ترک منکرات کے بیان میں جو مضمون تحریر فرمایا تھا، اس کے مطالب کی اہمیت کے پیش نظر مقدمہ یا تمہید وغیرہ کے رسمی عنوان کے بجائے مستقل عنوان ''دلیل الخیرات فی ترک المنکرات'' سے درج فرمایا۔ (.. تا ص ۲۲)

اس کے بعد استفتا مندرج ہے (ص ۲۳ تا ۲۴) اور پھر مفتی صاحب کا فتویٰ بہ عنوان ''خیر الصلات فی حکم الدعاء الاموات'' ص ۲۴ تا ۴۰ درج ہے۔

مستفتی حاجی داؤد ہاشم یوسف نے رنگوں سے جو استفتا، حضرت مفتی صاحب کو بھیجا تھا، وہی استفتا، انھوں نے ہندوستان کے دوسرے علماء کو بھی بھیج دیا تھا اور ان کے فتوے بھی دستیاب ہوگئے تھے، انھیں بہ طورِ تکملہ شامل کر دیا گیا (ص ۴۱ تا ۸۷) یہ تمام فتوے ۱۳۳۵ھ اور ۱۳۳۶ھ (۱۸-۱۹۱۷ء) کے مکتوبہ ہیں۔ ان کا مجموعہ اسی زمانے میں دہلی سے شائع ہو گیا تھا۔

میت کے بارے میں انھیں مواقع کے بعض رسوم اور دعاؤں کے التزام و اہتمام کے

بارے میں بہت سے فتوے مولانا قاضی الدین (رنگون) نے جمع کیے تھے۔ یہ اطراف ملک کے ایک سو چونتیس نامور علماء کے ۱۳۴۳ھ (۱۹۲۵ء) کے مکتوبہ ہیں اور بہ طور ضمیمۂ مبارکۂ اولی شامل ہیں۔ (ص ۹۷ تا ۱۲۴)۔ حضرت مفتی اعظم کا بھی ایک فتویٰ اس ضمیمے میں درج ہے (نمبر ۱۴، ص ۹۴)

آخر میں ایک ''ضمیمۂ ثانیہ برائے دلیل الخیرات وخیر الصلات'' شامل ہے۔ اس میں بھی اسی قسم کے ایک موقع اور رسموں کے بارے میں بہت سے مشاہیر علمائے دین کے فتوے شامل ہیں۔ (ص ۱۲۵ تا ۱۴۸) یہ فتوے ۱۳۴۱ھ (۱۹۲۳ء) کے یادگار ہیں۔

مجموعۂ فتاویٰ پہلی بار ۱۳۳۶ء (۱۹۱۸ء) میں دہلی سے اور دوسری اور تیسری بار ۱۹۲۳ء اور ۱۹۲۶ء میں ضمیموں کے اضافے کے ساتھ شائع ہوا تھا۔ اس کا ایک عکسی ایڈیشن میر محمد کتب خانہ (آرام باغ)، کراچی نے شائع کیا ہے۔

حضرت مفتی صاحب کا یہ فتویٰ جو ۱۳۳۶ھ میں شائع ہوا تھا۔ کفایت المفتی جلد چہارم کتاب الجنائز کے چوتھے باب میں شامل ہے۔ (صفحہ ۶۷-۱۲۷)

۷-البیان الکافی مرتبہ مولانا حکیم ابراہیم راندیری

مطبوعہ ۱۳۳۶ھ

رویت ہلال رمضان وعیدین کے بارے میں حضرت مفتی اعظم کا ایک مفصل فتویٰ البیان الکافی میں شامل ہے۔ یہی فتویٰ ملاحظہ ہو۔

کفایت المفتی، جلد ۴، کتاب الصوم، باب اول، صفحہ ۲۷-۲۱۸

۸- قنوت نازلہ اور اس کے متعلقہ مسائل:

قنوتِ نازلہ ایک دعا ہے جو کسی عام مصیبت کے پیش آنے کے وقت جہری نمازوں میں — اور عام طور پر فجر کی نماز میں پڑھی جاتی ہے۔ اس کے بارے میں کسی صاحب کے استفتا کے جواب میں حضرت مفتی صاحب نے جو فتویٰ تحریر فرمایا تھا اور دیوبند، سہارن پور، دہلی اور بعض علمائے میرٹھ و کلکتہ نے تصدیق کی تھی۔ اسے کسی مخیّر نے افادہ عام کے لیے ۱۳۳۸ھ (۱۹۲۰ء) میں دلی پرنٹنگ ورکس، دہلی سے چھپوادیا تھا۔

یہ رسالہ ۳۰×۲۰/۱۶ سے چھوٹی تقطیع میں سولہ صفحات پر مشتمل ہے۔

۹- اصولِ اسلام:

یہ مفتی صاحب کا مختصر اور نہایت مفید رسالہ ہے۔ بار بار شائع ہوا اور بہت مقبول ہوا، کتاب کی صورت کے علاوہ پوسٹر کی شکل میں بھی چھاپا جاتا رہا۔ تاج کمپنی، لاہور۔ کراچی نے جواہر الایمان، کے نام سے بھی شائع کیا۔ اس میں اسلامی عقائد اور عبادات نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کے مسائل کے علاوہ عصری زندگی میں پیش آنے والے مسائل بیان کیے گئے ہیں۔ یہ ۳۰×۲۰/۱۶ کی تقطیع میں ۳۲ صفحے کا رسالہ ہے۔

۱۰- اتمام المقال فی بعض احکام التمثال:

حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نے ایک فتویٰ نعل نبوی سے تبرک و توسل کے جواز میں دیا تھا، جو "نیل الشفاء بنعل المصطفیٰ" کے عنوان سے کتابچے کی شکل میں چھپوا بھی دیا گیا تھا۔ اس میں نعل شریف کی ایک مصنوعی اور غیر واقعی شکل بھی چھاپ دی گئی تھی۔ اس کے حوالے سے ایک مستفتی نے حضرت مفتی صاحب سے حکم شرعی اور تبرک و توسل کے جواز کی حقیقت کے بارے میں استفسار کیا تھا۔

حضرت مفتی صاحب نے تفصیل کے ساتھ اس کا جواب تحریر فرمایا۔ لُبِ لباب اس کا یہ تھا کہ اگر جسم اطہر نبوی کا کوئی خاص حصہ مثل موئے مبارک یا ناخن مبارک یا جسم اطہر سے مس ہونے والی کوئی شے مثل جُبہ و عمامہ مبارکہ وغیرہ ہو تو ان سے تبرک حاصل کیا جاسکتا ہے۔ یہ تو نعل مبارک کی محض تصویر ہے اور وہ بھی اصلی نہیں۔ ایک فرضی نقش ہے۔ اس سے تبرک و توسل کیوں کر جائز ہو سکتا ہے! اس سلسلے میں مفتی صاحب نے اپنا فتویٰ مولانا تھانوی کو بھی مطالعہ و غور کے لیے بھیج دیا تھا۔ اس کے بعد دونوں بزرگوں میں مراسلت کے ذریعے تبادلۂ خیالات ہوا اور حضرت تھانوی نے اپنے فتوے سے رجوع فرمالیا اور حضرت ہی کے مشورے اور تجویز کے مطابق "اتمام المقال فی بعض احکام التمثال" کے نام سے بہ شمول مراسلاتِ جانبین حضرت مفتی صاحب نے افادۂ عام کے لیے شائع فرمادیا۔

خاکسار کو یہ اصل رسالہ تو دستیاب نہ ہو سکا لیکن "کفایت المفتی (جلد دوم) کتاب السلوک والطریقہ" میں فاضل مرتب مولانا حفیظ الرحمٰن واصف نے اسے شامل کرلیا ہے۔ حضرت تھانوی کا مرجوع منہ رسالہ "زادالسعید" میں شامل ہے۔ اس میں بھی حضرت نے

اپنے سابقہ فتوے سے رجوع کا اعتراف اور استغفار فرمایا ہے اور اس میں ''اتمام المقال فی بعض احکام التمثال'' کا حوالہ بھی دیا ہے، یہ رسالہ ۱۹۳۷ء میں یا اس کے بعد جلد ہی شائع ہو گیا تھا۔

۱۱- کفایت المفتی: ترتیب و تدوین مولانا مفتی حفیظ الرحمٰن واصف دہلوی:

کفایت المفتی نو جلدوں پر مشتمل ہے۔ ان کے مجموعی صفحات ۳۹۴۰ ہیں۔ ان میں طویل و مختصر ۳۹ کتب ہیں۔ بعض کتب اتنی مفصل ہیں کہ ایک ایک جلد کی ضخامت میں پھیلی ہوئی ہیں۔ بعض جلدوں میں ایک سے زیادہ کتب ہیں، جن کی تفصیل یہ ہے؛

☆ جلد ۳و۶ میں ایک ایک کتاب ہے

☆ جلد ۱، ۵، ۷و۹ میں دو دو کتابیں ہیں

☆ جلد ۴ میں چار کتابیں ہیں

☆ جلد ۸ میں نو کتابیں ہیں

☆ جلد ۲ میں تیرہ کتابیں ہیں

ان نو جلدوں میں مجموعی طور پر انتالیس کتب ہیں۔

یہ گویا کہ وقت کے ہمہ قسم کے اہم مسائل و ضروریات میں ایمان و عقائد سے لے کر معاشیات و سیاسیات تک ایک مسلمان زندگی کے انتالیس موضوعات میں نہایت جامع اور رہنما تصنیفات ہیں۔

''ہر کتاب'' متعدد ابواب میں اور ابواب فصول میں تقسیم کیے گئے ہیں۔

☆ ''کتاب'' کا مقام ایک مستقل موضوع یا کسی علم و فن کا ہے۔ مثلاً نماز، حج، زکوٰۃ، تفسیر، علم، سلوک و طریقت، معاشیات، سیاسیات وغیرہ۔

☆ ''ابواب'' اس موضوع یا علم و فن کے اہم مباحث و اطراف ہیں اور

☆ ''فصول'' ان کے ذیلی و ضمنی تقسیمات و متفرقات ہیں۔

''ہر کتاب'' اپنے موضوع پر عنوان کتاب سے لے کر فصل کی سب سے چھوٹی اور آخری تقسیم تک اپنے موضوع کے تمام اطراف اور چھوٹے چھوٹے نکات علمیہ تک کی جامع ہے اور تمام مباحث کے درجہ استناد اور معیارِ تحقیق سے تا تالیف و تدوین و تقسیم مطالب اتنی علمی ہے کہ اگر مکررات کو جو ہر فتاویٰ میں ناگزیر طور پر پائے جاتے ہیں، حذف کر دیئے جائیں تو ایک مسلمان کی عام اور روزمرہ زندگی کی چھوٹی بڑی انتالیس رہنما کتابیں تیار ہو جائیں گی، جو

مختلف علوم وفنون کے اطراف پر محیط اور حسن وسلیقہ تالیف وتدوین کے لحاظ سے اپنے موضوعات پر شاندار اور محققانہ تصنیفات ثابت ہوں گی۔

مسائل میں پایۂ تحقیق کے ثبات اور درجۂ استناد کی محکمی حضرت مفتی اعظم کے ذوقِ تفقہ، تبحر علمی، جامعیتِ علوم وفنون، کمالِ بصیرت، باریک بینی، نکتہ آفرینی کی شاہ کار ہے اور فتاویٰ کی حسن ترتیب اور تالیف وتدوین کا کارنامہ حضرت مرحوم کے خلف ارشد واکبر مولانا مفتی حفیظ الرحمٰن واصف مرحوم کے ذوقِ علمی اور محنتِ شاقہ کا رہین منت ہے۔

کفایت المفتی کی سیاسی اہمیت کا ذکر اسی باب کے نمبر ۱ (چند نادر سیاسی تحریرات) کے ضمن میں آچکا ہے۔

۱۲-اردو قاعدہ:

بچوں کی اردو تعلیم کے آغاز کے لیے نہایت مفید رسالہ، تعلیم الاسلام کے سلسلے کی پہلی کڑی یہی رسالہ تھا۔ اس لیے اس کا پورا نام تعلیم الاسلام کا اردو قاعدہ تھا۔ جہاں مدارس میں تعلیم الاسلام نصاب میں شامل تھا، وہاں اردو تعلیم کا آغاز اس قاعدے سے کیا جاتا تھا۔ یہ قاعدہ متعدد لسانی خوبیوں کا بھی جامع ہے۔ اس کی ضخامت ۳۲ صفحات اور تقطیع ۳۰×۲۰/۱۶ ہے۔

۱۳- تعلیم الاسلام:

اردو قاعدہ کے بعد تعلیم الاسلام ۳۰×۲۰/۱۶ تقطیع کے چار حصوں پر مشتمل ہے۔ الگ الگ چاروں حصوں کی ضخامت ۳۰، ۳۲، ۲۷، ۹۶ صفحوں کی ہے۔ یہ حضرت مفتی صاحب کی عند الناس سب سے مقبول تالیف ہے۔ عام طور پر کتابیں اپنے مصنف کی نسبت سے شہرت پاتی ہیں، لیکن یہ ایسی کتاب ہے جس کی نسبت سے اس کے مولف نے شہرت پائی۔ اس کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ دلی کے گلی کوچوں میں "تعلیم الاسلام والے مفتی صاحب" مشہور ہوئے۔ یہ کتاب اور اس کے مولف کی عند اللہ مقبولیت کا اشارہ بھی ہے۔

تعلیم الاسلام' حصہ دوم تا چہارم "ایمان وعقائد" اور اسلام کے "ارکان واعمال" کے دو دو شعبوں میں تقسیم ہے۔ پہلے حصے کو اگرچہ/بہ صراحتِ عنوان اس طرح تقسیم نہیں کیا گیا ہے، لیکن وہ بھی کچھ ماننے کی اور کچھ کرنے کی ضروری باتوں پر مشتمل ہے۔ ایمان وعقائد کی باتیں تمام وہی ہیں جن کی تعلیم "ایمان مفصل" میں دی گئی ہے۔ یعنی اللہ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی نازل کی ہوئی کتابوں پر، اس کے بھیجے ہوئے رسولوں پر، آخرت کے دن

پر، اللہ کی لکھی ہوئی اچھی بُری تقریر پر اور مرنے کے بعد اسی کی طرف لوٹ جانے پر ایمان رکھنے پر! دوسرے شعبے میں معروف ارکانِ اسلام - نماز، زکوٰۃ، حج اور رمضان کے روزوں کی فرضیت اور ان کے شرائط کا بیان ہے۔

تعلیم الاسلام کے ہر حصے کے بنیادی مضامین یہی ہیں۔ البتہ طالب علم کے تعلیمی درجات اور فہم کی سطح جوں جوں بلند ہوتی جاتی ہے، مضامین کی تعلیمی سطح بھی بلند ہوتی جاتی ہے اور مطالب کا پھیلاؤ بڑھتا جاتا ہے اور اس کے ساتھ حصص کے صفحات میں بھی اضافہ ہوتا جاتا ہے اور تحتانی اسکول کے آخری درجے تک پہنچتے پہنچتے، اسلام کے عقائد وارکان کی بنیادی اور ضروری تعلیم معیار، تشریح اور وسعت کی ایک خاص حد تک مکمل ہو جاتی ہے اور روزمرہ زندگی میں پیش آنے والے مسائل سے پوری واقفیت ہو جاتی ہے۔

جس طرح درجات میں ترقی، فہم میں اضافہ اور معلومات کی وسعت بڑھتی جاتی ہے، اسی طرح زبان کی آسانی اور سادگی اور روزمرہ اور عام بول چال کی زبان بھی ادبی اور فنی (فقہی) زبان کے سانچے میں ڈھلتی جاتی ہے، لیکن سلاست وروانی اور ابتدائی عمر کے بچوں کے لیے فہم کی سہولت میں کوئی مشکل پیدا نہیں ہوتی۔

تعلیم الاسلام چھوٹی عمر کے مسلمان بچوں کی دینی تعلیم کا ایک نہایت مفید سلسلہ ہے، لیکن مسائل کا درجہ استناد بلند ہے، اختلافی مسائل، فلسفیانہ اسلوب بیان اور فقہی نکتہ آفرینیوں اور مباحث کی پیچیدگیوں سے اجتناب کیا ہے، یہ ہندوستان پاکستان کا مقبول ترین تعلیمی سلسلہ ہے۔ اسے پچاسوں ناشرین نے چھاپا ہے۔ گذشتہ تقریباً پون صدی سے سیکڑوں مدارس کے نصاب میں شامل ہے۔ صرف پاکستان میں سرکار سے منسلک صدہا مدارس اور دیگر پچاسوں اسلامی مدارس و مکاتب میں اسے پڑھایا جاتا ہے اور پاکستان میں سندھی، پشتو، ..... وغیرہ زبانوں میں اس کے تراجم شائع ہو چکے ہیں۔ انگریزی میں ہندوستان، پاکستان اور ساؤتھ افریقہ میں دو ترجموں کی اشاعت خاکسار کے علم میں آئی ہے۔

مولانا حفیظ الرحمٰن واصف مرحوم نے درس الاسلام کے نام سے اسے اردو میں نظم بھی کر دیا ہے اور اس کے کئی حصے چھپ چکے ہیں۔

غیر مرتب اور غیر مطبوعہ تحریرات:

یقین ہے کہ مفتی صاحب کے پچاسوں فتوے، خطوط اور دیگر تحریرات ابھی تک منتشر، غیر مرتب اور غیر مطبوعہ ہوں گی۔ یہاں صرف ایک تحریر (فتوے) کی نشاندہی کی جاتی ہے۔

مفتی صاحب نے ایک فتویٰ فاحشہ کے اپنے فواحش سے کمائے ہوئے مال کے عدم جواز کا دیا تھا۔ مولانا عبداللہ غازی پوری نے اس کا رد کیا۔ حضرت مفتی صاحب نے ان کی رائے سے اختلاف کیا تھا۔ مولانا غازی پوری اور مفتی صاحب کے یہ دونوں فتوے کفایت المفتی (جلد ہفتم کی کتاب المعاش) میں شامل ہیں۔ مولانا غازی پوری نے مفتی صاحب کے دوسرے فتوے کا فلس کیپ سائز کے چالیس صفحات میں رد لکھا۔ مفتی صاحب کے قلم سے اس کے جواب میں جو تحریر وجود میں آئی وہ ساٹھ صفحات میں پھیلی ہوئی تھی اور چونکہ عربی زبان میں تھی اس لیے کفایت المفتی میں شائع نہیں کی گئی اور اس سے الگ بھی اس کی اشاعت عمل میں نہ آسکی۔

یہ بات قرین قیاس ہے کہ اس قسم کی اور تحریرات بھی ہوں گی جن کی تدوین واشاعت کی ابھی تک نوبت نہیں آئی۔

☆☆☆

باب ششم:

شاعری

ایک زمانے میں اور ایک حد تک اب بھی علم معانی و بیان، اس میں فصاحت و بلاغت کے اصول، صنائع و بدائع، فن شاعری اور اس کے لوازم عروض، وزن، بحر، قافیہ و ردیف محاسن و معائب سخن وغیرہ مدارس عربیہ کے نصاب کا حصہ تھے۔ ان علوم وفنون کی تعلیم شاعری کے نکات سے ذوق کو آشنا کر دیتی تھی۔ منطق وکلام کے درس و مطالعہ سے بھی اس ذوق و فن کی تکمیل میں کسی نہ کسی حد تک مدد ملتی تھی۔ اس کے نتیجے میں معمولی سی توجہ اور تھوڑی سی شعر گوئی میں طبعیت کی رکاوٹ دور کر دیتی تھی اور ذہن کی درّاکی، نکتہ رسی، خیال کی بلندی، فکر کی پرواز، مُطالعہ و مشاہدہ کا تنوع شعر کی موزونیت میں روانی پیدا کر دیتی تھی۔ پھر مختلف واقعات و حوادث شعر گوئی کے محرکات بنتے رہتے اور کلام میں فن کی پختگی کا سر و سامان ہو تا رہتا تھا۔

حضرت مفتی اعظم نے فن شاعری، اس کے لوازم، علم معانی و بیان، فصاحت وبلاغت کے اصول، اوراس کے ساتھ منطق وکلام کو بہ طورِ فن کے درس میں سبقاًسبقاً پڑھا تھا اور ذوق کی مناسبت، طبیعت میں شعر گوئی کی فطری ودیعت اور وقت کے حوادث نے شعر گوئی کے محرکات بن کر انھیں شاعری کے میدان میں لا کھڑا کیا تھا۔

ان کا جو کلام ہمیں دست یاب ہوا ہے، وہ ۱۹۰۸ء کا یادگار ہے، لیکن اس میں فن کی پختگی، کلام کی روانی اور فصاحت و بلاغت جس درجے کی پائی جاتی ہے، وہ اس بات کی غماز ہے کہ شاعر کو یہ مقام دو چار برس کی مشق سخن سے حاصل نہیں ہو سکتا تھا اور جب ہم یہ بات سوچتے ہیں تو یہ خیال ہمارے ذہن سے دور نہیں رہتا کہ مفتی صاحب کا یہ شوق کم از کم تعلیم سے فراغت کے فوراً بعد ۱۸۹۷ء کے لگ بھگ ضرور پیدا ہو گیا تھا۔ انھوں نے مشق جاری رکھی ہو گی۔ اس لیے فن میں پختگی، کلام میں روانی اور شاعرانہ خصوصیات تو پیدا ہو گئیں، لیکن کلام محفوظ یا موجود نہ ہونے کی وجہ سے اس کے آغاز کی قطعی تاریخ کے تعین میں ہمیں دشواری

پیش آرہی ہے۔

حضرت مفتی اعظم کا کلام کم و بیش کے فرق سے عربی، فارسی اور اردو ــــ تین زبانوں میں موجود ہے۔ کئی اصحاب ذوق اور اہل قلم نے ان کی شاعری کے بارے میں لکھا ہے۔ سب سے پہلے تو حضرت کے خلف اکبر مولانا حفیظ الرحمٰن واصف نے لکھا ہے:

"عربی اور فارسی میں بہت عمدہ شعر کہتے تھے۔ اردو میں بھی کچھ تھوڑی سی شاعری کی ہے"۔ (مفتی اعظم کی یاد، ص ۹۷)

پروفیسر رشید احمد ارشد صاحب نے ان کے قصیدے "روض الریاحین" کے مطالعے کے بعد لکھا ہے:

"حضرت مفتی صاحب عربی زبان کے قادر الکلام شاعر تھے۔ آپ کا قصیدہ "روض الریاحین"... آپ کی قادر الکلامی کی بہت بڑی دلیل ہے"۔

(مفتی اعظم مولانا کفایت اللہ دہلوی (مقالہ) مشمولہ "بیس بڑے مسلمان"، ۱۹۷۰ء لاہور ص ۴۴۶)

مولانا نسیم احمد فریدی نے بھی حضرت مفتی صاحب کے ایک قصیدے کے مطالعے کے بعد کلام کی فصاحت و بلاغت، موثر اسلوب، جذبات کے اظہار کمال اور اس کی زبان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تاثیر کا اعتراف کیا ہے۔ (مفتی اعظم کی یاد، ص ۱۶۴)

یہ قصیدہ جس کے بارے میں فریدی صاحب نے اظہار خیال فرمایا ہے، ملتان سنٹرل جیل کے سپرنٹنڈنٹ میجر فضل الدین کو مخاطب کر کے عید کے موقع پر (ذوالحجہ ۱۳۵۱ھ مطابق ۱۹۳۳ء میں) لکھا تھا۔ میجر فضل الدین کے بارے میں معلوم ہے کہ وہ عربی و فارسی زبانوں کے فاضل اور ادب کے ذوق سے آشنا تھے۔ یہ قصیدہ بھی پروفیسر رشید احمد ارشد کی نظر سے گزرا ہے۔ ان کا خیال ہے:

"وہ بھی نہایت فصیح و بلیغ اور موثر قصیدہ ہے"۔

(ایضاً، بیس بڑے مسلمان، ص ۴۴۶)

اولاً ماہنامہ القاسم دیوبند میں حضرت مفتی صاحب کے کلام کی اشاعت کا پتا چلتا ہے۔ معلوم ہو کہ القاسم دیوبند کا اجراء جب ۱۳۲۸ھ (جولائی ۱۹۱۰ء) میں ہوا تھا۔ معلوم ہوتا ہے

کسی خاص تحریک سے شعر کہتے تھے،ذوقِ شعری فطری تھا۔طبیعت میں صلاحیت موجود تھی۔
انھوں نے شعر گوئی کا مستقل مشغلہ اختیار نہیں کیااور نہ کلام کو جمع کرنے اور محفوظ رکھنے کی
طرف توجہ کی۔ان کا کلام نہ کسی کے پاس محفوظ تھااور نہ کسی لکھنے والے کے سامنے تمام کلام
موجود تھا۔اس لیے ان کی شاعری کے بارے میں نہ لکھنے کی حد تک کم لکھا گیا ہے۔

☆ فارسی کا کلام کسی کے سامنے نہ تھا۔اس لیے فارسی شعر کے بارے میں کسی نے کوئی رائے
بھی نہ دی۔

☆ اردو کلام میں صرف تین نظمیں دستیاب ہیں۔

☆ عربی کا کل کلام بھی تین چار منظومات سے زیادہ دستیاب نہیں۔

متوقع مآخذ:

مختلف مضامین کے مطالعے سے مفتی صاحب کے کلام کی جو نشان دہی ہوتی ہے،وہ
یہ ہے؛

۱- القاسم دیوبند کے ابتدائی دور میں ان کے عربی قصائد کی اشاعت کی نشاندہی کی گئی ہے ۔القاسم رجب ۱۳۲۸ھ (جولائی ۱۹۱۰ء) میں نکلنا شروع ہوا تھا۔چند برس کے بعد اس کی اشاعت میں تعطل پیدا ہو گیا۔اس کا دور ثانی وہ ہے جب ۱۹۱۶ء میں مولانا مناظر احسن گیلانی نے اسے ہاتھ میں لیا۔اس کا دورِ اوّل ۱۹۱۰ء تا ۱۹۱۵ء کا زمانہ ہے۔ ابھی تک چوں کہ حضرت مفتی صاحب پر کوئی تحقیقی کام سامنے نہیں آیا۔اس لیے القاسم کے لعل و جواہر تک ابھی کسی کی نظر نہیں پہنچی۔ بہ ہر حال القاسم حضرت مفتی اعظم کے افادات کا ایک اہم ماخذ ہے۔

۲- حضرت مفتی صاحب کے افاداتِ علمیہ وادبیہ کا دوسرا اہم ماخذ مدرسۂ امینیہ کی سالانہ رودادیں ہیں جن میں مرحوم کے افادات نظم یا نثر میں عربی، فارسی یا اردو میں ضرور دستیاب ہوں گے۔چند اردو اشعار کا حوالہ تو خود حضرت مفتی اعظم نے علامہ سید سلیمان ندوی کے نام خط میں دیا ہے:

"اردو کے چند اشعار روداد مدرسہ میں چھپے ہیں"۔

(مکاتیب مولانا مفتی کفایت اللہ: معارف اعظم گڑھ،جون ۱۹۶۵ء ص ۴۷۱)

۳- ایک ماخذ رسالہ البرہان شاہ جہاں پور ہے۔اس میں منثور افادات تو ہیں، ممکن ہے

منظوم افادات سے بھی کوئی ندرہ ہاتھ آجائے۔ تحقیق کی جائے تو یقین ہے اور ماٰخذ بھی سامنے آئیں گے۔

۴- مولانا نسیم احمد فریدی امروہوی کے مضمون سے مفتی صاحب کی ایک عربی نظم مشمولہ ''نفحۃ العرب'' کا پتا چلتا ہے۔ مولانا فریدی لکھتے ہیں:

''ایک مرتبہ جب ایک کتاب نفحۃ العرب'' (تالیف مولانا اعزاز علی) کی طباعت کے سلسلے میں دہلی گیا تو کتب خانۂ عزیزیہ میں حضرت سے مشورہ لینے کے لیے حاضر ہوا تھا۔ کتاب کی کاپیاں میرے ہمراہ تھیں۔ اپنی نظم کی کتابت کو ملاحظہ فرمایا۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب، حضرت نے سرسری نظر تمام صفحے پر ڈال کر فوراً ایک زبردست غلطی کا پتا چلالیا اور اس غلط لفظ کو کاٹ کر حاشیے پر صحیح لفظ لکھ دیا۔ اور فرمایا: ''کاتب نے اس مصرعے میں ''ینا غی'' غلط لکھ دیا ہے، ''یغانی'' ہونا چاہیے''۔ مصرع یہ ہے:

وکم بین حسرٍ از یغانی غزالۃً

(مفتیِ اعظم کی یاد، ص ۶۴- ۱۶۳)

دستیاب نوادرِ شعری:

اب دستیاب نوادر ادبیہ شعریہ پر بھی ایک نظر ڈال لینی چاہیے:

۱- عربی کلام:

(الف) حضرت مفتی صاحب کے کلام میں ایک نظم حمد و نعت میں یادگار ہے۔ اس کے مضمون یا ماخذ سے اس کے زمانۂ تخلیق کا پتا نہیں چل سکا۔ اس لیے بہ طور تبرک بھی اور حسبِ روایت بھی اس کا ذکر شروع ہی میں کیا جاتا ہے۔

اس نظم میں کل انیس اشعار ہیں، مضامین کی ترتیب کے لحاظ سے تیرہ اشعار حمد کے بیان میں، چار شعر نعت کے اور خاتمے کے دو شعر قرآن وحدیث کے درس و تعلم میں مصروف رہنے والے خدام دین کی منقبت میں ہیں۔ کلام کی نوعیت اس طرح ہے کہ انواع مخلوقات میں حیوانات، نباتات، جمادات، اور مناظرِ فطرت اور مظاہر قدرت میں آسمان، زمین، سورج، چاند، ستارے، میدان، صحرا، ریگستان، سمندر، پہاڑ، وادیاں، باغ، درخت،

پودے، پھول، پتے اور ان کی صفات میں شگفتگی، تازگی، رعنائی، لطافت، رنگ وخوشبو وغیرہ ان کے کیف وسرور کا ذکر لف ونشر مرتب اور غیر مرتب میں نہایت حسن وخوبی اور کمال سلیقہ وفن کاری سے کیا ہے۔ نیز اللہ تعالیٰ کی ربوبیت، رحمت، خلاقی، کرشمہ سازی کے حسن بیان پر قاری انگشت بہ دندان رہ جاتا ہے۔

نعت کے اشعار کا آغاز حضرت نبی آخر الزماں علیہ الصلوات والتسلیمات پر درود وسلام سے کیا ہے اور اس احسان کا ذکر کیا ہے کہ مسلمانوں کو ایک روشن، صاف تحریف کے خطرے اور کمی بیشی کے عیب سے پاک ایک شریعت ملی اور بعثت نبوی کا یہ فیضان عظیم ہوا کہ ایک دوسرے کے جانی دشمن آپس میں بھائی بھائی بن گئے اور جہنم کے گڈھے میں گرنے سے محفوظ ہوگئے۔ آپ ہی اللہ تعالیٰ کے حقیقی ثنا کرنے والے (الحامد) ہیں اور آپ ہی احترام وستایش کے سب سے اونچے مقام "المقام المحمود" پر فائز ہیں۔

قرآن حکیم اور حدیث شریف کے خدام کا ذکر کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں قرآن وحدیث کی خدمت کے لیے چن لیا ہے۔ اُس نے اُن کے درس و تعلّم کی ذمہ داری ان کے سپرد کی ہے۔ ان کے شرف کے لیے یہ کافی ہے کہ وہ حب جاہ ومال کے لیے نہیں، خدا کی رضاو خوش نودی کی شراب سے سرشار ہیں۔

یہ حضرت مفتی صاحب کے حسنِ بیان اور طرزِ اسلوب کا کمال ہے کہ دماغ پر ایک سکر کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور طبیعت میں ایک سرور پیدا ہو جاتا ہے۔ مفتی صاحب کے فکر میں گیرائی، بیان میں نکتہ آفرینی، زبان میں سادگی اور اسلوب میں سادگی اور لطافت کا مرکب ہے۔ عربی چونکہ دنیا کی وسیع الصفات زبان ہے اور ایک قادر الکلام شاعر کے کلام میں نادر لغات کا ایک عظیم الشان ذخیرہ ہوتا ہے۔ جو روزمرہ بول چال کی زبان میں نظر نہیں آسکتا۔ اس لیے شعر کی زبان کے فہم میں مشکلات کا در آنا لازمی ہوتا ہے۔ لیکن کسی شاعر کی لسانی مہارت۔ لغات پر عبور اور قادر الکلامی کا پتا اس کی شاعری ہی سے چلتا ہے۔

(ب) سب سے پہلا قصیدہ جس کا پتہ چلا ہے، وہ ہے جو حضرت مفتی اعظم نے ۱۳۲۶ھ (۱۹۰۸ء) میں مدرسہ اسلامیہ امینیہ کے سالانہ جلسے میں پڑھ کر سنایا تھا اور بعد میں اسے ترجمہ وحواشی سے مزین کر کے ۱۹۰۹ء میں مطبع افضل المطابع، دہلی سے "روض الریاحین" کے نام سے چھپوایا بھی تھا۔ یہ قصیدہ بعض اہل علم واصحاب ذوق کی نظر سے گزرا ہے۔ پروفیسر

رشید احمد ارشد نے اسے مرتب کر کے ایک رسالے میں چھپوا بھی دیا ہے (ماہنامہ بینات، کراچی بابت ماہ ذوقعدہ وذوالحجہ ۱۳۸۶ھ مطابق مارچ واپریل ۱۹۶۷ء)۔ اس پر کچھ لکھنے کے بجائے مناسب ہو گا کہ حافظ صاحب کے مطالعے اور ان کی رائے سے استفادہ کیا جائے۔ حافظ صاحب لکھتے ہیں:

"اس عربی قصیدے میں مفتی صاحب نے قدیم مذہبی مدارس اور علماء کا تذکرہ کرتے ہوئے مشاہیر اساتذہ دیوبند کے علمی اور مذہبی کارناموں کا خصوصی طور پر نہایت شاندار الفاظ میں تذکرہ کیا ہے۔ چناں چہ یہ قصیدہ اپنی فصاحت وبلاغت کی وجہ سے اس قدر پسند کیا گیا کہ حاضرین جلسہ اور مدرسہ امینیہ کے سرپرستوں نے یہ فرمائش کی کہ اسے اردو ترجمہ اور مختصر حواشی کے ساتھ شائع کیا جائے۔ نیز ان حواشی میں ان اساتذہ دیوبند کے مختصر حالات بھی بیان کیے جائیں، جن کے اسمائے گرامی کا تذکرہ قصیدے میں آیا ہے۔
لہذا حضرت مفتی صاحب نے خود اشعار کا سلیس اور بامحاورہ اردو ترجمہ کیا اور حواشی بھی خود اپنے قلم سے تحریر فرمائے۔ آپ نے بعض مشکل الفاظ کی وضاحت بھی حواشی میں بہ زبان عربی کی ہے۔ آپ نے علمائے دیوبند کے حالات اردو میں تحریر فرمائے ہیں، جو مختصر ہونے کے باوجود جامع ہیں"۔

(ایضاً، بیس بڑے مسلمان، ص ۴۴۵)

"روض الریاحین" دو عربی قصیدوں پر مشتمل ہے:
پہلے قصیدے میں مدرسہ امینیہ کی تاریخ، اس کے قیام کا پس منظر، اس کے بانی، اس کے اساتذہ اور اپنے اسلاف کرام کا تذکرہ ہے۔ تمہیدیا آغاز میں توحید، رسالت، حضرت نبی مکرم، علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے مقام واحسان کا ذکر ہے۔ پھر قرآن کے صفات اور تبلیغ کی ضرورت کا بیان ہے۔ قیام کے پس منظر میں حضرت نانوتوی کا ذکر ہے کہ انھوں نے ایک مدرسے کی بنیاد رکھ کر علم وتہذیب کے دورِ جدید کا آغاز کیا تھا۔ اس کے بعد حصہ "تشبیب" میں مدرسہ امینیہ کے بانی مولانا امین الدین، مدرسہ کے اساتذہ کرام مولانا ضیاء الحق (دہلوی)، محمد قاسم، انظار حسین، عبدالغفور اور رحمت اللہ کا ذکر ہے۔ ان کے بیان کا آخری شعر یہ ہے:

فکلهم لا قدام صدق وکلهم لحلال العقید

(یہ سب صاحبِ آثار حسنہ ہیں اور سب مشکل گرہوں کو کھولنے والے ہیں)
اس کے بعد چند اشعار میں مولانا انور شاہ کشمیری کا ذکر کیا ہے۔ اس ذکر کے دو منتخب شعر یہ ہیں:

ونختم ذاالکلام بذکر حبر   فقیدالمثل علام فرید
(اب اہم ایک بڑے عالم کے ذکر پر یہ کلام ختم کرتے ہیں۔ وہ بے نظیر علامہ یکتائے زمانہ ہیں)

فھٰذالحبر غارس ذاالنخیل   واول موقظ القوم الرقود
(یہ علامہ اس درخت کے لگانے والے ہیں اور سوتی ہوئی قوم کو جگانے والے پہلے شخص ہیں)

اس کے بعد کے دو شعروں میں اساتذہ کے مقابلے میں اپنے عجز وانکسار کا ذکر کیا ہے:

وما انا مثلھم فی الفضل لکن   رجائی ان یُغطّونی بجود
(اور فضیلت میں ان سے میرا کوئی مقابلہ نہیں، لیکن امید ہے کہ اپنی عنایت سے یہ مجھے بھی اپنی جماعت میں شامل کرلیں۔

و ان اُعلیٰ نصیبا وافرآمن   شراب الفضل من حب القعید
(امید ہے کہ ہم نشیں کی محبت سے مجھے بھی شرابِ فضل سے کچھ حصہ نصیب ہو جائے۔

مولانا انور شاہ کشمیری اسی سال (۱۳۲۷ھ میں) دارالعلوم دیوبند تشریف لے گئے۔ یہاں یہ جان لینا بھی ضروری ہے کہ مدرسہ امینیہ کے قیام اور اس کے بانی کے تذکرے کے بعد مدرسے کے ایک معاون اور مخیّر حاجی محمد اسحاق اور ان کے ایثار کا ذکر متعدد اشعار میں شان دار الفاظ میں آیا ہے۔

قصیدے کے آخری حصے میں جو اس کے خاتمے اور دعا کا حصہ ہے، اپنے اساتذہ و محسنین اور اسلاف کرام کا ذکر نہایت شان دار الفاظ میں کیا ہے اور ان کے علم و فضل، نظر و بصیرت اور زہد واتقا کا اعتراف کیا ہے۔ ان میں مولوی حکیم مسعود احمد ابن حضرت گنگوہی، مولانا محمود حسن (دیوبندی)، مولانا خلیل احمد (سہارنپوری)، مولانا عبد الرحیم (رائے پوری)، مولانا حافظ احمد (ابن حضرت قاسم نانوتوی) اور مولانا رشید احمد گنگوہی (رحمہم اللہ تعالیٰ) اور

ان کے محامد کا بیان کیا ہے۔اور تین اشعار میں مختصراً حضرت (شیخ الہند) مولانا محمود حسن دیوبندی کے محامد بیان فرمائے ہیں۔

دوسرا قصیدہ: حقیقت یہ ہے کہ دوسرا قصیدہ تبدیل قافیہ کے ساتھ پہلے قصیدے کا حصہ ہے۔اگرچہ وہ ایک مستقل قصیدہ بھی ہے۔ پہلے قصیدے میں اپنے بزرگوں اور استاد میں حضرت شیخ الہند کا ذکر صرف تین اشعار میں آیا تھا۔ لیکن مفتی صاحب کو اپنے استاد و مربی حضرت شیخ الہند سے جو محبت تھی اس کا تقاضا اس سے بہت زیادہ اور شدید تھا کہ حضرت کے محاسن و محامد اور کمالات کا ذکر زیادہ تفصیل کے ساتھ اور ایک مستقل قصیدے میں کیا جائے۔ دوسرا قصیدہ دراصل ان کے اسی شوق کی تکمیل ہے۔

یہ قصیدہ پہلے قصیدے کا نہ حصہ ہے اور نہ اس کا تکملہ۔ یہ ایک مکمل قصیدہ ہے جو مفتی صاحب نے لکھ کر پہلے قصیدے کے ساتھ شامل کر دیا۔اس قصیدے کا عنوان یہ ہے:

"وقال ایضاً یمدح شیخه ویشکرنعمائه"

قصیدے میں آغاز و گریز اور تشبیب و دعا کے تمام فنی لوازم پائے جاتے ہیں۔ زبان و بیان کی تمام خوبیاں اس میں موجود ہیں۔اس کی زبان میں بلاغت اور اسلوب میں فصاحت ہے۔الفاظ شان دار ہیں، تراکیب پُر معنی ہیں، استعارات و کنایات اور تشبیہات سے کام لیا گیا ہے۔ جس سے افکار کی بلندی اور خیالات کی رنگینی میں بہت اضافہ ہو گیا ہے۔ قصیدے کا آغاز غزل کے انداز میں ہوا ہے۔ شاعر گزرے ہوئے زمانے کو یاد کرتا ہے۔ اس کی عیش و راحت اور محبوب کے قرب و وصال کی لذتوں کو یاد کرتا ہے۔ پھر محبوب کے اعراض، اس کے فراق کے ابتلا، اپنوں کی بے رخی، ملامت کرنے والوں کی ملامت، مایوسی کی انتہا اور اپنے ہلاک ہو جانے کے خطرے کا تذکرہ کرتا ہے کہ اچانک آسمان سے ایک آواز آتی ہے کہ جا اور مرشد روحانی کی خدمت میں حاضر ہو!

فاذانداء من السماء جاء نی ان لُذبتنوِ المرشدالروحانی

یہ گریز کا شعر ہے اس کے بعد مرشد روحانی کے محاسن و محامد کا بیان شروع ہو جاتا ہے۔ یہ مرشد روحانی شاعر کے شفیق اور رحیم و کریم استاذ و مربی حضرت مولانا محمود حسن کی ذات والا صفات ہے۔ انھیں شجر سایہ دار سے اور ان کے فیضان کو فطرت کے علم و معرفت اور تقویٰ و خشیت سے تشبیہ دی ہے، پھر چاند اور سورج سے اور ان کی روشنیوں

کو دعوت و توحید اور علوم یقینیہ اور معرفت الٰہی کے انوار سے تشبیہ دی ہے اور بتایا ہے کہ حضرت کے چہرے پر سجدوں کے نشان اور عبادت کا نور ہے۔ اس کے بعد حضرت کے علم، شرافت، بہادری، بردباری، سخاوت، احسان، مخلوق خدا کی ہم دردی و غم گساری کے انسانی صفات بیان کیے ہیں اور پھر علوم عالیہ مثل قرآن، حدیث اور فقہ وغیرہ علوم مفیدہ میں آپ کے کمالِ تبحر کا ذکر کیا ہے اور روحانی فضائل بیان فرمائے ہیں۔ نیز مدرسہ اسلامیہ دیوبند کی صدر نشینی اور فیضان مدرسہ کے دائمی اجرا کے لیے دعا پر قصیدے کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ آخری شعر یہ ہے:

لازال مدرسته جرت منها عیون   العلم والتوحید والعرفان

(خدا کرے اس مدرسے کو کبھی زوال نہ ہو اور علم و توحید اور معرفت کے چشمے اس سے ہمیشہ جاری رہیں)

"روض الریاحین" میں اشعار کا ترجمہ اور ان پر مفید حواشی قصیدہ گو حضرت مفتی صاحب کے قلم سے یادگار ہیں اس مضمون میں اشعار کے ضمن میں ترجمے کا نمونہ آپ نے ملاحظہ فرمالیا۔ حافظ رشید احمد ارشد نے حواشی کا نمونہ بھی پیش کیا ہے۔ ایک حاشیے کی عبارت اور مطالب کا نمونہ یہ ہے۔ مفتی صاحب لکھتے ہیں:

> "حضرت مولانا و مقتدانا و مرشدنا مولوی محمود حسن صاحب دیوبندی، علم کے بحر ذخار، معرفت و حقیقت کی موسلادھار بارش، تواضع وانکساری کی صحیح تصویر، مواسات اور مہمانی میں فرد عظیم، شیوخ ہند کے شیخ اعلیٰ، سلسلۂ روایت کے منتہی، مدرسۂ عالیۂ دیوبند کے مدرسِ اعلیٰ، طلبہ کے لیے میدان طلب کے مقصود اقصیٰ، کریم النفس، صافی السریرہ، ذکی القلب ہیں۔ حضرت مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ کے تلمیذ خاص اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کے منظورِ نظر و مقرب باختصاص، علم حدیث کے امام، ندوہ اعلام، بختہ الکرام، سلامۂ خاندانِ اتقیائے عظام، آپ کا وجود طالبین علوم کے لیے رحمت ہے۔ خاکسار کو بھی حضرت اقدس سے شرفِ تلمذ حاصل ہے۔ خدا تعالیٰ آپ کے وجود باجود کو تادیر سلامت رکھے اور مستفیدین ظاہر و باطن کو آپ کے انفاس قدسیہ سے متمتع فرمائے۔ آمین!"

(ایضاً، بیس بڑے مسلمان، ص ۲۷۴)

مولانا قاری محمد طیب صاحب نے حضرت مفتی اعظم کی وفات پر جو مضمون لکھا تھا (مفتی اعظم کی یاد میں، ص ۱۲۸) اس کے مطالعے سے معلوم ہوا کہ القاسم، دیوبند کے دورِ اول میں ایک قصیدہ شائع ہوا تھا، اس کا مطلع یہ شعر تھا:

عرفت الله ربی من قریب　　　فکم بین الاله و العبید

یہ مطلع دراصل اسی قصیدے کا ہے جو ۱۹۰۸ء میں مدرسۂ امینیہ اسلامیہ کے جلسے میں پڑھا گیا تھا اور ۱۹۰۹ء میں بہ عنوان "روض الریاحین"، مطبع افضل المطابع، دہلی میں چھپا تھا اور القاسم میں اس کے اجراء (۱۹۱۰ء) کے بعد دور اول میں شائع ہوا تھا۔

قاری صاحب مرحوم کے بیان سے القاسم میں مطبوعہ "بعض عربی مضامین" میں سے کم از کم ایک قصیدے کی نشان دہی تو ہو گئی۔ کاش اشاعت کے شمارے کا پتا بھی چل جاتا۔ خدا کرے کوئی صاحبِ ہمت دیگر عربی مضامین نظم و نثر کی نشاندہی فرمادیں۔

۲- مفتی اعظم نے اپنے استاذ اور مربی حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن کی یاد میں تیرہ اشعار کی ایک نظم ۱۹۱۸ء میں لکھی تھی، جب وہ مالٹا میں اسیر تھے۔ محمد سالم نے اسے قصیدۂ فراقیہ قرار دیا ہے۔ مفتی صاحب نے یہ قصیدہ حضرت شیخ الہند کے حالات میں "انجمن اعانت نظر بندانِ اسلام" کی طرف سے شائع ہونے والے رسالے کے آخر میں مع ترجمہ کے شامل کیا تھا۔ اس میں انھوں نے حضرت کے فضائل علمی و روحانی بیان فرمائے ہیں۔

تیرہ اشعار کی اس نظم پر قصیدے کا اطلاق تو صحیح نہیں البتہ نظم نہایت عمدہ ہے۔ اس میں حضرت شیخ الہند کے لیے امام الخلق، وقت کے جنیدؒ و سریؒ، قدوہ جمیع، اخلاق میں فرید، تقویٰ میں وحید، ہدایت کے شمس، محبت کے طور، مظلومانہ اسارت میں مثیل یوسفؑ وغیرہ خطابات استعمال کیے گئے ہیں۔

اس رسالے کی ایک خاص بات یہ ہے کہ اس کے نام وعنوان میں "شیخ الہند" کا خطاب استعمال نمایاں کیا گیا ہے۔ اور اس سے ۱۹۰۹ء میں "روض الریاحین" کے حواشی میں حضرت کے لیے شیوخ ہند کے شیخ اعلیٰ کی صفت سے متصف کیا گیا ہے جو "شیخ الہند" کے متبادل جملہ ہے۔ یہ مالٹا کی اسارت سے رہائی اور وطن واپسی پر بمبئی میں خلافت کمیٹی کے جلسے میں حضرت کو "شیخ الہند" کا خطاب دیے جانے سے دو برس اور گیارہ برس پہلے کے واقعات ہیں۔ اس لیے اگر یہ خیال ذہن میں آجائے کہ اس خطاب کے محرک و مجوز حضرت مفتی اعظم

ہیں تو تعجب نہ کرنا چاہیے۔ مفتی صاحب حضرت کی وطن واپسی کے تاریخی موقعے پر بمبئی میں موجود تھے۔

دردِ فراق: ۱۹۱۸ء میں مفتی اعظم محمد کفایت اللہ شاہجہانپوری ثم دہلوی نے حضرت شیخ الہند کے حالات میں جو رسالہ ''شیخ الہند - حضرت مولانا محمود حسن صاحب قبلہ محدث دیوبندی کے مختصر سوانح و حالات اسیری'' کے عنوان سے تحریر فرمایا تھا اور ''انجمن اعانت نظر بندانِ اسلام۔ دہلی نے دلی پرنٹنگ ورکس۔ دہلی میں چھپوا کر شائع کیا تھا۔ اس کے آخر میں تیرہ اشعار کی ایک عربی نظم جو حضرت کے درد جدائی و مہجوری میں ''مالٹا'' کو مخاطب کر کے لکھی تھی شامل ہے۔ اس وقت تک حضرت کے حالات میں یہ پہلا رسالہ تھا جو شائع ہوا اور نظم دوسری جو حضرت کی شان میں اور درد فراق کے بیان میں لکھی تھی۔ پہلی نظم وہ قصیدہ ہے جو ۱۹۰۸ء میں مفتی صاحب نے تحریر کیا تھا اور مدرسہ امینیہ اسلامیہ کے جلسے میں پڑھا تھا۔ اس کے بعد ترجمہ و حواشی سے مزین کر کے ۱۹۰۹ء میں ''روض الریاحین'' کے نام سے کتابچے کی شکل میں چھپا تھا اور ۱۹۱۰ء میں ماہنامہ القاسم دیوبند میں بھی شائع ہوا تھا۔ زیر نظر نظم کا ترجمہ بھی مفتی اعظم مرحوم کے قلم کا یادگار ہے۔ رسالے میں یہ ترجمہ بین الاشعار تھا یہاں الگ کر دیا ہے۔ نظم اور اس کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیے۔ رسالے میں اس نظم کے عنوان میں جو مضمون درج ہے۔ اسے بعینہٖ درج کیا جاتا ہے:

''حضرت مولانا کے ایک خادم نے اپنے درد دل کا اس طرح اظہار کیا ہے''

أَلَا يَا مَالْتَا! طوبىٰ وَ بُشْرىٰ (۱) ثَوىٰ بِكِ مَنْ مَحَا آثَارَ كُفْرٍ
وَ لَمْ تَكُ قَبْلَهٗ اِلاَّ خَرَاباً (۲) خَمُوْلاً غَيْرَ مَعْرُوْفٍ بِخَيْرٍ
فَلَمَّا حَلَّهَا عَادَتْ رِيَاضاً (۳) مُنَضَّرَةً مِنَ التَّقْوىٰ وَذِكْرٍ
مُكَلَّلَةً بِاَزْهَارِ الْمَزَايَا (۴) وَاَزْهَارُ الْمَزَايَا خَيْرُ زَهْرٍ
أَلَا يَا مَالْتَا! كُوْنِىْ سَلَاماً (۵) عَلٰى مَحْمُوْدِنَا الرَّاضِىْ بِقَدْرٍ
إِمَامُ الْخَلْقِ قُدْوَتُهُمْ جَمِيْعاً (۶) لَهٗ كَرَمٌ اِلَى الْاٰفَاقِ يَسْرِىْ
جُنَيْدُ الْعَصْرِ سِرِّىُّ الزَّمَانِ (۷) غُيُوْثُ فُيُوْضِهٖ تَهْمِىْ وَ تَجْرِىْ
فَرِيْدٌ فِىْ خَلَائِقِهٖ الْعِذَابِ (۸) وَحِيْدٌ فِى التُّقىٰ مِنْ غَيْرِ فَخْرٍ
اَشَدُّ النَّاسِ اَمْثَلُهُمْ بَلَاءً (۹) فَيَا شَمْسَ الْهُدىٰ يَا طَوْدَ صَبْرٍ

ذَکَرْنَا یُوْسُفَ الصِّدِّیْقَ لَمَّا (۱۰) اُسِرْتَ بِغَیْرِاِسْتِحْقَاقِ اَسْرٍ
لِحَرِّ الْبَیْنِ فِیْ صَدرِالْکَئِیْبِ (۱۱) تَفِیْضُ دُمُوْعُهٗ حُمْراً کَجَمْرٍ
سَیُنْزِلُكَ الْعَزِیْزُ مَحَلَّ عِزٍّ (۱۲) وَیَنْصُرَكَ النَّصِیْرُاَعَزَّ نَصْرٍ
سَیَکْفِیْكَ الْاِلٰهُ فَاَنْتَ مَرْءٌ
کَفَاكَ اللّٰهُ قِدْماً کُلَّ شَرٍّ

ترجمہ:

(۱)- ہاں! اے مالٹا! تجھے مبارک باد اور خوش خبری ہو! کیوں کہ تیرے اندر وہ بزرگ مقیم ہے، جس نے کفر کے نشان مٹادیئے!

(۲)- اس سے پہلے (مالٹا) ایک ویرانہ اور گم نام مقام تھا، جس کی کوئی خوبی معروف و مشہور نہ تھی۔

(۳)- جب اس نفس مقدسہ نے اس میں نزول فرمایا تو وہ ذکر اللہ اور تقویت کا سرسبز باغ بن گیا۔

(۴)- ایسا باغ جس میں تمام اوصاف حمیدہ کے پھول کھلے ہیں اور در حقیقت فضائل کے پھول بہترین پھول ہیں۔

(۵)- ہاں! اے مالٹا! تو ہمارے مقتدا مولانا محمود حسن پر جو خدا کے حکم پر سر تسلیم خم کیے ہوئے ہیں مجسم سلامتی بن جا!

(۶)- حضرت مولانا کل مخلوق کے امام اور پیشوا ہیں۔ ان کا صیت کرم دنیا کے کناروں تک پہنچا ہوا ہے۔

(۷)- اس زمانے کے جنید اور سری سقطی آپ ہی ہیں۔ آپ کے فیوض کی بارشیں برستی اور بہتی ہیں۔

(۸)- اپنی شیریں عادات میں منفرد اور تقویٰ اور پرہیز گاری میں یکتائے زمانہ ہیں۔

(۹)- جو شخص مخلوق میں برگزیدہ ہوتا ہے۔ اس پر مصائب بھی سخت ہوتے ہیں، تو اے ہدایت کے آفتاب اور صبر کے پہاڑ۔

(۱۰)- ہمیں حضرت یوسف علیہ السلام یاد آگئے جب کہ آپ کو بغیر اظہار کسی جرم کے قید کرلیا گیا۔

(۱۱)- اس غم فراق کی گرمی سے جو ایک محب غم گین کے سینے میں جاگزیں ہے، اس کے آنسو انگاروں کے مانند سرخ بہتے ہیں۔

(۱۲)- عن قریب خدائے عزیز آپ کو مقام عزت میں جگہ دے گا اور خدائے نصیر آپ کی قوی مدد فرمائے گا۔

(۱۳)- اور عن قریب خدائے تعالیٰ کی مدد آپ کو کافی ہو گی۔ کیونکہ آپ وہ شخص ہیں جسے خدا نے ہمیشہ ہر قسم کے شر سے بچایا ہے۔

حضرت شیخ الہند سے متعلق مفتی اعظم کی ایک اردو نظم بھی یادگار ہے جو انھوں نے حضرت شیخ الہند کی اسارت مالٹا سے رہائی کے بعد وطن واپسی (۱۹۲۰ء) کے موقع پر خیر مقدم میں کہی تھی۔ اس کا ذکر حضرت مفتی صاحب کے اردو کلام کے ضمن میں آئے گا۔

(۳)- حضرت مفتی اعظم کا ایک عربی قصیدہ ۱۹۳۳ء کی یادگار ہے۔ جب وہ ملتان سنٹرل جیل میں قید تھے۔ جیل کے سپرنٹنڈنٹ ایک صاحب میجر فضل الدین نہایت فاضل، عربی زبان سے خوب واقف اور ادب کے ذوق آشنا اور کسی شریف خاندان کے فرد تھے۔ اسی زمانے میں بقرہ عید آئی۔ مفتی صاحب نے عید کی تہنیت میں ایک قصیدہ ان کی خدمت میں پیش کیا تھا، لیکن درحقیقت حکومت سے بغاوت کی دعوت تھی، جو انھیں دی گئی تھی۔ مفتی اعظم کے آزادی سے عشق اور حریت فکر اور پختگی سیرت کی بہت بڑی مثال ہے۔ اس وقت چوں کہ جیل میں تھے اور جیل کے ایک آفیسر کو حکومت کے خلاف ورغلایا گیا تھا، اس لیے ان کا جرم بہت سنگین تھا۔ اگر میجر صاحب کیریکٹر کے کمزور اور خود غرض آفیسر ہوتے اور حکومت کے سامنے اس راز کو افشا کر دیتے تو مفتی صاحب کو پنجاب و بلوچستان کی کسی ایسی جیل میں منتقل کر دیا جاتا جو سختی اور اپنی خراب تعمیر کے لیے مشہور تھیں، ان پر تشدد کا عمل کیا جا سکتا تھا، قید تنہائی کے عذاب میں مبتلا کر دیئے جاتے، ان پر بغاوت کا مقدمہ چلا کر مزید سزا بھی دی جا سکتی تھی۔

اس تہنیت کی تاریخی اور مطالب کی سیاسی اہمیت کے پیش نظر ہم اشعار کا ترجمہ یہاں پیش کرتے ہیں۔ اس کے مترجم مولانا نسیم احمد فریدی امروہوی ہیں۔ یہ تہنیت پچیس اشعار پر مشتمل تھی لیکن فریدی صاحب نے ابتدا کے گیارہ اشعار جو عید کی مبارک باد میں تھے، چھوڑ کر بقیہ چودہ اشعار اور ان کا ترجمہ پیش کیا ہے۔ اگرچہ ہماری خاص دلچسپی انھیں اشعار سے ہے لیکن کیا اچھا ہوتا کہ یہ شاہ کار تہنیت اور دعوتِ بغاوت مکمل ہمارے سامنے ہوتی۔ یہ

ہر حال ہم انھیں اشعار کا ترجمہ پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں جن کا تعلق حضرت مفتی اعظم کی سیرت کے سیاسی پہلو سے ہے۔

بنیادی طور پر یہ ترجمہ مولانا فریدی صاحب کا ہے۔ البتہ اصلاح و تہذیب کے نقطہ نظر سے بعض معمولی تبدیلیاں عمل میں آئی ہیں۔ آغاز کے گیارہ اشعار چھوڑ کر بقیہ چودہ اشعار کا ترجمہ یہ ہے:

۱- اگر عید ایسی حالت میں آئے کہ انسان اپنے گھر میں ہو اور اہل و عیال کی صحبت اور معیت حاصل ہو تو اس کا لطف نہایت خوشگوار اور پر مسرت ہوتا ہے۔

۲- اور اگر عید اس حالت میں آئے کہ اہل و عیال سے دور کسی قید خانے میں محبوس و مقید ہو تو عید اس کے رنج میں صرف اضافے اضافے ہی کا موجب ہوتی ہے۔

۳- ایک شخص جو آزاد فضا میں اپنے بیوی بچوں میں زندگی بسر کر رہا ہو اور دوسرا شخص جو قید خانے میں زندگی کے شب و روز گن گن کر گزار رہا ہو ــ دونوں میں بہت فرق ہوتا ہے!

۴- وہ شخص جو اپنے ذوق و پسند کے مطابق زندگی گزارتا ہے اور ہر وہ چیز جو چاہتا ہے اسے حاصل کر لیتا ہے اور وہ شخص جو محرومی کی زندگی بسر کرتا ہے اور فراق کی آگ میں جل رہا ہے، دونوں برابر نہیں ہو سکتے!

۵- ہم تلواروں سے کھیلنے والی اور خون میں نہانے والی قوم ہیں۔ اگر ہماری حسین دل ربا اور غزالہ صفت بیویاں بھی حالات سے مطابقت اور وقت سے مداہنت کرنے کا مشورہ دیتی ہیں تو ہم ان سے فوراً کنارہ کشی کر لیتے ہیں۔

۶- ہم شریف و نجیب ہیں اور زمانہ گواہ ہے کہ داد و دہش کے وقت ہمارے دل میں بخل کا خیال تک نہیں آتا۔ ہم وہ شیر مرد ہیں جو جنگ کے وقت شر و فساد کا خاتمہ کر دیتے ہیں۔

۷- ہم آزادی کے شیر ہیں اور غلامی کی ذلیل زندگی قبول کرنے سے ہم نے انکار کر دیا ہے۔ ہمارے لیے اس سے زیادہ ذلت و عار کی کوئی بات نہیں ہو سکتی کہ غلامی کی زندگی پر رضامند ہو جائیں!

۸- وطن سے محبت اور حریت پرستی کے سوا ہمارا کوئی جرم نہیں۔ حال آں کہ ہمیں

گرفتار کرلیااور اذیت میں مبتلا کردیا گیا۔ ہمارا قصور اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہم سرزمین وطن کو دشمن سے پاک کردینا چاہتے ہیں۔

۹- ظالم دشمن نے آزادی وطن اور اسکے دفاع کو جرم قرار دیا ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ عین نیکی اور عزت کا کام ہے۔

۱۰- اہل زمانہ نے ہمارے حق آزادی وطن میں خیانت کی اور ہم پر ظلم ڈھایا ہے (اے فضل الدین!) اگر تم پر حقیقت واضح ہوگئی ہے تو تم اس خائن حریت وطن کے مددگار کیوں بنے ہوئے ہو۔

۱۱- تم کریم ابن کریم ہو، تم ایک غیرت مند شخص اور محب وطن ہو۔ یہ بات تمہاری شان کے خلاف ہے کہ ظلم وتعدی کے معین ومددگار بنو۔

۱۲- ہم احرار وطن ہیں، قید ہمارے لیے موجب شرف ہے اور اخلاقی مجرم کے لیے قید باعث ننگ وعار ہوتی ہے۔

۱۳- مظلوم کے لیے جیل ایک عطیۂ ربانی ہے، وہ اسے اپنے منتخب اور خاص بندوں ہی کو عطا کرتا ہے۔

۱۴- اے ہمارے رب! ہمیں مشکلات میں ثابت قدم رکھ اور آزمائشوں میں صبر نصیب فرما! دشمنوں کے مقابلے میں ہماری مدد فرما! اور اُن سے انتقام لے!

(مفتی اعظم کی یاد، ص۲۶-۱۶۵)

ایک ضمنی بحث:

حضرت مفتی اعظم نے میجر فضل الدین کو جو عید کی تہنیت پیش کی تھی، اس کے خطرناک نتائج سے مفتی صاحب تو بچ گئے، لیکن میجر صاحب کو اپنے اخلاص، وطن دوستی، اور حریت فکر کی قیمت چکانی پڑی۔ مرحوم عزیز الرحمٰن جامعی نے اپنے بیان میں میجر مرحوم کی سیرت پر جو روشنی ڈالی ہے اور اپنے والد گرامی مرتبت رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کی قلمی یادداشتوں سے جو اقتباس پیش کیا ہے، اس سے جو حالات سامنے آتے ہیں، وہ نہایت الم انگیز ہیں۔ اگرچہ زیر نظر مضمون سے اس کا تعلق محض ضمنی ہے لیکن اس مطالعے میں ہم اپنے قارئین کو شریک کرلینا چاہتے ہیں۔ عزیز الرحمٰن جامعی مرحوم لکھتے ہیں:

رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانوی جیل میں مفتی کفایت اللہ صاحب اور اپنے دوسرے ساتھیوں کی شب و روز خدمت کرتے اور ہر قیدی کی ضرورتوں کے راز دار تھے۔ کس ساتھی کو کس وقت کس چیز کی ضرورت ہوتی ہے۔ انہیں اس کا علم رہتا۔ رئیس الاحرار کے فہم و تدبر نے جیل کے افسروں کو اپنے ساتھیوں کا خادم بنادیا۔ میجر فضل الدین صاحب جیل کے سپرنٹنڈنٹ تھے وہ بہت سی زبانیں جانتے ہی تھے لیکن انگریزی فرانسیسی اور جرمنی کے علاوہ فارسی اور عربی اس طرح بولتے تھے۔ جیسے ان کی مادری زبان ہے۔ حکومت انگریزی نے انہیں بغاوت عرب میں لارنس کے ساتھ کام سپرد کیا تھا۔ جب دوسری دفعہ انہیں امان اللہ خاں کے خلاف کام کرنے کے لیے کہا گیا۔ تو انہوں نے انکار کر دیا کہ مسلمان ممالک کی تباہی میں اب میں امداد نہیں دے سکتا۔ اس کی انہیں یہ سزا دی گئی کہ بجائے بڑے عہدے کے انہیں ملتان جیل کا سپرنٹنڈنٹ بنا دیا گیا۔ اپنی دانست میں تو حکومت انگریز نے سزا دی تھی لیکن وہ آگئے ایسی جگہ پر جہاں انہیں ایسے صاحب علم، صاحب فکر و نظر جلیل القدر سیاسی رہنماؤں سے واسطہ پڑا۔ جن کی ہمعصری سے میجر صاحب کے دل و دماغ کو سکون حاصل ہوا، میجر صاحب حضرت مفتی صاحب قبلہ اور دوسرے اہل علم لوگوں سے فارسی عربی میں گھنٹوں آکر باتیں کرتے تھے۔ انہوں نے انگریزی سیاسی سازشوں اور چالبازیوں کی تمام حکائتیں حضرت مفتی صاحب قبلہ سے بیان کر دیں۔ میجر صاحب وسوہا کے رہنے والے تھے۔ رئیس الاحرار سے ان کی بڑی رازداری تھی۔ رئیس الاحرار اپنی خودنوشت یادداشتوں میں لکھتے ہیں:

میجر فضل الدین نہایت شریف الطبع اور صاحب علم تھے۔ حکومت انگریزی کے ساتھ انہوں نے ایک حد تک کام کیا۔ لیکن جب ان کی غیرت اسلامی اور خودداری نے انگریزی سیاست کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا تو انہیں سزا کے طور پر جیل کا سپرنٹنڈنٹ بنادیا گیا۔ انگریزی حکومت کو ان سے ہر وقت یہ خوف رہتا تھا کہ وہ انگریزی حکومت کے رازہائے درون پردہ

کو فاش نہ کر دیں۔ اس لیے میر ایقین ہے کہ انہیں معمولی سے بخار میں انگریزی حکومت نے کچھ ایسا انجکشن دلوایا کہ ان کی فوری موت واقع ہو گئی۔ اس طرح انگریزی حکومت نے اپنے ایک راز دار کو ہمیشہ کے لیے خاموش کر دیا۔ مجھے ان کی موت سے سخت صدمہ پہنچا۔ اگر وہ زندہ رہتے تو انگریزی سیاست کے ایسے رازوں سے پردہ اٹھادیتے جو آج تک نہ کسی کے علم میں ہیں اور نہ کسی کے علم میں آئیں گے۔ انگریزی حکومت کے انتقام کی یہ ایسی مثال ہے جس کی حقیقت آج تک لوگوں کی زبان پر نہ آئی۔ حقیقت یہ ہے کہ انگریزی حکومت کو یہ شبہ ہو گیا تھا کہ میجر صاحب کی ملتان جیل میں علماء سے ملاقاتیں اور ان سے عربی میں بات چیت حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب سے عربی میں خط و کتابت حکومت انگریز کے مفاد کے خلاف تھیں۔"

(۴)۔ جس زمانے میں مفتی صاحب جیل میں تھے، مولانا اعزاز علی کے ایک خط کے جواب میں چند شعر تحریر فرمائے تھے، ان میں سے ایک شعر مولانا نے اپنے مضمون میں نقل کیا تھا۔

نسیتم اخاً اذ خانه الدهر لم یکن
بعرضة نسیان و کان مصافیاً

(مفتی اعظم کی یاد، ص ۱۱۴)

مفتی صاحب کی وفات کے بعد مولانا نے ان اشعار کو اور بعض دوسری تحریروں کو تلاش کیا تو ان کے ہاتھ نہیں آئی تھیں (ایضاً، ص ۱۱۵) خدا کرے وہ ضائع نہ ہو گئی ہوں، محفوظ ہوں اور کاش! وہ کسی وقت علمی و ادبی دنیا کے سامنے آجائیں۔

۲- فارسی کلام:

فارسی میں ان کا بہت تھوڑا کلام ہے اور وہ بھی کسی کے سامنے نہ تھا۔ اسی لیے شاید کسی نے اس کے بارے میں کوئی رائے نہ دی۔

۱- فارسی کلام میں مولانا احمد بدات راندیری کے انتقال پر قطعہ تاریخ وفات (۱۳۳۳ھ / ۱۹۱۵ء) ہے۔

حافظ احمد بدات متقی — آں کہ در دنیا برائے ورع زاد
عمر خود در راہِ مولیٰ صرف کرد — عیش دنیا بہر دیں برباد داد!

داعی حق را بدل لبیک گفت حاصلِ حق گشت وفائز بالمراد
بہر تاریخش چو کردم اعتنا گفت ہاتف در دلم مغفور باد"
۱۳۳۳ھ

(القاسم، نوشہرہ (سرحد)، مولانا مفتی کفایت اللہ نمبر، ۲۰۰۰ء، ص ۱۱۷)

(۲)- مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کے نام کے سجع میں ایک شعر
خدمت خلق بود خُلق حبیب الرحمٰن

(ایضاً، ص ۱۱۵)

یہی سجع مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کی رہائی کے موقع پر نظم تہنیت کا عنوان بھی ہے۔ نظم کا ذکر اردو کلام کے ذکر میں آرہا ہے۔

۳- ۱۹۲۰ء میں اسارت مالٹا سے حضرت شیخ الہند کی وطن واپسی پر مُفتی صاحب نے بتیس اشعار کی جو خیر مقدمی نظم کہی تھی۔اس میں دو شعر فارسی میں ہیں۔ پہلا اور پانچواں شعر پہلا شعر ہے:

قدوۂ اہل یقین وزبدۂ اربابِ دیں پیشوائے سالکین ومقتدائے عارفیں

اور پانچواں شعر یہ ہے:

مایۂ صد ناز اہل ہند فخر مومناں فخر جاں بازارانِ ملت فخر خیل صادقیں

مجھے یقین ہے کہ یہ دو شعر انھوں نے فارسی میں کہنا نہیں چاہے ہوں گے۔ بلکہ حضرت کے محامد کے بیان میں جو تراکیب استعمال کی گئی تھیں، ان کے ربط وبیان کے لیے عطف واضافت میں بھی اردو حروف کی ضرورت نہ پڑی۔ اس لیے ہمیں ان اشعار کو بھی اردو ہی سمجھنا چاہیے۔

درحقیقت صرف چار اشعار کا ایک قطعہ تاریخ وفات فارسی شاعری میں مفتی صاحب کا کل سرمایہ ہے۔اس کی بنیاد پر ان کی شاعرانہ مقام کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ البتہ یہ بات سوچی جاسکتی ہے جو شاعر عربی میں قادرالکلام اور اردو میں پختہ فن کار ہو، وہ فارسی زبان وادب کا فاضل ہو کر بھی فارسی شاعری میں معمولی درجے پر کیوں کر رہ سکتا ہے؟

(۳)-اردو کلام:

حالات وسوانح کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ حضرت مفتی صاحب کا اردو کلام اگر عدم توجہ کی نذر نہ ہو جاتا تو کم از کم ایک مختصر مجموعۂ کلام کی حد تک ضرور پہنچ جاتا۔ لیکن مفتی صاحب نے توجہ نہیں فرمائی اور کسی اور کو بھی خیال نہیں آیا کہ حضرت کے ارادت مندوں، حالات وسوانح کے مولفین، تذکرہ نگاروں اور تحقیق کا ذوق رکھنے والوں کو کبھی اس کی ضرورت بھی پیش آئے گی۔ بہ ایں وجہ ان کے ساتھ ایک ناانصافی یہ ہوئی کہ وہ ادبی تاریخ میں جگہ نہ پاسکے۔ حال آں کہ ان سے چھوٹے شاعر ہیں جن کا تذکرہ "تاریخ شاہ جہاں پور" اور "سخن ورانِ شاہ جہاں پور" (تذکرہ مرتبہ مبارک شمیم) میں موجود ہیں۔ مثلاً حوالدار عبدالغفار خاں جوہر جو بہ یک واسطہ شوخی رام پوری حضرت غالب کے شاگرد اور صاحبِ دیوان شاعر تھے اور مولوی عبدالہادی خاں قیس شاہ جہاں پوری اول الذکر کا دونوں مآخذ میں اور ثانی الذکر کا دوسرے ماخذ میں نام تک موجود نہیں۔ حال آں کہ وہ بعض دوسرے شعرا کے مقابلے میں اس کے کہیں زیادہ مستحق تھے کہ تاریخ وتذکرہ میں ان کا ذکر کیا جائے!

مختلف مآخذ میں مفتی صاحب کے کلام کی نشان دہی کی گئی ہے۔ ملتان جیل کی یادداشتوں اور مضامین میں بھی ذکر آیا ہے کہ جیل میں منعقد ہونے والے مشاعروں میں اگرچہ آپ شریک ہوتے تھے، لیکن آپ کا کلام مولانا احمد سعید دہلوی مشاعرے میں پڑھ کر سناتے تھے۔ اور مشاعرے میں شرکت کے بعض شائقین کو بھی لکھ کر دے دیا کرتے تھے اور وہ اپنے نام سے مشاعرے میں پڑھتے تھے۔ لیکن ملتان جیل کے مشاعروں میں سنائے جانے والے کلام میں سے ایک کلام بھی ہمیں دستیاب نہیں۔

اردو میں دستیاب ہونے والا کلام صرف پانچ منظومات تک محدود ہے:

۱- حضرت شیخ الہند کی اسارت مالٹا سے رہائی اور وطن واپسی پر "قصیدہ خیر مقدم" کے طور پر ۱۹۲۰ء کی یادگار ہے۔ یہ قصیدہ ۳۲ /اشعار پر مشتمل ہے۔

۲- دوسری نظم ملتان سنٹرل جیل سے حضرت امیر شریعت مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی رہائی کی خوشی میں ہے۔ یہ نظم ۱۴/ جنوری ۱۹۳۳ء کو ان کی رہائی کے موقع پر کہی گئی تھی۔ اس میں صرف آٹھ شعر ہیں۔

۳- ملتان سنٹرل جیل میں مفتی صاحب نے مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کی شان میں ایک

قصیدہ لکھا تھا۔ قاری محمد طیب مرحوم لکھتے ہیں:

"مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کی ملتان جیل سے رہائی کے وقت اردو کا ایک قصیدہ لکھ کر انھیں ایک جلسے میں سنوایا جو جیل ہی میں منعقد کیا گیا تھا۔ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب ممدوح کے نام کا ایک نہایت ہی موزوں سجع بھی حضرت مفتی صاحب نے خود ہی موزوں فرمایا تھا"۔ (مفتی اعظم کی یاد، ص ۱۲۸)

حضرت مفتی صاحب نے ۱۸/ فروری ۱۹۳۳ء کو ملتان جیل میں مولانا لدھیانوی کی رہائی کے سلسلے میں ایک الوداعی جلسے میں خود پیش کی تھی۔ مولوی عزیز الرحمٰن جامعی لکھتے ہیں:

"رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی ۲۰/ فروری ۱۹۳۳ء مطابق ۲۴/ شوال ۱۳۵۱ھ کو اپنی مدت قید ختم کر کے ملتان سنٹرل جیل سے رہا ہوئے۔ رہائی سے دو دن قبل جیل کے تمام ساتھیوں کے ایک مجمع میں... (ایک) نظم حضرت مفتی کفایت اللہ رحمت اللہ علیہ نے سنائی اور خود اپنے ہاتھ سے کتابت کر کے رئیس الاحرار کو پیش کی"۔

اس نظم کی خوبی کے بارے میں جامعی مرحوم لکھتے ہیں:

"یہ نظم رئیس الاحرار کی تمام زندگی، اخلاق و عادات، فکر و تدبر، جرأت و دلیری، تحمل و بردباری، بڑے چھوٹوں کی عزت و تکریم، انکساری و عاجزی، غرض کہ اس نظم میں تمام اوصاف زندگی کا بیان ہے"۔

(رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی اور ہندوستان کی جنگ آزادی: مولفہ عزیز الرحمٰن جامعی لدھیانوی، دہلی، ۱۹۶۱ء، ص ۱۶۵)

قاری محمد طیب مرحوم نے اوپر کی سطروں میں مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کی شان میں جس قصیدے کا ذکر کیا ہے، وہ فنی طور پر قصیدہ نہیں ایک عمدہ طویل نظم ہے، جس میں مولانا کی رہائی پر تہنیت پیش کی گئی ہے۔ اس میں مولانا کی سیرت اور اخلاق حمیدہ اور شخصیت کے محاسن کی تصویر کشی کی ہے۔ بیالیس اشعار کی یہ نظم مثنوی کی بحر میں ہے، قافیے کی پابندی کی گئی ہے۔ دہلی کی کوثر و تسنیم میں دُھلی صاف و شستہ زبان، سادہ دل کش اسلوب اور بیان میں روانی و لطافت ہے۔ کوئی لفظ مشکل ہے، نہ کوئی جملہ پیچیدہ اور نہ کوئی ترکیب نامانوس

ہے۔ اس کے مطالب فہم کے لیے آسان اور اشعار سہل ممتنع کی مثال ہیں۔
۴- مولانا احمد سعید دہلوی کی ملتان جیل سے رہائی کے موقع پر چھبیس اشعار کی ایک نظم مثنوی کی بحر میں یادگار ہے۔ مولانا احمد سعید کی رہائی مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کی رہائی کے ٹھیک ایک ماہ بعد عمل میں آئی۔ مولانا دہلوی کی رہائی کی تہنیت میں مفتی صاحب نے جو نظم لکھی تھی اس پر انھوں نے اپنا نام، تاریخ اور جیل کا پتا بھی اپنے قلم سے تحریر فرمایا تھا۔ جو اس طرح ہے:

"محمد کفایت اللہ عفاعنہ مولاہ، اسیر سیاسی اے کلاس۔ نیو سنٹرل جیل، ملتان
بارک نمبر ۱۱، کمرہ نمبر ۴۔ مورخہ ۱۱/ مارچ ۱۹۳۳ء مطابق ۱۴/ ذی قعدہ ۱۳۵۱ھ"۔

یہ نظم اپنی زبان کی سادگی، اسلوب بیان کی طرفگی، خیالات کی دل نشینی، نیز مولانا احمد سعید دہلوی کے علم و فضل، ان کی شخصیت اور سیرت کے محاسن، اخلاق حمیدہ، ان کی خطابت اور مجلس آرائی کی خصوصیات کا آئینہ ہے۔ نظم سے اُس تعلق خاطر اور کمال شفقت و محبت کا پتا بھی چلتا ہے جو حضرت مفتی صاحب کو مولانا دہلوی سے تھی۔
(۵)- حضرت مفتی صاحب کے اردو کلام میں ملتان جیل کے یادگار کلام میں ایک اردو غزل بھی ہے۔ اس کی اہمیت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ یہ ان کی غزل گوئی کا واحد نمونہ ہے۔ اب تک ان کے کلام میں جو کچھ دستیاب ہوا ہے، اس میں ان کی یہ پہلی اور آخری غزل ہے۔ ان کی تعلیمی زندگی کے ابتدائی، ثانوی اور اعلیٰ ادوار شاہجہاں پور، مراد آباد اور دیوبند میں گزرے تھے۔ شاہ جہاں پور دہلی کے مقابلے میں لکھنؤ سے قریب ہے۔ لیکن اس کی زبان لکھنؤ سے زیادہ دہلی کے لسانی اور ادبی اسکول سے زیادہ متاثر ہے۔ بلکہ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ دہلی اور لکھنؤ کا وسطی علاقہ جو روہیل کھنڈ کہلاتا ہے، وہ اپنی تاریخ، تہذیب، روایات، زبان اور ادب سب میں اپنے گردو پیش سے الگ اپنی خصوصیات رکھتا ہے۔ روہیل کھنڈ زبان و ادب کی خصوصیات کا مجمع البحرین ہے۔ یہاں دو ادبی اسکولوں کے دھارے ساتھ ساتھ بہتے ہیں اور دونوں اپنی اپنی خصوصیات چھوڑ کر الگ الگ ہو جاتے ہیں۔ اس علاقے نے دونوں ادبی اسکولوں سے فیض اٹھایا ہے اور اس کی اپنی خصوصیات کا ایک سانچا تیار ہو گیا ہے۔ یہاں کے لٹریچر میں دونوں کے خصوصیات تلاش کر لیے جاسکتے ہیں۔

روہیل کھنڈ ــــ اودھ اور دہلی کی دو تہذیبوں اور دو ادبی سماجوں کا اعراف تھا اور یہ اعراف نہ صرف ایک مفتی اعظم کی شخصیت کا بلکہ متعدد علمی، ادبی، تاریخی، سیاسی، محب قوم و

وطن، مجاہدین آزادی، شہدائے حریت اور جاں نثارانِ قوم کا مسکن اور وطن رہا ہے، جو اودھ اور پایۂ تخت شاہ جہاں آباد کی علمی، ادبی، تاریخی فضاؤں کے باسیوں کے لیے بھی قابل رشک تھیں۔ اپنے اس منفرد ذوق اور ادبی سیرت کے بعد جو شاعر ادیب ان ادبی مراکز سے اپنے مطالعے یا علمی صحبتوں کے واسطے سے جتنا قریب ہو جاتا ہے۔ اس پر اسی ماحول کا رنگ اتنا ہی گہرا ہو جاتا ہے۔ حضرت مفتی صاحب اپنی تحصیل علمی کی زندگی کے بعد چوں کہ دہلی منتقل ہو گئے تھے اور پوری نصف صدی کی علمی اور عملی زندگی ـــ اپنے مطالعہ و تحریر اور اکابر وقت کی صحبتوں کے حوالے سے دہلی کی علمی و ادبی فضا میں گزاری تھی، اس لیے ان کے لسانی اور ادبی ذوق نے وہی رنگ اختیار کر لیا تھا اور نہ صرف رنگ اختیار کر لیا تھا بلکہ تحریر و کتابت کی پچاس سالہ ریاضت نے اس رنگ کو چوکھا بنا دیا تھا۔

ان کی زبان آسان، بیان سادہ، تحریر و انداز نگارش رواں اور دل کش، معانی کی کثرت، حشو وزواید سے پاک، فصاحت سے معمور، پُر اثر، مدلل، علمی انداز بیان، ادبی اسلوبِ تحریر کی خصوصیات کا حامل، فہم کے لیے آسان، سادگی اور پرکاری کا نمونہ اور تہذیب و شرافت کا آئینہ ہے۔

حضرت مفتی صاحب کی یہ اکلوتی غزل اگرچہ غزل کی قدیم روایت سے الگ نہیں، لیکن زبان کی سادگی، بیان کے حسن اور اسلوبِ نگارش کی شگفتگی کی مثال ہے۔ غزل یہ ہے:

اب یہ دھمکی ہے مرے صیاد کی ۔۔۔ ذبح کردوں گا اگر فریاد کی!
جس سے وابستہ تھیں میری راحتیں ۔۔۔ جانتا تھا میں جسے قلب کی ؟
کھیل سمجھے، خوش ہوئے، پھیری چھری ۔۔۔ ان کے بچپن نے مری فریاد کی
دفن کے بعد آئے تربت پر مری ۔۔۔ قبر پر گویا بہشت آباد کی
جانتا ہوں کچھ نہیں حاصل مگر! ۔۔۔ پڑگئی عادت مجھے فریاد کی
لوح دل پر جب مری تصویر لی ۔۔۔ روح تڑپی مانی و بہزاد کی
شاخ طوبیٰ میں نہیں اس کی شبیہ ۔۔۔ کیا حقیقت سرو یا شمشاد کی

روئے انور ہی کو تیرے دیکھ کر
سورۂ والشمس میں نے یاد کی

(فرنگیوں کا جال: مولانا امداد صابری)

باب ہفتم

حضرت مفتی صاحب کے اخلاف

(۱)

اولاد

حضرت مفتی اعظم نے اپنے اخلافِ سعید و صالح اور اصحابِ علم و عمل میں مولانا حفیظ الرحمٰن اور مولوی خلیل الرحمٰن دو بیٹوں، سلمٰی، کنیز فاطمہ، دو بیٹیوں اور علم واخلاق سے آراستہ سیکڑوں تلامذہ کی ایک رفیع الشان جماعت کو یادگار چھوڑا ہے۔ حضرت مفتی صاحب نے ۱۸۹۷ء سے ۱۹۵۲ء تک تقریباً پچپن برس درس و تدریس کی زندگی گزاری تھی۔ اس لیے ان کے تلامذہ کی تعداد سیکڑوں سے متجاوز ہو تو تعجب نہ کرنا چاہیے۔ لیکن تحقیقی اعداد و شمار موجود نہیں۔ اس لیے کوئی حتمی تعداد نہیں بتائی جا سکتی۔ مولانا حفیظ الرحمٰن واصف نے اپنے ایک مضمون مطبوعہ البلاغ ممبئی (تعلیمی نمبر ۱۹۵۵ء) میں حضرت مفتی صاحب کے سترہ نامور تلامذہ کا مختصر تعارف کرایا ہے۔ لیکن اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ تعداد ایک سال کی اوسط تعداد سے بھی کم ہے۔ اگر کوئی محترم قاری مطمئین نہ ہوں تو وہ اسے اوسط سے کم کے بجائے اوسط سمجھ لیں۔ اولاد میں تو نظریہ اوسط کی ضرورت نہیں۔ انھوں نے اپنے پیچھے دو بیٹے اور دو بیٹیاں اپنے پس ماندگان میں چھوڑی تھیں۔ ان میں تو کوئی کمی بیشی ہوئی نہیں۔

۱- مولانا حفیظ الرحمٰن واصف: عالم دین، مدرس، مصنف، ادیب اور شاعر تھے۔ آخر میں مدرسہ امینیہ کے مہتمم ہو گئے تھے۔ حضرت مفتی اعظم کے خلف اکبر ۲۸ / محرم ۱۳۲۸ھ مطابق ۱۰ / فروری ۱۹۱۰ء کو شاہ جہاں پور میں پیدا ہوئے۔ مدرسہ امینیہ کے فارغ التحصیل تھے اور شاعری میں حضرت سائل دہلوی سے رشتہ تلمذ تھا۔ تصنیف و تالیف اور شعر و شاعری سے زندگی بھر تعلق رہا۔ ادب و لسانیات کا خاص ذوق تھا۔ اردو املا اور اس کے مسائل میں ان کی ایک تالیف یادگار ہے۔ ایک رسالہ جمعیت علمائے ہند کے بارے میں ہے۔ جس میں اس کی ابتدائی تاریخ اور قیام کے بارے میں بعض بیانات کی تصحیح کی گئی ہے۔ "مفتی اعظم کی یاد میں" ان کی ایک یادگار تالیف ہے۔ لیکن "کفایت المفتی" کے نام سے نو جلدوں میں حضرت مفتی

اعظم کے فتووں کی تدوین ان کا زندہ جاوید کارنامہ اور عظیم الشان دینی، علمی، سیاسی اور اصلاحی کارنامہ ہے۔

وہ نظم و غزل کے اچھے شاعر بھی تھے۔ ان کے کلام کا کوئی مجموعہ یا دیوان تو نظر سے نہیں گزرا۔ لیکن ان کی نظم و نثر کے بہترین نمونے ان کی تالیف ''مفتی اعظم کی یاد'' میں موجود ہیں۔

۱۲/رجب ۱۴۰۷ھ مطابق ۱۳/مارچ ۱۹۸۷ء کو دہلی میں انتقال ہوا۔ دہلی کے مشہور قبرستان ''مہندیان'' میں جہاں حضرت شاہ ولی اللہ محدث اور ان کے صاحب زادگان نیز حفیظ الرحمٰن سیوہاروی محو خواب ابدی ہیں۔ وہیں مولانا واصف مرحوم آسودہ خاک ہیں۔

مولانا حفیظ الرحمٰن واصف نے دو شادیاں کیں۔ اللہ تعالیٰ نے دونوں سے اولاد ذکور و اناث عطا فرمائی۔ پہلی بیوی سے ان کے چار بیٹے اور ایک بیٹی ہوئے:

۱- حمید الرحمٰن: مولانا واصف کی اولاد میں سب سے بڑے تھے۔ ان کا انتقال ہو گیا۔

۲- حبیب الرحمٰن: شادی شدہ ہیں۔ ایران میں تھے۔

۳- جمیل الرحمٰن دار العلوم دیوبند کے فارغ التحصیل اور ایم اے پاس تھے۔ سعودیہ میں تھے اِن کا بھی انتقال ہو گیا۔

۴- سکینہ خاتون: حالات کا علم نہیں ہو سکا۔

۵- انیس الرحمٰن: دار العلوم دیوبند کے فارغ التحصیل اور ایم اے کے ڈگری ہولڈر ہیں۔ نہرو یونیورسٹی میں پروفیسر تھے۔

پہلی بیوی کے انتقال کے بعد واصف صاحب نے دوسری شادی مولانا امین الدین (بانی مدرسہ امینیہ دہلی) کی ہمشیر میمونہ خاتون کی بیٹی نور جہاں سے کی تھی۔ ان بیوی سے محمود الرحمٰن اور ڈاکٹر محمد سالم، دو بیٹوں کا علم ہے۔ تفصیلات کا پتا نہیں۔

مولانا حفیظ الرحمٰن سے چھوٹے بھائی خلیل الرحمٰن اور دو بہنیں سلمیٰ اور کنیز فاطمہ تھیں۔ ان کا ذکر آگے آرہا ہے۔ حضرت مفتی صاحب کی ایک بیٹی زبیدہ خاتون نامی بھی تھیں، لیکن ان کا انتقال مفتی صاحب کی زندگی میں جب کہ ان کی عمر اٹھارہ برس کی تھی، ہو گیا تھا۔ اس وقت تک ان کی شادی نہیں ہوئی تھی۔

۲- سلمیٰ خاتون: یہ واصف صاحب کی بڑی بہن تھیں۔ ان کی شادی مولوی سمیع

اللہ کے ساتھ ہوئی تھی۔ مولوی صاحب دہلی کی مشہور مجلسی و تہذیبی اور بڑے سیاسی کارکن تھے۔ اُردو بازار۔ دہلی میں کتب خانۂ عزیزیہ کے نام سے ان کی مجلس آرائی، تہذیبی اور سماجی، سیاسی سرگرمیوں کا مرکز تھا۔ ۱۶/ اگست ۱۹۶۹ء کو انتقال ہوا اور دہلی ایک باغ و بہار شخص سے خالی ہوگئی اور مجلس علم و تہذیب ہمیشہ کے لیے اجڑ گئی۔ "دلی والے" میں ان پر ایک عمدہ مضمون شامل ہے۔

ان کے بیٹے مولوی عبدالسلام ہیں اور جامع مسجد دہلی کے علاقے میں "سلام ہوٹل" کے نام سے کاروبار کرتے ہیں۔ سلمٰی خاتون کی ایک بیٹی سلیمہ خاتون تھیں جو عربک کالج، دہلی کے پروفیسر عبدالسلام سے بیاہی گئی تھیں۔

۳- مولوی خلیل الرحمٰن: یہ حضرت مفتی اعظم کے دوسرے اور چھوٹے بیٹے تھے۔ ۱۹۱۸ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ مدرسہ امینیہ میں عربی اور اسلامیات کی تعلیم حاصل کی تھی اور سینٹ اسٹیفنس کالج، دہلی سے ۱۹۳۹ء میں بی اے پاس کیا تھا۔ ۱۹۴۳ء میں امرتسر کے ایک خاندان میں، جو ایک مدت سے دہلی میں آباد تھا۔ ان کی شادی ہوئی تھی۔

ہندوستان میں محکمہ سپلائی سے عملی زندگی کا آغاز کیا۔ ۱۹۴۷ء میں بہ زمانۂ ابتلائے دہلی وہ پاکستان آگئے تھے۔ ابتدا میں یہاں بھی وہ محکمۂ سپلائی میں تھے۔ بعد میں کیبنٹ سکریٹریٹ گورنمنٹ آف پاکستان میں ٹرانسفر ہوگیا تھا۔ ۱۹۷۲ء میں جب کہ ملازمت کے پانچ برس باقی تھے، ریٹائر ہوگئے۔

کراچی کے شمال ناظم آباد کے علاقے میں اپنی بیٹی جمیلہ خاتون کے ساتھ رہائش پذیر ہیں۔ گزشتہ برس (۲۰۰۲ء میں) ان کی خدمت میں حاضر ہوا تھا اور بعض معلومات ان سے حاصل کیے تھے۔ گوشہ نشین ہیں۔ دل کے مریض ہیں۔ بہت کمزور ہوگئے ہیں۔ حافظہ مستعد اور یادداشت اچھی ہے۔ لیکن ثقلِ سماعت انتہا کو پہنچ چکی ہے۔ کوئی آواز گوش گذار نہیں ہوتی۔ سلیٹ اور اس کی پنسل پاس رکھی ہے۔ آپ اس پر لکھ دیجیے۔ جملہ ختم ہونے سے پہلے وہ سمجھ جاتے ہیں اور صاف، واضح اور شافی جواب عنایت فرمادیتے ہیں۔

مولوی خلیل الرحمٰن کو اللہ نے ایک بیٹا فضل الرحمٰن اور ایک بیٹی جمیلہ خاتون عطا فرمائی ہے۔ صاحب زادے فضل الرحمٰن سول انجنیئر ہیں اور اپنی فیملی کے ساتھ کنیڈا میں مقیم ہیں۔ صاحب زادی جمیلہ خاتون، جن کے ساتھ وہ رہتے ہیں، ایک کالج میں پڑھاتی ہیں۔

نہایت سعادت مند اور باپ کی خدمت گذار ہیں۔ شادی نہیں کی۔ شاید باپ کی بیماری ضعیفی اور خاندان کے کسی خدمت گذار فرد کے نہ ہونے کا خیال اور خدمت کا جذبہ مانع ہوا ہو۔

۴۔ کنیز فاطمہ : ان کے شوہر ضیاء الاسلام صدیقی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں پروفیسر تھے۔ پاکستان آگئے تھے۔ این ای ڈی یونی ورسٹی کراچی میں استاد تھے۔ ۱۹۷۹ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کی اولاد میں ہاجرہ خاتون، محمد معین الاسلام، محمد امین الاسلام، محمد فصیح الاسلام، رابعہ خاتون، ثریا خاتون ہیں۔ محترمہ کنیز فاطمہ حیات ہیں۔

محمد فصیح الاسلام سے ایک سال قبل اپریل ۲۰۰۲ء میں ملاقات ہوئی تھی۔ یہ معلومات انہیں سے حاصل کیے تھے۔ ناظم آباد نمبر ا میں سب بھائی اور ان کی والدہ ایک ہی مکان میں رہائش پذیر ہیں۔

(۲)

تلامذہ

حضرت مفتی اعظم ہند کے تلامذہ کے بارے میں مولانا حفیظ الرحمٰن صاحب نے اپنے مضمون مشمولہ "مفتی اعظم کی یاد" میں لکھا ہے:

> "آپ کے ہزاروں شاگرد ہندوستان، پاکستان، برما، ملایا، جاوا، سماترا، عراق، حجاز، شام، افغانستان، ایران، بخارا، فتن، تبت، چین اور افریقہ تک پھیلے ہوئے ہیں"۔

اس بیان کی صحت میں کوئی شبہ نہیں۔ لیکن انھی سطروں کے ساتھ انہوں نے صرف تین تلامذہ کے نام مثالاً تحریر فرمائے ہیں۔ وہ نام مولانا حافظ اعزاز علی، مولانا سید مہدی حسن اور مولانا حافظ احمد سعید دہلوی کے ہیں۔ یہ تینوں نامور تلامذہ ان سترہ تلامذہ کی فہرست میں بھی شامل ہیں، جن کا مختصر تعارف واصف مرحوم نے البلاغ ممبئی کے تعلیمی نمبر میں کرایا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ فہرست نامور تلامذہ کی حد تک بھی مکمل نہیں۔ لیکن چوں کہ تلامذہ کی گنتی اور ان پر تحقیق ہمارا موضوع نہیں، صرف تصنیفی خاکے کی تکمیل کے لیے چند تلامذہ کا تذکرہ اور وہ بھی ایک خاص حد تک ہی ہمارا مقصد ہے اور اس کے لیے واصف

مرحوم کی کاوش سے استفادہ کفایت کرتا ہے۔

۱۔ مولوی محمد حسین راندیری: جامعہ حسینیہ راندیر کے بانی، جید عالم دین اور متقی وپاک باز بزرگ۔

۲۔ مولوی حکیم محمد ابراہیم راندیری مولوی محمد حسین کے برادر بزرگ، مشہور عالم دین، بھائی کے انتقال کے بعد مدرسے کے مہتمم ہوئے۔ ۱۳۷۳ھ (۵۴-۱۹۵۳ء) میں انتقال ہوا۔

۳۔ مولوی حافظ محمد یاسین سکندر آبادی رائے پوری: مشہور اور بلند پایہ عالم دین۔ مدرسہ اسلامیہ رائے پور کے بانی۔ جمعیت علمائے صوبہ سی پی کے صدر بھی رہے تھے۔ ۱۳۷۳ھ میں انتقال کیا۔

۴۔ مولوی عبدالعزیز جیندوی: مشرقی پنجاب کے مشہور عالم دین "درس گاہِ عزیزیہ۔جیند (ریاست جیند، مشرقی پنجاب) کے بانی مولوی صاحب کا انتقال ۱۹۴۷ء سے قبل ہو گیا تھا۔ ان کے صاحب زادے مولوی عبدالحلیم قمر نے کہ وہ بھی مدرسہ امینیہ کے فارغ التحصیل تھے۔ درس گاہ کے نظام کو سنبھالا۔ ۱۹۴۷ء کے خونیں انقلاب میں ان کا پورا خاندان شہید ہو گیا۔

۵۔ مولوی سید داؤد علی نصیر آبادی: علاقہ، اجمیر کے مشہور واعظ اور علاقے کی جمعیت علماء کے صدر تھے۔

۶۔ مولوی محمد شفیع ملتانی: مدرسہ قاسم العلوم کے بانی و مہتمم۔ علوم اسلامی کی اشاعت میں سرگرم، اسلامی تہذیب کا نمونہ، شرافت کا مجسمہ، حضرت مفتی اعظم کے عاشق صادق اور نہایت متواضع بزرگ تھے۔

۷۔ مولوی حافظ خدابخش مظفر گڑھی دہلوی: حدیث و تفسیر وفقہ کے فاضل مدرس، علوم وفنون کے ماہر، مدرسۂ امینیہ میں مدرس تھے۔ تقسیم ہند کے بعد پاکستان آگئے تھے اور یہاں کسی اسلامی مدرسے سے تعلق پیدا کر لیا تھا۔

۸۔ مولوی مفتی محمد صالح رنگونی: برما میں علوم اسلامی کے ناشر و مترجم اور دارالتبلیغ، رنگون کے بانی تھے۔

۹۔ مولوی مفتی محمد بن حافظ صالح راندیری: ممتاز عالم دین اور جامع مسجد رنگون کے

خطیب و مفتی تھے۔

۱۰- مولوی مفتی اسمٰعیل بن محمد بسم اللہ ڈابھیلی: علاقۂ گجرات کے مشہور مفتی اور مرجع خلائق عالم ہیں۔ جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کے مفتی تھے اور ایک عرصے تک جامعہ کے مہتمم بھی رہے تھے۔

۱۱- مولوی حکیم محمد قاسم سورتی: حاذق طبیب، جید عالم دین، علم پرور، اسلامی اخلاق کا مجسمہ اور صوبہ ممبئی کی مشہور شخصیت تھے۔

۱۲- مولوی حافظ عبدالرحیم صادق راندیری: گجراتی زبان میں قرآن حکیم اور اسلامی لٹریچر کے مترجم وناشر اور علاقۂ گجرات میں اسلامی تعلیمات کے فروغ واشاعت کی تحریک کی ایک اہم شخصیت تھے۔

۱۳- مولوی مفتی ضیاء الحق دہلوی: مدرسۂ امینیہ کے مدرس و مفتی تھے۔ خوش بیان واعظ عمدہ مقرر اور دارالافتاء جمعیت علمائے ہند کے صدر مفتی تھے۔

۱۴- مولانا حافظ محمد اعزاز علی امروہوی: عربی ادب، اسلامی فقہ اور افتاء میں عالم تبحر، دارالعلوم دیوبند میں ادب اور حدیث وفقہ کے مشہور استاد، صدر مفتی اور ناظم تعلیمات بھی رہے۔ بہت سی کتابوں کے مصنف "کتب خانہ اعزازیہ" کے بانی۔ "تذکرہ اعزازیہ" آپ کی سوانح عمری ہے۔ رجب ۱۳۷۴ھ (مارچ ۱۹۵۵ء) میں انتقال فرمایا۔

۱۵- مولانا مفتی سید مہدی حسن شاہ جہاں پوری: فقہ اور دیگر علوم اسلامی میں عالم بے بدل، ماہر مفتی، ایک عرصہ تک سورت میں اسلامی تعلیمات کی ترویج واشاعت میں سرگرم رہے۔ دارالافتاء دارالعلوم دیوبند میں صدر مفتی کے منصب پر فائز رہے۔ زہد و تقویٰ میں مثال اور صاف گوئی اور اظہار حق میں بے باک تھے۔ ۲۸/اپریل ۱۹۷۶ء کو شاہجہاں پور، وطن مالوف میں انتقال ہوا۔

۱۶- سحبان الہند مولانا احمد سعید دہلوی، حضرت مفتی اعظم کے شاگرد، دوست، مشیر، معتمد اور شریک کار بھی تھے۔ مشہور عالم و مفسر، شیریں بیان واعظ، فصیح اللسان مقرر، بیشمار کتب کے مولف، بیس برس تک جمعیت علمائے ہند کے سکریٹری رہے۔ ایک مدت تک نائب اور قائم مقام صدر اور حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی

کے انتقال (دسمبر ۱۹۵۷ء) کے بعد صدر کے عہدے پر فائز رہے۔ حضرت مفتی اعظم کے انتقال کے بعد مدرسہ امینیہ کے مہتمم ہوئے۔ ۴ر دسمبر ۱۹۵۹ء کو دہلی میں انتقال ہوا۔

۱۷- شیخ الحدیث مولانا مفتی محمد عبدالغنی (پٹیالوی) شاہجہاں پوری: اصلی وطن ڈسکہ (پٹیالہ) تھا۔ ایک علمی خاندان کے فرد تھے۔ ان کے دادا مولوی فتح محمد خاں عربی میں شاہ محمد اسحق کے اور فارسی میں امام بخش صہبائی کے شاگرد تھے۔ والد مولوی جمال الدین بھی عالم دین اور مدرسۂ امینیہ میں مدرس تھے۔ مولوی عبدالغنی نے مدرسۂ امینیہ میں پڑھا بھی اور پڑھایا بھی۔ حضرت مفتی اعظم نے مدرسہ عین العلم کا صدر مدرس بنا کر شاہ جہاں پور بھیج دیا۔ چالیس برس کے بعد مفتی صاحب نے انھیں دہلی بلا لیا تھا۔ مدرسۂ امینیہ کے شیخ الحدیث اور صدر مفتی ہوئے۔ علوم معقول و منقول میں بے مثال تبحر علمی اور کمالات کی جامعیت میں حضرت مفتی اعظم کے خصائص کا نمونہ تھے۔

یہ وہ حضرات تھے جنہیں مدرسۂ امینیہ کے طالب علم ہونے اور حضرت مفتی اعظم کے شاگرد ہونے کا شرف حاصل تھا۔ یہ کل سترہ حضرات ہیں لیکن نمبر چار پر مولوی عبدالعزیز کا ذکر ہے اور اس کے مطالعے سے معلوم ہوا کہ ان کے خلف رشید مولوی عبدالحلیم قمر بھی مدرسہ امینیہ کے پڑھے ہوئے تھے اس لیے وہ بھی گویا حضرت مفتی اعظم کے حلقہ تلمذ سے تعلق رکھتے تھے۔ اس طرح اٹھارہ حضرات کے نام ہمیں جناب واصف صاحب مرحوم کی کاوشِ قلم کے نتیجے میں معلوم ہو جاتے ہیں۔

مولانا حفیظ الرحمٰن:

اس سلسلے میں ایک اہم نام خود مولانا حفیظ الرحمٰن واصف کا ہے۔ انھوں نے اپنا نام محض تکلفاً نہیں لیا اس لیے مناسب نہیں سمجھا کہ وہ خود اس سلسلۂ تذکار کے جامع و مولف ہیں۔ لیکن ہمارے لیے یہ مناسب نہ ہوگا کہ ہم انھیں بھول جائیں۔ وہ بلاشبہ حضرت مفتی صاحب کے سعید و صالح بیٹے ہیں بلکہ لائق اور قابل فخر شاگرد بھی ہیں۔ ان کا تذکرہ چونکہ حضرت مفتی اعظم کی صلبی اولاد کے زمرے میں کیا جا چکا ہے۔ اس لیے یہاں نظر انداز کیا جاتا ہے۔

مولانا محمد عبد الہادی خاں:

البتہ میں اس فہرست میں مولانا محمد عبد الہادی خاں شاہ جہاں پوری ابن عبد الغفار خاں رسالدار کے نام کا ضرور اضافہ کرنا چاہوں گا۔ معلوم نہیں واصف صاحب کے ذہن نے یہ نام کیسے فراموش کر دیا اور قلم سے اُن موصوف و مرحوم کا تذکرہ کیوں کر چھوٹ گیا۔ یہ بزرگ مدرسہ امینیہ میں بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں شاگرد رہے ہوں گے۔ انھوں نے مدرسہ امینیہ سے فراغت حاصل کی اور مفتی صاحب ہی کی نگرانی میں دہلی میں عملی زندگی کا آغاز کیا۔ اینگلو عربک اسکول میں ٹیچر تھے۔ تصنیف و تالیف کا شوق تھا۔ ان کی کتاب مرقاۃ العربیہ (سہ حصہ) ایک زمانے میں سرکاری ہائی اسکولوں اور اسلامی مدارس کے نصاب کی مقبول کتاب تھی۔ صرف و نحو میں بھی دو کتابیں ان کی یادگار ہیں۔ صحافت اور قومی خدمت کا شوق بھی تھا۔ مولانا محمد علی کے ہمدرد دہلی میں ۱۹۲۷ء اور ۱۹۲۹ء کے دوران میں اعزازی طور پر کام کرتے تھے۔ یہ بزرگ چوں کہ میرے رشتے کے چچا اور سگے پھوپھا خسر تھے۔ اور مجھے ان کی صحبت سے فیض اٹھانے کا شرف حاصل ہوا تھا۔ مجھے انھوں نے بتایا تھا کہ ان کے کئی مقالے مولانا محمد علی نے پسند فرمائے تھے اور ادارتی صفحات پر چھاپے تھے۔ شاعر بھی تھے۔ قیس تخلص تھا۔ آخری عمر میں شاعری کا شوق ختم ہو گیا تھا اور اپنا دیوان انھوں نے ضائع کر دیا تھا لیکن مجھے ہمدرد کی فائلوں میں ان کی دو غزلیں دستیاب ہوئی ہیں جو اخبار کے صفحہ اول کی زینت بنی تھیں۔

آخری عمر میں وطن مالوف شاہ جہاں پور آ گئے تھے۔ بہادر گنج (بازار) میں کتابوں کی دکان تھی، اسلامیہ اسکول میں اعزازی طور پر عربی پڑھاتے تھے اور حاجی محمد سعید کے وقف کے تحت جاری مدرسہ سعیدیہ (جامع مسجد شاہ جہاں پور) کے مہتمم بھی بنا دیئے گئے۔ وہ ۲۵،۳۰ برس دہلی میں رہے۔ ادب و صحافت کے میدان کی ایک معروف شخصیت تھے۔ خصوصاً حضرت مفتی اعظم کے حلقۂ اثر اور اصحاب درس و تدریس میں تعارف کے محتاج نہ تھے۔ کفایت المفتی میں شامل بیسیوں فتووں پر ان کے تصدیقی و توثیقی دستخط موجود ہیں۔

کہنا صرف یہ چاہتا ہوں کہ اگر حضرت واصف سے ان کا نام چھوٹ گیا ہے تو سہو کے سوا اس کی کوئی دوسری وجہ نہیں ہو سکتی۔

مولانا سعید الدین:

ایک اور نام جو ہرگز نظر انداز کر دیئے جانے کے قابل نہیں تھا مولانا سعید الدین کا

تھا جو واصف صاحب کے سامنے نہ صرف دہلی میں موجود تھے، بلکہ مدرسہ امینیہ میں بیٹھے تھے۔ مولانا سعید الدین بانی مدرسۂ امینیہ، دہلی مولانا امین الدین اورنگ آبادی ثم دہلوی کے بیٹے تھے۔ مدرسۂ امینیہ کے نامور شاگرد اور حضرت مفتی اعظم ہند کے تلمیذ رشید تھے۔ ایک عرصے تک درس و تدریس کی خدمات انجام دیں۔

قیام پاکستان کے بعد کراچی آگئے تھے۔ گارڈن روڈ پر مکّی مسجد میں، جو تبلیغی جماعت کا مرکز ہے، پیش امام تھے۔ بلکہ وہ اس مرکز دینی کو قائم کرنے والوں اور تبلیغی جماعت کے اہم لوگوں میں تھے۔ ان کا انتقال کراچی میں ہوا۔

ان کے صاحبزادے مولوی حافظ قاری فرید الدین صاحب جامع مسجد قدوسیہ ناظم آباد نمبر ا، کراچی کے پیش امام ہیں۔

☆☆☆

باب ہشتم

اعترافات

(اکابر و مشاہیر کا خراج تحسین)

اللہ تعالیٰ نے حضرت مفتی اعظم کی ذاتِ گرامی میں ذہن و فکر، علم و فضل، اخلاق و سیرت کی بہت سی خوبیاں جمع فرمادی تھیں اور ملک و قوم اور دین و ملت کی خدمت کی توفیق ارزانی فرمائی تھی۔ جن کا اعتراف ان کے معاصر اہل علم و نظر، وقت کے اصحاب قلم اور مبصرین نے کیا ہے۔ ہم یہاں بہ طور مثال و نمونہ حضرت کے چند خصائص و کمالات کا تذکرہ کرتے ہیں اور بعض اکابر معاصر کے مشاہدات و تجربات کے مطالعے کی دعوت دیتے ہیں۔

(۱)- پچھلے صفحات میں کسی جگہ حضرت شیخ الہند کی ایک نصیحت کا ذکر آیا ہے۔ حضرت نے ارکان جمعیت کو جن دو حضرات کو کبھی نہ چھوڑنے کی نصیحت فرمائی تھی ان میں ایک نام مفتی اعظم مرحوم کا تھا۔ یہ مرحوم کے کمال علم و حسن سیرت کا بہت بڑا اعتراف ہے۔ یہ بھی گزر چکا ہے کہ حضرت شیخ الہند کو مفتی اعظم کے علم و تفقہ، نظر و بصیرت، اصابت رائے، ذہن و فکر کے توازن، عدل و اعتدال پر بڑا اعتماد تھا۔ مولانا حفیظ الرحمٰن واصف نے مولانا مفتی سید مہدی حسن شاہ جہاں پوری کی روایت بیان کی ہے کہ ایک موقع پر حضرت شیخ الہند نے مفتی صاحب کو ہر مشورہ و صلاح اور دوسرے لیڈروں سے ملاقات میں شریک رکھنے کی وجہ یہ بتلائی کہ "مولوی کفایت اللہ کا دماغ سیاست ساز ہے۔ جبکہ دوسرے لوگ صرف سیاست دان ہیں"۔ (مفتی اعظم کی یاد۔ ص ۸۶-۸۵)

(۲)- حضرت شیخ الہند کے ارشد تلامذہ میں مولانا انور شاہ کشمیری ذہانت و فطانت اور مطالعہ و نظر کی ایک خاص شان اور مرتبے کے مالک تھے۔ وہ فرماتے تھے:

"مفتی کفایت اللہ کا وجود اسلام کی حقانیت کی دلیل ہے"۔

(روزنامہ نئی دنیا، دہلی (عظیم مدنی نمبر) ص ۱۴۳)

(۳)- مولانا امین الدین اورنگ آبادی ثم دہلوی بانی و مہتمم مدرسہ اسلامیہ امینیہ ۱۹۰۳ء میں مفتی صاحب کو شاہ جہاں پور سے دہلی لائے تھے اور مدرسے کا شیخ الحدیث اور مفتی بنایا تھا۔ اس کے بعد وہ ستر ہ برس تک زندہ رہے لیکن انھوں نے پہلے روز مفتی صاحب کے علم وسیرت کے بارے میں جو رائے قائم کی تھی، اس میں سر مو فرق نہ آیا۔ ان کا اعتماد روز بہ روز بڑھتا ہی گیا۔ تا آں کہ ۱۹۲۰ء میں وہ مدرسہ انھیں کے سپرد کر کے سفر آخرت پر روانہ ہو گئے۔

(۴)- مولانا شبیر احمد عثمانی ۱۹۲۶ء کی موتمر حجاز میں حضرت مفتی صاحب کی سربراہی میں بھیجے جانے والے جمعیت علمائے ہند کے ایک رکن تھے۔ انھیں اس سفر میں مفتی صاحب کی سیرت کے مطالعے کا بہترین موقع میسر آیا ہے۔ وہ فرماتے تھے:

"مفتی صاحب کے فضائل سے صحیح طور پر ہم اس سفر میں واقف ہوئے۔ ان کی فیاضی وسیر چشمی اور عالی ظرفی کے جو مناظر بہ چشم خود دیکھے، وہ حیرت انگیز تھے"۔ (نئی دنیا، دہلی (عظیم مدنی نمبر، ص ۱۴۲)

(۵)- اسی سفر کا مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی اپنا مشاہدہ ان الفاظ میں بیان فرماتے ہیں:

"حضرت مفتی صاحب کی جو کیفیت دیکھی، اس کا اثر تمام عمر میرے دل میں رہے گا۔ مکے اور مدینے کے درمیان اونٹوں کا سفر تھا۔ جب سب ساتھی تھک کر سو جاتے تو حضرت مفتی صاحب سب کے لیے کھانا تیار کرایا کرتے تھے۔ خرچ میں اگر گڑبڑ ہوتی تو اپنے پاس سے ادا کر دیتے اور جمعیت کے فنڈ پر بار نہ ڈالتے تھے۔ (مفتی اعظم کی یاد، ص ۱۴)

ایک اور مضمون میں مولانا لدھیانوی تحریر فرماتے ہیں:

"۱۹۲۶ء میں سلطان ابن سعود کے پاس جمعیت علمائے ہند کی طرف سے ایک وفد (مجوزہ موتمر اسلامی میں شرکت کے لیے) بھیجا گیا تھا، جس کے صدر حضرت مفتی صاحب مرحوم تھے۔ یہ وفد حج کے موقع پر گیا تھا۔ میں اس سفر میں آپ کا ساتھی تھا۔ اس پورے سفر میں مفتی صاحب کی استقامت، تقویٰ اور دیانت داری کا جو منظر میں نے دیکھا، وہ حیرت انگیز تھا۔ میں نے مکہ

معظمہ سے مدینہ منورہ کے لیے اونٹوں پر سفر اختیار کیا۔ ہر منزل پر ساتھی تکان کی وجہ سے آرام کرتے یا سو جاتے تھے، لیکن مفتی صاحب سب کے لیے کھانا پکانے اور تیار کرنے میں مصروف ہو جاتے۔ اس تمام سفر میں کبھی آپ کی پیشانی پر کسی نے بھی بل آتے نہیں دیکھا اور نہ ہی آپ کے مشاغل دینیہ اور معمولات میں کسی دن فرق آیا"۔ (مفتی اعظم کی یاد، ص ۱۲۰)

واضح رہے کہ یہ وفد حضرت مفتی صاحب کی سربراہی میں مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا احمد سعید، مولانا عبدالحلیم اور مولانا محمد عرفان پر مشتمل تھا۔ اسی سال مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی نے حج کیا تھا۔ وہ وفد کے ساتھ سفر میں شریک تھے، وفد کے رکن نہیں تھے۔ مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی جیل میں اپنے مشاہدے کے بنیاد پر جو کچھ فرماتے ہیں، اس کے مطالعے سے حضرت مفتی صاحب کی عظمت کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"۱۹۳۰ء اور ۱۹۳۲ء میں ان کے ساتھ گجرات اور ملتان کی جیلوں میں رہنے کا اتفاق ہوا تو مجھے انہیں سمجھنے کا بہت اچھا موقع ہاتھ آگیا۔ جیل میں میں نے دیکھا کہ حضرت مفتی صاحب مرحوم کس قدر بلند کردار کے مالک ہیں۔ ہم لوگوں کو وہاں اخلاقی قیدی بہ طور خدمت گذار کے ملے ہوئے تھے۔ میں نے دیکھا کہ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ان کے پھٹے ہوئے کپڑے بیٹھ کر سیا کرتے تھے اور اس کے علاوہ بھی ان کے دوسرے کام کر دیا کرتے تھے۔ میں نے دریافت کیا "آپ ایسا کیوں کرتے ہیں؟" جواب دیا "ان سے کام لینا ظلم ہے! وہ میرا جو کام کرتے ہیں اسی طرح اس کا معاوضہ ادا کرتا ہوں۔ حکومت کو ان سے کام لینے کا کوئی حق نہیں ہے"۔ (مفتی اعظم کی یاد، ص ۱۴)

مفتی صاحب نمود و نمائش سے دور و نفور اور نفسانیت سے پاک تھے۔ مولانا لدھیانوی علیہ الرحمہ نے انکی اصل خوبی ان کی "بے نفسی" اور "بے لوث زندگی" کو قرار دیا ہے۔ (مفتی اعظم کی یاد، ص ۱۵)

نمود و نمائش سے دوری اور نفرت کے سلسلے میں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ مفتی صاحب حضرت رشید احمد گنگوہی سے نسبت ارادت اور بیعت کا تعلق رکھتے تھے۔ تصوف کے کمال ذوق سے بہرہ مند تھے۔ اخلاص وللہیت کا پیکر اور تقویٰ کی تصویر تھے، لیکن خود کسی کو

بیعت نہیں فرماتے تھے۔ اگر کوئی عازم سلوک وطریقت اور بیعت کا طالب آتا تو اس کے ذوق ور جحان کا اندازہ کر کے حضرت مولانا اشرف علی تھانوی، حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی، حضرت مولانا محمد الیاس دہلوی یا حضرت شاہ عبد القادر رائے پوری سے رجوع کرنے کا مشورہ دیتے تھے۔ (روزنامہ نئی دنیا، دہلی، عظیم مدنی نمبر، ص ۱۴۳)

(۶)۔ شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی کا دار العلوم دیوبند میں دور طالب علمی مفتی اعظم کے بعد کا ہے۔ لیکن انھیں حضرت شیخ الہند کا قرب مفتی صاحب سے زیادہ حاصل ہوا۔ جمعیت علمائے ہند میں شیخ الاسلام مفتی صاحب کے قائم مقام (۱۹۳۲ء) بھی ہوئے اور ان کے بعد مستقل صدر بھی بنے۔ دار العلوم دیوبند میں صدر المدرسین اور شیخ الحدیث بھی ہوئے۔ اور اسارت مالٹا کے زمانے میں حضرت شیخ الہند کی صحبت سے انھوں نے فیض اٹھایا تھا اور خدمت گذاری کی جو سعادت انھیں حاصل ہوئی اس میں حضرت شیخ الہند کا کوئی شاگرد شریک نہیں اسی لیے انہیں جانشین شیخ الہند کے لقب سے یاد کیا گیا اور وہ واقعی اس لقب کے سزاوار بھی تھے۔ وہ حضرت مفتی اعظم کے بارے میں لکھتے ہیں:

اگر چہ ہزاروں علماء نے حضرت شیخ الہند قدس سرہ العزیز سے علوم عقلیہ ونقلیہ میں استفادہ کیا، مگر قدرت کی فیاضیوں نے جو خاص جامعیت اور سابقیت مفتی صاحب مرحوم کو عطا فرمائی تھی، وہ بہت ہی کم کو نصیب ہوتی ہے۔ مفتی صاحب مرحوم ابتداہی سے نہایت ذکی، سمجھدار، مستقل مزاج، عالی حوصلہ، معاملہ فہم واقع ہوئے تھے۔"

اخلاق فاضلہ میں خداوند عالم نے کمال عطا فرمایا تھا۔ دریائے سیاست کے بہترین شناور تھے۔ تدبر وفکر کے انمول موتیوں سے آپ کا دامن بھرا رہتا تھا۔ ہر معاملے کی گہرائی اور تہہ تک پہنچنا آپ کی ذکاوت کا ہمیشہ شاہ کار رہا ہے۔

"تحریک آزادی وطن اور خلافت کمیٹی کی تائید اور جمعیت علمائے ہند کی رہنمائی میں آپ نے جس فراست اور استقلال کا ثبوت ۱۹۱۸ء سے لیکر وفات تک دیا، ہندوستان کے اعلیٰ سے اعلیٰ قومی لوگوں کی زندگی اس کی مثال سے خالی ہے۔ شہرت طلبی اور نام ونمود کی خواہش کی ہوا بھی آپ کے پاس سے ہو کر نہیں گزرتی تھی۔ فروتنی اور تواضع میں آپ بالکل اپنے استاذ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ تعالیٰ کے قدم بہ قدم اور آسمانِ تقویٰ کے چمکتے ہوئے ستارے تھے"۔ (مفتی اعظم کی یاد، ص ۶۸-۶۷)

(۷)- مولانا ابوالکلام آزاد وقت کے علمائے واکابر اور معاصر مدبرین کے بارے میں بہت محتاط رہے ہیں۔ اس کے باوجود کہ وہ خود ابوالکلام تھے اس باب میں ان کا قلم کوتاہ رہا ۔ جن چند اکابر علماء کے بارے میں انھوں نے اظہار خیال کیا تھا، ان میں مفتی اعظم بھی ہیں۔ حضرت مفتی صاحب کی وفات پر تعزیتی جلسے میں انھوں نے فرمایا:

"مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب ان لوگوں میں سے تھے جو اپنی زندگی کا اعلیٰ مقصد اپنے سامنے رکھتے ہیں اور اپنی زندگی اس مقصد کی تکمیل کے لیے صرف کر ڈالتے ہیں۔ ان کی زندگی کا عظیم مقصد دین، علم اور ملک کی خدمت کرنا تھا۔ وہ عالم دین تھے اور دین کا اشارہ تھا کہ وہ ملکی اور قومی کام بھی کریں۔ چنانچہ اس کام میں وہ کسی سے پیچھے نہیں رہے۔ ۱۹۲۰ء میں جب میں جیل سے رہا ہوا تو ان سے ملاقات ہوئی۔ میں اس وقت سے برابر ان کی زندگی کو پرکھتا رہا۔ ان کی محنت، جرأت اور استقامت کبھی متزلزل نہیں ہوئی۔ یہ وہ طوفانی دور تھا کہ بڑی بڑی شخصیتیں اس سیلاب میں بہہ گئیں۔ لیکن میں نے دیکھا کہ حضرت مفتی صاحب کے عزم، ہمت اور استقلال میں ذرا فرق نہ آیا اور ان طوفانوں کی پرچھائیں بھی ان پر نہیں پڑی۔ انھوں نے ایک فیصلہ کیا تھا اور وہ فیصلہ یہ تھا کہ جنگ آزادی میں کانگریس کا ساتھ دیا جائے۔ چنانچہ زندگی کے آخری لمحات تک انھوں نے اس راستے سے قدم نہیں ہٹایا۔ ہندوستان کی تاریخ میں ان کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا"۔ (مفتی اعظم کی یاد، ص۶۹)

(۸)- پنڈت جواہر لال نہرو کو حضرت مفتی صاحب سے خاص تعلق خاطر تھا۔ وہ انھیں اپنے بزرگوں میں اور ان رہنماؤں میں شمار کرتے تھے جن سے انھوں نے کچھ سیکھا تھا۔ وہ مفتی صاحب کی سادگی، قابلیت اور سلجھے ہوئے ذہن کے معترف اور قدرداں تھے۔ دہلی میں مفتی صاحب کے جلسۂ تعزیت میں تقریر کرتے ہوئے پنڈت جی نے کہا:

"تحریک خلافت کے زمانے میں جب میں گاندھی جی کے ساتھ دہلی آیا تھا تو مفتی صاحب سے میری پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ اس زمانے میں خلافت کمیٹیوں کے جلسے بھی ہو رہے تھے۔ چنانچہ جب ایک جلسے میں گاندھی

جی نے ”ترک موالات ‘‘کا ذکر کیا تو کچھ پیچھے ہٹے، کچھ نوجوانوں نے اسے قبول کیا اور کچھ سن رسیدہ بزرگوں نے اس سے اختلاف کیا۔ کیونکہ یہ تجویز ایک انوکھی تجویز معلوم ہوتی تھی، لیکن حضرت مفتی صاحب نے اس تحریک کی حمایت کی۔ کیونکہ یہ ایک صاف اور سچی تجویز تھی۔ اس لیے کانگریس نے باضابطہ طور پر اس تجویز کو منظور کر لیا۔ جہاں اور لوگ اس تحریک کو قبول کرنے میں جھجکے، وہاں حضرت مفتی صاحب کے پائے استقامت میں لغزش پیدا نہیں ہوئی۔ میرے دل میں ان کی بڑی قدر ہے۔ وہ ایک سیدھے، قابل، صاف اور ستھرے ذہن کے انسان تھے۔ ایسے آدمی کم ہوتے ہیں اور ایسے ہی آدمی کی قدر کی جاتی ہے۔ ان کے گزرنے کا افسوس ہے۔ انہوں نے پوری زندگی ایک شان کے ساتھ گزاری۔ آزادی کے بعد سے اب تک کے زمانے پر اگر نظر ڈالی جائے تو بہت سی باتیں ایسی ہوئیں اور بہت سی تحریکیں ایسی چلیں جن سے دُکھ ہوا اور ناگوار گزریں۔ ہمیں ان کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک گرہ کھولتے ہیں تو دوسری پڑ جاتی ہے۔ اگرچہ دنیا کی حالت ہندوستان سے بہت زیادہ خراب ہے۔ پھر ہم یہ سوچتے ہیں کہ جن خیالوں کو ہم لے کر چلے تھے، آج کے مسائل کو حل کرنے میں وہ کہاں تک موزوں ہیں؟ تیس برس کی تعلیم جو معقول تعلیم ہے، ذہن سے نہیں ہٹتی۔ وہ باتیں جو بہ ظاہر ملک منظور کر چکا تھا، بعض لوگ اب منظور نہیں کرتے اور ایسے راستے ہیں جن سے نفاق اور جھگڑے پیدا ہوتے ہیں اور وہ بھول جاتے ہیں کہ ہمیں ملک کو آگے بڑھانا ہے۔ وہ بھولتے ہیں کہ آزادی کی نگرانی کے لیے صرف فوجیں کافی نہیں ہوتیں! وہ تو صرف بیرونی خطرات کا مقابلہ کر سکتی ہیں، بلکہ اس کے لیے ذہنی اخلاص کی ضرورت ہوتی ہے۔ آزادی سے پہلے جو سوال ہمارے سامنے تھا، وہ آزادی کے بعد آج بھی موجود ہے۔ جو سبق ہم نے سیکھا، اس پر عمل کیا اور جن لوگوں سے سبق حاصل کیا، ان میں مفتی صاحب ایک خاص آدمی تھے۔ سیاسی میدان میں بہت سے لوگ آئے لیکن ان کی سی سادگی اور اخلاص کی مثال نہیں ملتی“۔

(۹)- علامہ سید سلیمان ندوی، مفتی صاحب حضرت علامہ کے مہمان رہے، بھوپال کے سفر میں دنوں تک ان کا ساتھ رہا۔ ۱۹۲۶ء کی موتمر حجاز میں حضرت مفتی صاحب جمعیت علمائے ہند کے وفد کے رئیس تھے اور حضرت علامہ خلافت کمیٹی کے وفد کے رکن تھے۔ ہندوستان سے سفر میں، مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ کے سفر میں، قیام کے دوران، موتمر کے جلسے میں دونوں کا ساتھ رہا تھا اور ایک دوسرے کو جانچنے اور پرکھنے کا موقع ملا تھا۔ حضرت علامہ لکھتے ہیں:

''مرحوم مفتی صاحب کا وجود اسلام کی معاشرتی مساوات کا ناقابل تردید واقعہ ہے۔ انہوں نے مسلسل بیس برس تک سارے علمائے ہند کے رئیس کی حیثیت سے جمعیت علمائے ہند کی صدارت کی اور کسی نے ان کے اس استحقاق سے سرتابی نہیں کی۔ وہ بڑے سے بڑا احترام جو ایک انسان دوسرے انسان کو دے سکتا ہے۔ وہ تمام عمر مسلمانوں میں ان کو حاصل رہا اور دنیا نے انھیں ''مفتی اعظم ہند'' کہہ کر پکارا''۔ (یادرفتگاں: سید سلیمان ندوی، مکتبہ، مشرق، کراچی، ۱۹۵۵ء، ص ۵۰۸)

(۱۰)- مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے حضرت مفتی صاحب کے انتقال پر جو تعزیتی مقالہ لکھا تھا۔ اس میں لکھتے ہیں:

''حضرت مفتی صاحب طبعاً نہایت ٹھنڈے دماغ، سنجیدہ فکر، متین طبیعت اور مرنج ومرنجان مزاج کے بزرگ تھے۔ ہنگامہ آفرینی سے ان کی طبیعت کو کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ لیکن اس کے باوجود ہندوستان کی تاریخ جدوجہد آزادی کے نہایت نازک دور میں جمعیت علمائے ہند کے پہلے صدر کی حیثیت سے جب انہوں نے ایک نہایت اہم اور بھاری ذمہ داری اپنے سر لی تو ایک وقت آیا کہ ان کی قوت عمل اور کیرکٹر کی پوشیدہ خوبیاں بروئے کار آئیں۔ چنانچہ کانگریس کی تحریک آزادی اور جمعیت علمائے ہند کی پوری تاریخ گواہ ہے کہ حضرت مفتی صاحب نے اس تمام مدت میں جس تدبیر، فراست، عزم وہمت، استقلال وپامردی اور راہ حق میں بے خوفی وبے باکی کا ثبوت دیا۔ اسے دیکھ کر یہی کہا جا سکتا ہے کہ: ایں کار از تو آید ومرداں چنیں کنند''

(برہان، دہلی بابت ماہ جنوری ۱۹۵۳ء، ص ۳)

(۱۱) مولانا نصر اللہ خاں عزیز اردو کے مشہور صحافی تھے تحریک خلافت کے زمانے سے جب انھوں نے عملی سیاست کے میدان میں قدم رکھا تھا اور صحافت کے مشغلے کو انتیار کیا قوم پرور طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ چند سال اخبار مدینہ بجنور کے ایڈیٹر رہے۔ لیکن ۱۹۴۰ء کے بعد وہ مولانا مودودی کے فکر سے متاثر ہو گئے۔ اور اس کے باوجود کہ جمعیت علمائے ہند کے بزرگوں، مولانا ابوالکلام آزاد وغیرہ کے بارے میں ان کے خیالات بدل گئے تھے لیکن ان کے ایمان و علم کے انکار تک نوبت نہیں پہنچی تھی۔ جماعت اسلامی کے حلقے میں ان کا رویہ مولانا مودودی سے زیادہ شریفانہ اور قلم مہذب رہا۔ اس کا اندازہ ان کی تحریروں سے ہوتا ہے۔ حضرت مفتی صاحب کے انتقال پر ان کی یہ تحریر مرحوم کے فضائل علمی اور خصائص سیرت کے اعتراف میں ایک یادگار تحریر ہے اور آخر کی دو سطروں کے سوا یہ مکمل تحریر پیش کر دی جاتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"مولانا مفتی کفایت اللہ کو مرحوم لکھتے ہوئے جگر شق ہوتا ہے۔ اس چھوٹے سے قد کے منحنی شخص کے علم تفقہ سے برصغیر ہند و پاکستان کی پر خروش زندگی کے ۳۰ ربرس متاثر ہوتے رہے۔ ان کا علم و تفقہ کا تعلق تو حضرات علماء سے تھا۔ جو دینی مسائل میں ان کو اپنا رہنما سمجھتے تھے۔ لیکن ان کی اصابت رائے ان کا عزم و تحمل۔ ان کا صبر و توکل، ان کی جرأت و ہمت اور استقلال و استقامت ایسے اوصاف تھے جن سے اس ملک کی پوری زندگی متاثر ہوئی۔

تحریک خلافت کے زمانے سے (۱۹۱۹ء) لے کر ۱۹۳۹ء تک کامل بیس سال وہ جمعیۃ علمائے ہند کے صدر رہے۔ اور اس کی پالیسی کو معتدل اور متوازن رکھنے میں ان کے شخصی اوصاف کافی حد تک کارفرما رہے۔ مسلمانوں کے قانونی حقوق ہوں یا دینی۔ آزادیٔ وطن کی تحریک ہو یا فرقہ وارانہ قضیے وہ حتی الوسع جمعیۃ علمائے ہند کو انتہا پسندی اور رجعت دونوں سے روکتے رہے۔ ان کے سامنے بڑے بڑے علماء ان سے فقہی مسائل میں خم کھاتے تھے۔ ان کی نظر نہایت وسیع اور دقیق تھی۔ تقسیم کے بعد بھی انہوں نے بھارت کے مسلمانوں کو سنبھالنے میں غیر معمولی جرأت و ہمت سے کام لیا۔

آخری چند سالوں سے وہ خرابیٔ صحت کے باعث تمام سیاسی اور دوسری سرگرمیوں سے الگ ہوگئے تھے۔ افسوس کہ حال ہی میں ان کے انتقال کی خبر آگئی۔ اور عالم اسلام ایک بلند پایہ عالم دین کے وجود سے خالی ہوگیا"۔

(سہ روزہ کوثر، لاہور، ۱۴؍ جنوری ۱۹۵۳ء)

حضرت مفتی اعظم کے سانحہ انتقال پر ملک کے رہنماؤں، اخبارات اور علمی، ادبی، مذہبی، سیاسی غرضے کہ ہمہ قسم کے اداروں نے ماتم کیا اور اپنے اپنے انداز میں حضرت مرحوم کو خراج عقیدت پیش کیا اور ان کی خدمات اور کمالات کا اعتراف کیا۔ اس کا کچھ اندازہ "اعترافات" کے ضمن میں منتخبات سے کیا جاسکتا ہے۔ اداروں کے سلسلے میں صرف جمعیت علمائے ہند کی مجلس عاملہ کی قرارداد تعزیت پیش کی جاتی ہے۔ واصف صاحب نے کئی اعتبار سے اس کی اہمیت پر توجہ دلائی ہے۔ مجلس عاملہ کی یہ قرارداد بمبئی کے اجلاس عام کے موقع پر ۲۸؍ فروری ۱۹۵۳ء کو منظور کی گئی تھی۔ قرارداد یہ ہے:

"مجلس عاملہ جمعیۃ علمائے ہند کا یہ اجلاس مفتی اعظم حضرت علامہ مولانا محمد کفایت اللہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ کی وفات حسرت آیات پر اپنے انتہائی رنج والم کا اظہار کرتے ہوئے آپ کی وفات کو نہ صرف کسی ایک جماعت یا کسی ایک فرقے کے لیے بلکہ پورے عالم اسلام اور جمیع انسانیت کے لیے حادثہ جانکاہ اور ناقابل تلافی نقصان سمجھتا ہے۔ حضرت مفتی صاحب کو خداوند عالم نے علم و عمل، زہد و تقویٰ اتباع سنت اور تفقہ فی الدین کی جامع صفات کے ساتھ حسن اخلاق، اعلیٰ کردار، بہترین تفکر اور اعلیٰ تدبر کا مقدس پیکر بنایا تھا۔ مذہبی اور دینی خدمات کے ساتھ ہندوستانی سیاست اور آزادیٔ ہند کی جدوجہد میں آپ کی مساعی جمیلہ آپ کی بار بار کی اسارت اور آپ کی قربانیاں سنگ بنیاد کی حیثیت رکھتی ہیں۔

جمعیۃ علمائے ہند آپ کے حسنِ تدبر کا زندہ کارنامہ ہے۔ آپ اس کے بانی اور معمار اوّل ہیں۔ بیس سال تک آپ کے دور صدارت میں جمعیۃ علمائے ہند نے وہ عظیم الشان تاریخ مرتب کی جو آج نہ صرف جمعیۃ علمائے ہند بلکہ ملت اسلامیہ کے لیے باعثِ فخر ہے۔ آپ کی یہی خدمات اور یہی عظیم

الشان قربانیاں ہیں جن کی وجہ سے ہر ایک حلقہ آپ کی وفات سے متاثر ہے اور موت العالم موت العالم کا صحیح نقشہ سامنے ہے۔

یہ اجلاس آپ کی وفات پر دلی رنج وافسوس کا اظہار کرتے ہوئے دست بدعا ہے کہ خداوند عالم آپ کو اعلیٰ علیین میں مقام اعلیٰ عطا فرمائے اور آپ کے پسماندگان کے ساتھ گہری ہمدردی کا اظہار کرتا ہے"۔

مذکورہ تجویز تعزیت جس اجلاس میں باتفاق رائے منظور کی گئی اس میں مندرجہ ذیل حضرات شریک تھے۔

ارکان مجلس عاملہ۔ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی (صدر اجلاس) سحبان الہند حضرت مولانا احمد سعید صاحب دہلوی، مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی، شیخ الحدیث حضرت مولانا سید فخر الدین احمد صاحب، مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی، مولانا نورالدین صاحب بہاری، مولانا عبدالصمد صاحب رحمانی مونگیری۔ مولانا عبدالحلیم صاحب صدیقی، مولانا ابوالوفا صاحب شاہجہاں پوری، مولانا سید محمد میاں صاحب دیوبندی، مولانا محمد اسمٰعیل صاحب سنبھلی۔

(روزنامہ الجمعیۃ دہلی، مورخہ ۷ رمارچ ۱۹۵۳ء، جلد ۳۸، شمارہ ۶۳۔ بہ حوالہ "جمعیتِ علماء پر ایک تاریخی تبصرہ"، ص ۷۶-۷۵)

(۱۲)۔ ۱۹۴۰ء کے بعد بلکہ ۱۹۳۷ء کے بعد ہی سے جن علمائے حق کے خلاف طوفان اٹھنا شروع ہوا تھا، حضرت مفتی صاحب ان کی صف اول میں تھے۔ ان کی زندگی میں مشکلات کے پہاڑ کھڑے کیے گئے۔ دہلی کے گلی کوچوں میں اور سفر و حضر میں ان کے لیے خطرات ہی خطرات تھے۔ لیکن حضرت مفتی صاحب اپنی رائے پر اٹل اور مسلک سیاسی میں ثابت قدم رہے اور ایک لمحے کے لیے بھی اپنے صبح وشام اور روز وشب کے معمولات بدلنے اور اپنی حفاظت کے لیے کوئی انتظام کرنے کا خیال نہ آیا اور وقت کا کوئی جبر ان کے عزم کو شکست نہ دے سکا۔

۱۳۔ گورنمنٹ نے محبان وطن اور حریت پسندوں کی قید و بند کی تکلیفوں سے، بید کی سزاؤں اور جیل کی مشقتوں سے، ذرائع معیشت کی ضبطیوں سے، جلاوطنی کی ابتلاؤں اور

پھانسیوں پر لٹکانے کے مظاہروں سے مرعوب کرنے اور دہشت پھیلانے کی کوشش ہی نہیں کی بلکہ عہدوں اور منصبوں کا لالچ دے کر، جاگیروں کی پیش کش کر کے، خطابات سے نواز کے، وظیفے دے کے، قاضی و مفتی اور اعزازی وا سپشل مجسٹریٹ بنا کر اور جنگ آزادی کے سلسلے میں تحریکات میں ماخوذین کی سزائیں معاف کر کے انھیں حب الوطنی اور حریت پسندی کی راہ سے ہٹانا چاہا۔ بھوپال، حیدر آباد (دکن) کے ذریعے اس قسم کی کوششیں بار آور بھی ہوئیں۔ یہ حربہ کچھ جنگ آزادی کے آخری دور ہی میں نہیں، ۱۸۵۷ء کے بعد ہی شروع ہو گیا تھا۔ اگرچہ اس تحریک (طریقۂ واردات) کا عروج بیسویں کے آغاز سے ہوا۔ ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ قریب کے زمانے میں تحریک آزادی کے فروغ کی وجہ سے ہمارا احساس بڑھ گیا تھا۔ حضرت شیخ الہند اور حضرت شیخ الاسلام مدنی پر یہ داؤں چلا گیا تھا لیکن روایتی سیرت کی پختگی، ذہانت اور حب الوطنی اور حریت پسندی میں اخلاص کامل کی وجہ سے بچ گئے۔ لیکن یہی لوگ معمولی وظائف کے صلے میں آزادی کی جدوجہد سے الگ ہو کر اپنے رویے میں تبدیلی کر کے یا کسی خاص جماعت میں شریک ہو کے جنگ آزادی کے تماش بینوں میں شامل ہو گئے۔

حضرت مفتی اعظم کو اللہ تعالیٰ نے آزادی کے دعوے میں ایسی صداقت کا ایسا اخلاص، سیرت کی ایسی پختگی، دماغ کی ایسی ذہانت اور ایسی بصیرت عطا فرمائی تھی کہ ان پر وقت کا کوئی جادو نہ چل سکا۔ حضرت شیخ الہند کو مالٹا سے واپسی پر جہاز سے اترنے سے قبل ایک مشورہ دیا گیا تھا، حضرت شیخ الاسلام کو مدرسۂ عالیہ کلکتہ کی صدارت پیش کر کے اور فقیہہ الامت و مفتی اعظم کو سر فضل حسین کے ذریعے وہی کوشش کی گئی تھی۔ مولانا حفیظ الرحمٰن واصف مرحوم نے اس واردات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

میاں سر فضل حسین وزیر تعلیم پنجاب جو وائسرائے کی کونسل کے ممبر بھی تھے۔ انھوں نے حکومت برطانیہ کی طرف سے حضرت مفتی اعظمؒ کو یہ پیغام پہنچایا کہ:

> "حکومت برطانیہ یہ درخواست کرتی ہے کہ آپ سیاسی تحریکات سے کنارہ کش ہو جائیں اس کے صلے میں حکومت آپ کو بطور ہدیہ مدرسہ صفدر جنگ کی شاہی عمارت اور اس کا ملحقہ میدان پیش کرے گی اور آپ کی ذات خاص کے لیے ہبہ کر دے گی۔ ہمارا یہ مقصد نہیں کہ آپ حکومت برطانیہ کی حمایت یا پروپیگنڈہ کریں۔ نہیں بلکہ آپ صرف اتنا کریں کہ خاموش رہیں

اور سیاسیات سے الگ رہیں"۔

یہ ایک رازدارانہ پیغام تھا جو والد مرحوم نے بڑے رازدارانہ انداز میں مجھ سے بیان کیا تھا۔ اور آج پہلی مرتبہ صفحۂ قرطاس پر آ رہا ہے۔ حضرت نے جواب دیا:

"میں آزادیٔ وطن کی تحریک میں اپنی ذاتی منفعت کے لیے شریک نہیں ہوا ہوں۔ آپ کی پیشکش کا شکریہ! کوئی لالچ میرے ضمیر کی آواز کو نہیں دبا سکتا"۔ (مفتی اعظم کی یاد، ص ۲۳-۲۲۲)

(۱۴)- حضرت شیخ الہند علیہ الرحمہ کے تلامذہ میں بڑے بڑے صاحب علم و عرفان موجود ہیں۔ مگر اخفائے حال کی باطنی کیفیت میں مفتی صاحب کی شان منفرد ہے۔ (علمائے دیوبند کی تفسیری خدمات: مولانا اخلاق حسین قاسمی، ۲۰۰۰ء، دہلی، ص ۲۱)

ایک گزارش

حضرت مفتی اعظم کے انتقال پر الجمعیۃ، دہلی نے مرحوم کی یاد میں ایک "مفتی اعظم نمبر" شائع کیا تھا۔ اس نمبر کے مضامین اور کچھ وہ مضامین اور خطوط جو بعد میں آئے تھے، مولانا حفیظ الرحمٰن واصف مرحوم نے مرتب کر کے "مفتی اعظم کی یاد" کے نام سے کتابی صورت میں شائع کر دیئے تھے۔ یہ مجموعہ حضرت مفتی صاحب کے اذکار و سوانح اور سیرت و خدمات میں بہ استثناء چند روایات مستند و مندرجات معلومات کا خزانہ ہے۔ خاکسار نے اس مضمون کی تالیف میں اس سے بہت فائدہ اٹھایا ہے۔ یہ مجموعہ ۱۹۶۶ء میں شائع ہوا تھا۔ اب نایاب ہے۔ ضرورت ہے کہ اس نایاب دستاویز کو نظر ثانی اور ترمیم واصلاح کے بعد نئی ترتیب و تدوین میں شائع کیا جائے۔ نظر ثانی جدید ترتیب و تدوین کے لیے ضروری ہے اور ترمیم واصلاح کی ضرورت اغلاط کی درستگی، تکرار مباحث کے رفع اور بعض مندرجات کے ترک واضافہ کے لیے لازم ہے۔ کسی اخبار یا رسالے کے نمبر کے تمام مضمون نگار علم و مطالعے اور نظر و مشاہدے کی ایک سطح کے لوگ نہیں ہوتے۔ ان میں بالواسطہ اور بلاواسطہ معلومات رکھنے والے، نزدیک و دور سے دیکھنے والے، بعض کتابی معلومات کے حامل اور کچھ سنی سنائی باتوں پر یقین کرنے والے، کچھ صاحب تذکرہ کے رفقائے کار، کچھ عقیدت مند وغیرہ ہوتے

ہیں۔ اخبارات ورسائل کے نمبروں میں بہت سی ایسی باتیں بھی چھپ جاتی ہیں جو واقعات کے خلاف ہوتی ہیں اور علم و تحقیق کے معیار پر پوری نہیں اترتیں۔ لیکن کتاب میں چھان بین کے بعد ایسی روایات و معلومات کو حذف کردیا جاتا ہے۔

زیر نظر مجموعے میں کئی ایسی باتیں موجود ہیں جو واقعات کے خلاف ہیں جو استناد اور صحت کے معیار پر پوری نہیں اترتیں۔ اس کے ثبوت کے لیے ایک مقالے میں پیش کردہ ایک روایت کو پیش کرنے کی اجازت چاہوں گا۔ فاضل مرتب لکھتے ہیں۔

ابوالغیاث شیخ کریم الدین صاحب میرٹھی جو ۱۹۲۲ء سے لے کر ۱۵-۱۶ برس تک جنوبی ہند میں بطور سفارت جمعیت علمائے ہند کی خدمات انجام دیتے رہے۔ بیان فرماتے ہیں کہ ۱۹۳۰ء کی تحریک سول نافرمانی کے موقع پر جمعیۃ علماء پر ایسا تنگی کا وقت آیا کہ فنڈ میں روپیہ بالکل نہ تھا۔ کئی ماہ کی تنخواہیں چڑھ گئیں اور تحریک کو جاری رکھنا ناممکن ہو گیا۔ پنڈت موتی لال نہرو جو دہلی آئے ہوئے تھے اور ڈاکٹر انصاری کی کوٹھی میں قیام پذیر تھے ان کا پیغام آیا کہ لاکھ دولاکھ جس قدر روپے کی ضرورت ہو ہم کانگریس کے فنڈ سے دینے کے لیے تیار ہیں آپ تحریک کو جاری رکھیے۔ مولانا اُسی وقت ناظم اعلیٰ تھے۔ یہ پیش کش قبول کرنے پر آمادہ تھے۔ اور اس میں بہ ظاہر کوئی حرج بھی نہیں تھا۔ کیونکہ کانگریس کا فنڈ تمام فرقوں کا مشترک فنڈ تھا۔ حضرت مفتی اعظمؒ گرفتار ہو چکے تھے اور اُس وقت تک دہلی جیل میں ہی تھے۔ اس سلسلے میں جب آپ سے مشورہ کیا گیا تو آپ نے فرمایا:

> "جنگ آزادی کے میدان میں ہم کسی دوسرے کے سہارے پر نہیں کھڑے ہوئے ہیں۔ استخلاص وطن کی جدوجہد ہمارا مذہبی فریضہ ہے۔ اگر ہم جماعت کو نہیں چلاسکیں گے تو دفتر کو بند کردیں گے"۔ (مفتی اعظم کی یاد، ص ۲۲۲)

اس بیان سے حضرت مفتی اعظم کی سیرت کی جس خوبی پر استدلال کیا گیا، وہ بالکل درست ہے۔ حضرت کا پیمانۂ سیرت اور اخلاص فی سبیل الحریت اس سے بھی بلند ہے۔ لیکن یہ روایت درایت کے اصول پر معیارِ صحت سے بہت پست اور ساقط الاعتبار ہے۔ اس لیے کہ یہ واقعہ ۱۹۳۰ء کی سول نافرمانی کے زمانے کا، حضرت مفتی صاحب کی گرفتاری کے زمانے کا اور دہلی سے گجرات جیل بھیجے جانے سے پہلے کا بتایا گیا ہے اور یہ کہ پنڈت موتی لال نہرو اس

زمانے میں دہلی آئے اور ڈاکٹر انصاری کی کوٹھی میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ لیکن یہ سب کچھ کیسے ممکن ہو سکتا تھا کہ پنڈت جی ۵ر فروری ۱۹۳۰ء کو انتقال فرما چکے تھے اور حضرت مفتی صاحب ۱۱ر اکتوبر کو گرفتار ہوئے تھے! اس روایت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مولانا احمد سعید صاحب پنڈت جی کی پیش کش قبول کرنے پر آمادہ تھے۔ حضرت مفتی صاحب نے انکار کر دیا! پیش کش پر مفتی صاحب کے ردو قبول کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جہاں تک مولانا کی آمادگی کا تعلق ہے تو یہ بات مولانا کی سیرت کی معلوم خوبی، اور شہرت اور شان کے خلاف ہے، اور بھی کئی باتیں قابل غور ہیں:

(۱)- اگر کئی ماہ کی تنخواہیں ادا نہیں کی جا سکی تھیں تو اس کی رقم دس پندرہ ہزار سے زیادہ نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کے لیے "لاکھ دو لاکھ -جس قدر ضرورت ہو" کی پیش کش خلاف عقل ہے!

(۲)- پنڈت جی تو اس پیشکش کے لیے زندہ ہی نہ تھے۔ اگر زندہ ہوتے تب بھی وہ یا کانگریس کا کوئی رہنما، بہ شمول صدر اور گاندھی جی کے کوئی رہنما اس قسم کی کھلی پیش کش کر نہ سکتا تھا کہ "لاکھ دو لاکھ۔ جس قدر روپے کی ضرورت ہو ہم کانگریس کے فنڈ سے دینے کو تیار ہیں"۔

(۳)- پیش کش کے قبول کے لیے ایک جواز بھی تلاش کر لیا گیا۔ "اس میں بہ ظاہر کوئی حرج بھی نہیں تھا۔ کیونکہ کانگریس کا فنڈ تمام فرقوں کا مشترک فنڈ تھا"۔ اور کسی قومی تحریک کے اجرا اور موانع کے انسداد میں مدد کی جا سکتی تھی۔ لیکن یہ اختیار بھی کسی فرد واحد کو نہ تھا کہ انتظامیہ یا کسی خاص کمیٹی سے مشورے کے بغیر اتنی بڑی رقم کسی فرد یا جماعت کو دے دی جائے یا پیش کش ہی کرے۔ کانگریس کے نظم کی سختی کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ پنڈت موتی لال نہرو کے انتقال سے قبل ہی کا واقعہ ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے ایک مرتبہ اپنے سفر کا بل دفتر کو پیش کیا جس میں ان کے ملازم کا سفر خرچ بھی شامل تھا۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے اس کی ادائیگی سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ ملازم کا سفر خرچ نہیں دیا جا سکتا۔ یہ اصول کے خلاف ہے! مولانا نے بل واپس لے لیا اور پھر اپنا سفر خرچ بھی وصول نہیں کیا"۔

(۴)- یہ بات بھی قابل غور ہے کہ کانگریس کی مالی حالت ایسی کب تھی کہ وہ اپنی معاون حریت پسند جماعتوں کی لاکھوں روپے سے مدد کرتی؟ یہ روایت بھی در حقیقت ان افسانوں اور بہتان طرازیوں میں سے ایک ہے جو ۱۹۳۷ء اور ۱۹۴۷ء کے زمانے میں عام پھیلی

ہوئی تھیں۔ اگر اس روایت کو قبول کر لیا جائے تو جمعیت علمائے ہند کے بزرگوں اور نیشنلسٹ رہنماؤں کا ایک طبقہ جو سیرت کی ایسی کمزوریوں سے بچا رہا ہے، ہم ان کے خلاف الزامات کا دفاع نہیں کر سکتے۔

یہ غلطی کی واحد مثال نہیں ہے۔ ایسی متعدد، غلطیاں اس مجموعۂ مضامین "مفتی اعظم کی یاد" میں موجود ہیں۔ اگر کبھی نئی اشاعت کا سر وسامان مہیا ہو تو اس پر بہ غور نظر ڈالی جائے۔

☆☆☆

حصہ دوم

آثار علمیہ وادبیہ

دینی، ادبی اور تاریخی وسیاسی نوادر

ایک تاریخی فتویٰ

حضرت مفتی صاحب کا ایک یادگار اور تاریخی فتویٰ

۱۹۲۰ء میں پراونشیل خلافت کمیٹی صوبہ آگرہ کے شعبہ تبلیغ کے صدر مولانا عبد الماجد قادری بدایونی نے سید المطابع، میرٹھ سے "ترک موالات" کے عنوان سے ایک مختصر مجموعۂ فتاویٰ شائع کیا تھا۔ اس مجموعے میں فرنگی محل، لکھنؤ، سہارن پور، بدایوں، کانپور کے متعدد علماء کے علاوہ حضرت شیخ الہند، مولانا ابوالکلام آزاد اور مفتی محمد کفایت اللہ کے فتاوے بھی شامل تھے۔ یہاں حضرت مستفتی مولانا بدایونی کا استفتاء اور صرف آخرالذکر حضرت موصوف کا تاریخی فتویٰ درج کیا جاتا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

استفتاء:

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومذہب

(۱)- حالات حاضرہ میں ترک موالات من النصاریٰ شرعاً ضروری ہے یا نہیں؟

(۲)- صورت موجودہ میں ملک کے ہنود کی ہمدردی مسلمانوں کے ساتھ اور اُن کا مرکزی مجلس خلافت کی تجویز، ترک موالات کو مفید اور کامیاب بنانے میں مدد دینا اور مسلمانوں کا اُن کی ہمدردی ومدد سے مستفید ہونا۔ عندالشرع کیا حکم رکھتا ہے؟

(۳)- ترک موالات کی تجویز عام کی دفعہ خصوصی مالی لین دین بند کر دینا۔ اور اسی ضمن میں:

(الف) مدارسِ قومیہ سے اس کا اجرا و نفاذ ضروری ہے یا نہیں؟

(الف) طلباء مدارسِ قومیہ کا اراکینِ مدارس سے ایسا مطالبہ کہ وہ ہر ایسی مدد جو تجویز ترک موالات کے خلاف ہے فوراً حاصل کرنا بند کر دیں۔ صحیح ہے یا نہیں؟

(ج) ایسا کرنے میں عاقل و بالغ طلبہ اپنے والدین کی اجازت کے محتاج ہیں

یا نہیں؟

المستفتی: فقیر عبد الماجد القادری، صدر شعبۂ تبلیغ مجلسِ خلافت صوبہ آگرہ

جوابِ استفتاء بہ قلم حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ دہلوی:

(۱)- ترک موالات ایک شرعی فریضہ ہے جس کے متعلق قرآن مجید میں نہایت صاف وصریح احکام موجود ہیں۔ دوپہر کے وقت آفتاب کے وجود سے انکار ممکن، مگر دشمنان خدا کے ساتھ ترک موالات کی فرضیت سے انکار ممکن نہیں۔ قرآن پاک میں ایک دو جگہ نہیں بلکہ بہت سے مواقع میں نہایت تاکید کے ساتھ ترک موالات کے احکام مذکور ہیں اور دشمنانِ خدا کے ساتھ موالات کرنے والوں کے حق میں سخت سے سخت وعیدیں بیان فرمائی گئی ہیں۔

سورہ ممتحنہ میں ارشاد ہوتا ہے: انما ینھٰکمُ اللہُ عنِ الذین قاتلو کُم فی الدین وَ اخرَجو کُم من دیارِ کُم وظاھرُوا علیٰ اِخراجِکُم اَنْ تولوھم وَ مَنْ یتولّھُمْ فَاُولٰئِک ھم الظّٰلمونَ

خلاصۂ ترجمہ:- حضرتِ حق تم کو ایسے لوگوں سے جنہوں نے تم سے دین میں مقاتلہ کیا اور تم کو تمہارے گھروں اور شہروں سے نکال کر خانہ ویران کیا اور تمہیں نکالنے میں دوسرے لوگوں (یعنی تمہارے دشمنوں) کی مدد کی موالات کرنے سے منع فرماتے ہیں اور جو مسلمان ان لوگوں سے موالات کریں گے وہ ظالم ہیں۔

اس آیت میں حضرت حق نے جن کفار کی موالات سے منع فرمایا اور موالات کرنے والوں کو ظالم قرار دیا ہے ان کی تین حالتیں بیان کی ہیں۔ اوّل یہ کہ ان کے اور تمہارے درمیان مذہبی لڑائی ہوئی ہو۔ دوم یہ کہ انہوں نے تم کو تمہارے گھروں اور شہروں سے نکال کر خانہ ویران کیا ہو۔ تیسرے یہ کہ اور نکالنے والوں کی مدد کی ہو۔ جن کفار میں یہ تینوں باتیں موجود ہوں ان کی موالات اس آیت سے صاف طور پر حرام ثابت ہوتی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ گورنمنٹ برطانیہ کے ایک بڑے ذمہ دار شخص نے جنرل ایلنبائی کو فتح یروشلم پر مبارک باد دیتے ہوئے کہا کہ آپ کو اس صلیبی جنگ کے فاتح ہونے کی حیثیت سے میں مبارک باد دیتا ہوں۔ ظاہر ہے کہ اگر ان ذمہ داران حکومت کے دلوں میں وہی بات ہوتی جو زبان سے کہتے تھے کہ یہ جنگ مذہبی جنگ نہیں ہے تو فتح بیت المقدس کو صلیب کی فتح کیوں کہا گیا اور ایلنبائی کو صلیبی جنگ کا فاتح کس وجہ سے قرار دیا۔ صرف اس واقعہ نے ہی ان کے زبانی ادعا کی

حقیقت کو بے نقاب کر دیا اور ارشاد خداوندی سچا ہو گیا۔ یُرضونکم بافواہہم وَ تابیٰ قلوبہم (۸:۹) کہ وہ صرف اپنے منہ سے (ملکی جنگ بتا کر) تم کو راضی کر دیتے ہیں اور ان کے دل اس سے انکار کرتے ہیں یعنی اس جنگ کو ملکی جنگ بتانا صرف اس لیے تھا کہ مسلمانوں کی جانی ومالی قربانیاں حاصل کی جائیں۔ عربوں اور ہندوستانی مسلمانوں کو خلیفۃ المسلمین کی فوج سے لڑایا جائے اور خود ان کے ہاتھوں اسلامی ممالک فتح کر کے مسیحی طاقتوں کے حوالے کیے جائیں یا ان کے زیر اقتدار کر کے غلامی کا طوق مسلمانوں کی گردنوں میں ڈالا جائے۔ اس کے علاوہ صلح نامہ ٹرکی کی شرائط نے تمام اسلامی دنیا کو یقین دلا دیا کہ دول متحدہ نے صرف مسیحیت کے تقاضے اور اسلام کے ساتھ عداوت کی وجہ سے ایسی شرائط پر ٹرکی کو مجبور کیا جو قانون مساوات، آئین عدل وانصاف سے قطعاً کوسوں دور ہیں۔ مثلاً ٹرکی کے وہ مقامات جن پر جنگ کا کوئی اثر بھی نہیں پہنچا تھا، نہ ان کو دورانِ جنگ میں کسی نے فتح کیا، ٹرکی کے قبضے سے نکالنا۔ سمرنا یونانیوں کو دلوانا یا قبضہ کر لینے دینا۔ دارالسلطنت اور مرکز خلافت قسطنطنیہ پر قبضہ کر لینا، مقامات مقدسہ پر قبضہ کر لینا اور انگریزی تسلط جما کر اپنے صریح وعدے کی خلاف ورزی کرنا۔ ولی عہد سلطنت کو بغیر کسی جرم کے قید یا نظر بند کر دینا۔ تھریس یونان کو دلا دینا وغیرہ وغیرہ۔ یہ تمام واقعات اور حالات ہیں جن پر نظر کرتے ہوئے کسی ادنیٰ سمجھدار کو بھی اس میں شک نہیں رہتا کہ مسلمانوں کے ساتھ مذہبی تعصب برتا گیا ہے۔ اور صرف اس جرم پر کہ یہ خدائے قدوس کی توحید پر ایمان رکھتے ہیں۔ ان کے ساتھ یہ صریح ظلم کیا گیا ہے، تو اس جنگ کے نتائج نے روزِ روشن کی طرح اس کا مذہبی جنگ ہونا ثابت کر دیا۔

(۲)- گھروں اور وطن سے نکالنا۔ جن مقامات پر مسیحی طاقتوں نے قبضہ کیا ہے۔ وہاں سے ہزاروں مسلمانوں کا گھر بار چھوڑ کر نکل جانا بالخصوص مرکز خلافت قسطنطنیہ سے بے شمار محبانِ وطن کا ہجرت کر جانا۔ عمائد سلطنت دار شیخ الاسلام اور علمائے کرام کو مالٹا میں جلاوطن کر دینا۔ اخراج عن الدیار، اخراج عن الوطن نہیں تو اور کیا ہے۔

(۳)- نکالنے والوں کی مدد کرنا۔ سمرنا پر یونانیوں کا قبضہ دلانا یا قبضہ کر لینے دینا۔ تھریس پر یونانیوں کا قبضہ کرا دینا اور ہزاروں مسلمانوں کا جلاوطن ہو جانا۔ جماعتِ احرار ومحبانِ وطن پر ایسی سختیاں کرنا جس سے وہ ترکِ وطن پر مجبور ہوں کھلی ہوئی معاونت علی الاخراج ہے۔ اور تینوں باتوں میں اگرچہ تمام دول متحدہ شریک ہیں لیکن جیسا کہ واقعات اور اخبارات سے معلوم ہو چکا ہے ان

سب میں برطانیہ کی طاقت ہی کا ہاتھ زبردست تھا۔ اور ترکی کے ساتھ ناانصافی اور سختی کی تمام تر زیادہ تر ذمہ داری برطانیہ ہی پر عائد ہوتی ہے۔ پس جب کہ حکومت برطانیہ میں یہ تینوں باتیں، جن کا اس مقدس آیت میں ذکر کیا تھا علی وجہ الکمال پائی گئیں۔ تو خدا تعالیٰ کے اس صاف و صریح حکم کے بموجب حکومت برطانیہ کے ساتھ ترک موالات فرض اور موالات حرام ہے۔ حضرت حق کا یہ ارشاد کہ جو ایسے لوگوں سے موالات کرے وہ ظالم ہے، اس بات کی دلیل ہے کہ نہی تحریمی ہے۔ کیونکہ ظلم کے متعلق دوسری جگہ ارشاد ہے الالعنۃ اللہ علی الظّٰلمین یعنی خبردار ہو کہ ظالموں پر خدا کی لعنت ہے۔

جواب نمبر ۲

ایسے دشمن جن کی عداوت کے اثر سے اسلامی شوکت اور مذہبی ناموس برباد ہوتا ہو۔ اسلامی سلطنت تباہ ہوتی ہو، مقامات مقدسہ اور جزیرۃ العرب پر غیر مسلم اقتدار قائم ہوتا ہو یقیناً لا تتخذوا عدوی و عدوکم اولیاء میں داخل ہیں۔ اور مسلمانوں پر فرض ہے کہ اسلام کے ناموس کی حفاظت کے لیے ہر ممکن جدوجہد کریں۔ اس جدوجہد میں اگر برادرانِ وطن کے ساتھ اتفاق واتحاد مفید ہو (جو یقیناً مفید ہے) تو حدود شرعیہ کے اندر رہ کر اس پر عمل کرنا بھی اور اتحاد و اتفاق پیدا کرنا بھی یقیناً مقدمات فرض میں داخل ہے اور جب کہ برادرانِ وطن کا ہمارے ساتھ مقاتلہ فی الدین اور اخراج عن الوطن یا مظاہرت علی الاخراج نہیں تو ان کے ساتھ احسان و انصاف اور اتفاق فی المعاشرۃ سے کوئی چیز مانع نہیں۔ خود حضرت حق تعالیٰ کا ارشاد ہے لَاَینھٰکم اللہُ عَنِ الذین لم یُقاتِلو کُم فی الدین وَ لَم یُخرِ جو کُم مِّن دیارِ کُم اَنْ تبرّو ھُمْ وَ تُقسِطوا اِلیھِم۔ یعنی اللہ تعالیٰ تم کو ایسے غیر مسلموں کے ساتھ احسان و انصاف کا معاملہ کرنے سے منع نہیں کرتا جن کی تمہارے ساتھ مذہبی جنگ نہیں اور نہ انہوں نے تمہیں خانہ ویران کیا۔

اور ظاہر ہے کہ جب احسان کرنے سے ممانعت نہیں تو معاشرتی اتفاق سے بدرجۂ اولیٰ ممانعت نہ ہوگی۔ پھر جب کہ برسر جنگ دشمنوں سے صلح کرنا جائز ہے تو غیر محاربین سے صلح بدرجہ اولی جائز ہے حضرت حق کا ارشاد ہے وان جنحو السلم فاجنح لھا و توکل علی اللہ کہ اگر مشرکین صلح کی طرف مائل ہوں تو تم بھی صلح کی طرف جھک جاؤ اور خدا پر بھروسہ کرو۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اتفاق اور صلح حدود شرعیہ کے اندر رہے تو پھر عدم جواز کی کوئی وجہ نہیں۔

جواب نمبر ۳

الف:- ترک موالات میں تمام وہ تعلقات شامل ہیں جن میں میل جول محبت اور اعانت ونصرت پائی جاتی ہو۔ اور اسلام سے دشمنی رکھنے والی طاقت کو قوت پہنچتی ہو۔ مالی لین دین ہو یا حکومت کی ملازمتیں ہوں۔ تعلیم ہو یا کونسلیں۔ کسی خاص قسم کی موالات کو حضرت حق نے منع نہیں کیا بلکہ عام حکم دے کر ہر قسم کی موالات کو حرام فرمادیا ہے۔

ب:- تعلیم کے لیے گورنمنٹ سے روپیہ لینا اور اس کی وجہ سے اُن شرائط کا پابند بننا جو تعلیم کو نکمی بلکہ زہریلی کر دیتی ہیں۔ یقیناً ناجائز ہے۔ مذہبی طبقہ تو ہمیشہ سے اس کی نکمی اور زہریلی اور الحاد ودہریت بھری ہوئی تعلیم سے روکتا رہا ہے آج اس پر واقعات حاضرہ نے ترکِ موالات کا فریضہ اور زیادہ بڑھا دیا ہے۔

رہی صرف زبان کی تعلیم یا علوم ومعاشیہ کی تعلیم وہ بے شک جائز ہے لیکن اس کے لیے نہ کسی ڈگری کی ضرورت ہے، نہ یونیورسٹیوں سے تعلق قائم رکھنے کی نہ گورنمنٹ سے گرانٹ لینے کی، ڈگریوں کی ضرورت صرف گورنمنٹ کی ملازمتوں میں ہوتی ہے اور گورنمنٹ کی ملازمتیں کرنا یقیناً اس کے ساتھ موالات ہے۔ پس ترکِ موالات کے دوسرے مدارج کی کامیابی کا پہلا زینہ یہی ہے کہ تعلیمی ڈگریاں ہی حاصل نہ کی جائیں۔

ج:- تمام مسلمان عاقل وبالغ طلبہ پر خواہ وہ قومی مدرسوں کے طالب علم ہوں یا سرکاری مدرسوں کے، فرض ہے کہ وہ ایسے مدارس سے جن کا تعلق گورنمنٹ کے ساتھ ہے علیحدہ ہو جائیں اور اس علیحدگی میں ان کو اپنے والدین کی اجازت لینی ضروری نہیں۔ بلکہ والدین کی ممانعت پر عمل کرنا جائز نہیں۔ کیونکہ لاطاعة المخلوق فی معصية الخالق سرورِ عالم کا ارشاد ہے۔ ہاں والدین کے ادب واحترام کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے، ان کی خدمت میں نہایت اخلاص اور ادب کے ساتھ یہ عرض کردیں کہ چونکہ ان مدارس میں پڑھنے سے خدا اور رسولؐ کے احکام ہمیں منع کرتے ہیں اس لیے آپ ہمیں معذور سمجھیں اور اس حکم عدولی کو خوش دلی سے معاف فرمائیں۔

کتبہ خاکسار محمد کفایت اللہ غفرلہٗ

دہلی، ۹ر صفر ۱۳۳۹ھ (۲۸ر اکتوبر ۱۹۲۰ء)

☆☆☆

چند تبرکات دینی

حضرت مفتی اعظم کے ہزاروں فتوے کفایت المفتی کی نو جلدوں میں مرتب ہو گئے ہیں۔ لیکن تحقیق و بازیافت کا باب بند نہیں۔ یقین ہے کہ صدہا فتوے اب بھی لوگوں کے پاس موجود ہوں گے اور اخبارات و رسائل میں دبے پڑے ہوں گے جو فاضل مرتب مولانا حفیظ الرحمٰن واصف مرحوم کو دستیاب نہیں ہو سکے۔ اس قسم کے نایاب فتووں میں سے چودہ فتوے حضرت مخدومی مولانا حافظ قاری شریف احمد صاحب دہلوی دامت فیوضہم (مدیر و صدر المدرسین مدرسہ تعلیم القرآن و پیش امام و خطیب جامع مسجد سٹی اسٹیشن، کراچی) کے استفسارات کے جواب فتاویٰ شرعیہ اور ایک ذاتی خط کا جواب ہے۔ یہ تمام استفسارات اور ان کے جواب (فتوے) کفایت المفتی میں شامل نہیں۔

حضرت مخدومی قاری صاحب کے ذخیرہ علمی سے جو چودہ تحریرات دستیاب ہوئی ہیں، ان کی تفصیل یہ ہے:

(۱)- حضرت مفتی اعظم کے چار خط ہیں جو قاری صاحب کے مختلف سوالات کے جواب میں انہیں ذاتی حیثیت میں حضرت مفتی صاحب نے تحریر فرمائے تھے۔ ان جوابات کا تعلق فتووں کی قسم سے نہیں۔ اسی لیے ان چاروں خطوط کو فتووں کے ذیل سے نکال کر نادر خطوط کے حصے میں شامل کر دیا ہے۔

۲- قاری صاحب نے جو خطوط دینی مسائل کے باب میں لکھے تھے اور ان میں شرعی مسئلہ دریافت فرمایا تھا۔ ان میں سے نو کے جوابات شرعی فتوے کے طور پر مفتی صاحب مرحوم نے تحریر فرمائے تھے۔ وہ اس مقام پر شامل ہیں۔ ان میں سے ایک فتوے پر بہ حیثیت مصدق و موثق مولانا محمد مظہر اللہ مسجد جامع فتح پوری، دہلی نے بھی دستخط فرمائے ہیں۔

۳- دو خطوط میں استفسارات کے جواب مولانا محمد ضیاء الحق دہلوی کے قلم سے ہیں۔ ایک خط کے استفسارات کا جو جواب مولانا ضیاء الحق نے تحریر فرمایا تھا اس پر "الجواب

صحیح" لکھ کر حضرت مفتی صاحب نے جواب کی تصدیق کی ہے۔ دوسرے خط میں استفسار کا جواب حضرت مفتی صاحب کے حادثہ انتقال کے بعد کا ہے۔ لیکن یہ چونکہ ایک سلسلے کے خطوط تھے اور ایک ہی بزرگ شخصیت کے نام اور اسی موصوف بزرگ سے حاصل ہوئے تھے، اس لیے اس کا ترک مناسب معلوم نہیں ہوا۔

حضرت مفتی اعظم ہند کے یہ تمام دینی افادات جواز قسم فتویٰ تھے۔ اس مقام پر مرتب کر دیئے گئے ہیں تاکہ یہ نہ صرف ضائع ہونے سے بچ جائیں بلکہ ان کا فیضان عام ہو۔

۷۸۶

(ا)۔ بخدمت اقدس قبلہ وکعبہ حضرت مفتی صاحب مدفیوضکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔ مندرجہ ذیل مسئلہ معلوم کر کے رہنمائی چاہتا ہوں۔ کراچی کی تقریباً اکثر مساجد میں لاؤڈ اسپیکر کے ذریعہ اذانیں ہوتی ہیں اور عیدین اور جمعہ کی نماز بھی۔

یہاں پر ایک طرف حضرات علمائے دیوبند ہیں جن میں مفتی محمد شفیع صاحب سید سلیمان ندوی، مولوی احتشام الحق تھانوی قابلِ ذکر ہیں۔ یہ حضرات اس آلہ پر نماز کے جواز کے قائل ہیں اور عامل بھی ان کی وجہ سے اکثر مساجد میں یہ بدعت شروع ہوئی ہے۔ جس کی وجہ سے ہر امام کے لیے بچنا بڑا دشوار ہو گیا ہے۔

دوسری طرف علمائے بریلی ہیں ان کا عدم جواز صلوٰۃ کا فتویٰ ہے مگر عمل انکا خلاف ہے یعنی وہ بھی نماز اسی آلہ پر پڑھتے ہیں۔

میں بھی یہاں ایک مسجد میں امام ہوں میں بھی اس گناہ میں ملوث ہوں۔ حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی سے یہ مشورہ لیا تھا کہ میں ایسی صورت میں ترک امامت کر دوں تو مولانا نے منع فرمادیا اور یہ فرمادیا کہ یہ مسئلہ کوئی قطعی نہیں اگر آپ کے علماء نے فتویٰ دے دیا ہے تو آپ نماز پڑھائیں اور یہ بھی تحریر فرمایا تھا کہ جمعیۃ علماء ہند اس مسئلہ کی تحقیق کر رہی ہے۔ لہذا حضرت والا کی اس مسئلہ میں کیا رائے ہے۔ آیا اس آلہ پر نماز ہو گی یا نہیں۔ مجوزین ایک دلیل یہ بھی دیتے ہیں، کہ حرمین شریفین میں بھی تو نماز ایسے ہی ہوتی ہے وہاں علماء نے کیوں جواز کا فتویٰ دیدیا۔ فقط بینوا وتوجروا۔

المستفتی (قاری) شریف احمد از کراچی (پاکستان)

الجواب:

آلہ مکبر الصوت سے جو آواز نکلتی ہے اگر وہ اصل آواز ہی ہے جو بڑھ کر بلند ہو جاتی ہے تو وہ جائز ہے جو لوگ اس کے عدم جواز کا فتویٰ دیتے ہیں ان کے نزدیک یہ بات ابھی ثابت نہیں ہے۔ ہاں اذان اس آلہ پر کہنا تو جائز ہے اس میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ صرف امام نماز کی آلہ کی آواز پر اقتدا کرنے میں شبہ ہے تاہم جب ایک جماعت علماء کی اس کی قائل ہے تو آپ اس پر عمل کرنے میں خطاکار نہ ہوں گے۔

محمد کفایت اللہ کان اللہ لہٗ

مہر مدرسہ امینیہ، دہلی

۷۸۶

(۲) قبلہ وکعبہ حضرت مفتی صاحب مد ظلکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ صورت حال یہ ہے کہ میرے ایک عزیز نے اپنے ایک لڑکے کا عقد ایک غیر مطلقہ لڑکی سے کر دیا (جس کے متعلق صرف اس کے والدین کہتے ہیں کہ ہماری لڑکی کو اس کے شوہر نے طلاق دیدی) حالانکہ ہم نے اپنے عزیز کو نکاح سے قبل منع کیا اور ہم اس نکاح میں بھی شریک نہیں ہوئے۔ ہمارے عزیز کے لڑکے نے نکاح کے بعد طلاق دے دی مگر ہمارے عزیز نے اس لڑکی کا نکاح اپنے دوسرے لڑکے سے کرا کر اس سے طلاق دلوادی اور پھر اپنے پہلے لڑکے سے (جس نے پہلے طلاق دی تھی) نکاہ ثانی کر دیا۔

اب دریافت طلب یہ مسئلہ ہے کہ خاوند اور اس کے والدین سے ایسی حالت میں قطع تعلق کیا جائے یا نہیں اور ان کے ہاں کھانا پینا کیسا ہے۔ بینوا و توجروا۔

الجواب:

اگر ان کو معلوم تھا کہ لڑکی منکوحہ ہے اور پہلے خاوند نے طلاق نہیں دی ہے اور پہلا خاوند زندہ موجود ہے تو دوسرا نکاح کرنا حرام تھا۔ اس کے باوجود انھوں نے اس کی پروا نہ کرتے ہوئے اس لڑکی کا نکاح کیا تو وہ سب مرتکب کبیرہ کے ہوئے اور ان سے زجراً تعلق قطع کر لیا جائے تو درست ہے۔

محمد کفایت اللہ کان اللہ لہٗ دہلی

۷۸۶

(۳) کیا فرماتے ہیں حضرات علمائے دین ومفتیان شرع متین ادام اللہ فیوضہم مندرجہ ذیل مسائل کے بارے میں:

(۱)- اگر کوئی حافظ قرآن ہو جس کے ڈاڑھی نہیں نکلی لیکن عمر ۱۵ سال ہے تو اس کے پیچھے تراویح جائز ہے یا نہیں۔

(۲)- مرد کو سونے کی گھنڈیاں لگانی شرعاً جائز ہیں یا نہیں۔

(۳)- اگر ایک حافظ قرآن ڈاڑھی کترواتا ہے اور سونے کی گھنڈیاں بھی لگاتا ہے تو اس کے پیچھے نماز تراویح پڑھ سکتے ہیں یا نہیں۔ یا اس سے یہ بہتر ہے کہ کسی دیندار کی اقتداء میں سورۃ تراویح پڑھ لی جاوے۔

(۴)- بعض مساجد دو دو منزلہ تین تین منزل کی بنی ہوتی ہیں ایسی مساجد میں ہر منزل میں علیحدہ علیحدہ حفاظ تراویح میں قرآن کریم سنا سکتے ہیں یا ایک ہی حافظ سناوے شرعاً کیا حکم ہے۔ بینوا توجروا

(قاری) شریف احمد کراچی (پاکستان)

الجواب:

(۱)- پندرہ سال کی عمر پوری ہو تو اس کے پیچھے نماز فرض اور تراویح پڑھنا جائز ہے خواہ داڑھی نکلی ہو یا نہ نکلی ہو۔

(۲)- سونے کی گھنڈیاں مرد کے لیے لگانا ناجائز ہے۔ بعض فقہا نے سونے کے بٹنوں اور گھنڈیوں کی اجازت دی ہے مگر صحیح قول اول ہے۔

(۳)- حد شرعی سے داڑھی کترواکر کم کرانے والے کی امامت مکروہ ہے۔ اس کے پیچھے قرآن مجید سننے سے کسی نیک دیندار کے پیچھے سورت تراویح پڑھنا بہتر ہے۔

(۴)- ہاں ایسی مساجد میں ہر منزل میں قرآن مجید سنانا مباح ہے بشرطیکہ ایک منزل کی آواز دوسری منزل میں نہ پہنچتی ہو۔

محمد کفایت اللہ کان اللہ لہ

دہلی

۸۶ء

(۴) کیا فرماتے ہیں حضرات علماء دین و مفتیان شرع متین ادام اللہ فیوضہم مندرجہ ذیل مسئلہ کے متعلق:

(۱)- جس نے حج فرض ادا نہیں کیا اور وہ پہلی مرتبہ حج کو جا رہا ہے تو اس کو پہلے مکہ معظمہ جانا چاہیے یا مدینہ منورہ۔

(۲)- زید کہتا ہے کہ جس نے حج فرض ادا نہیں کیا اگر وہ مکہ معظمہ پہلے چلا جائے تو پہلے وہ حج کرے اس کے بعد مدینہ منورہ جائے اگر مکہ معظمہ ہو کر حج سے قبل مدینہ منورہ جائے گا تو اس کا حج نہیں ہو گا کیا یہ صحیح ہے۔ مہربانی فرما کر اصل مسئلہ سے مطلع فرمائیں۔

الجواب:

(۱)- حج کا تو ایک خاص وقت ہے۔ اس سے پہلے یا اس کے بعد حج نہیں ہو سکتا۔ مدینہ طیبہ کی حاضری کے لیے کوئی وقت معین نہیں۔ جب موقعہ ملے حاضری دے سکتا ہے۔

(۲)- یہ بات کہ اگر مکہ معظمہ سے قبلِ حج مدینہ منورہ چلا جائے تو حج نہیں ہو گا غلط ہے اگر وقت میں گنجائش ہو کہ مدینہ طیبہ کی زیارت سے واپس آ کر حج کر سکتا ہے تو مدینہ طیبہ جانے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

محمد کفایت اللہ کان اللہ لہ

دہلی

۸۶ء

(۵) کیا فرماتے ہیں حضرات علمائے دین و مفتیان شرع متین

(۱)- یہ کہ ایک امامِ مسجد جمعہ کو فجر کی نماز میں سورۂ سجدہ اور سورۂ دہر پڑھتا ہے اس کا یہ فعل شرع کے مطابق ہے یا خلاف۔

(۲)- زید یہ کہتا ہے چونکہ ہم امام اعظمؒ کے مقلد ہیں اس لیے حنفی ہونے کی وجہ سے مندرجہ بالا فعل امام صاحب کا ٹھیک نہیں۔ لہذا امام صاحب کا جو قول ہو تحریر فرمادیں اور مفتی بہ قول کیا ہے۔

(۳)- جمعہ کے فرضوں کے بعد لوگ چار سنتیں بھی پڑھتے ہیں دو بھی پڑھتے ہیں اور

بعض چار بھی پڑھتے ہیں اور دو بھی (یعنی چھ رکعت) پڑھتے ہیں۔ اصل مسئلہ کس طرح ہے۔ بینوا و توجروا۔

المستفتی (قاری) شریف احمد دہلوی
از کراچی۔ (پاکستان)

الجواب:

(۱)- جمعہ کے روز فجر کی نماز میں سورہ سجدہ اور سورہ دہر پڑھنا صحیح ہے۔ تاہم اگر نمازیوں میں کمزور آدمی ہوں تو ان کی رعایت کرنا بھی درست ہے۔

(۲)- اس بارے میں تو حنفیہ کا کوئی خاص قول نہیں ہے۔ جمعہ کے روز نماز فجر میں یہ سورتیں پڑھنا اولیٰ ہے اس لیے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہیں۔

(۳)- جمعہ کے فرضوں کے بعد چار رکعتیں سنتیں پڑھی جائیں یا دو پڑھی جائیں یا چھ پڑھی جائیں یہ سب جائز ہے۔ چھ پڑھنا افضل ہے کہ اس میں چار اور دو کے دونوں قولوں کو جمع کر لیا گیا ہے۔

الجواب صحیح محمد مظہر اللہ غفرلہٗ
مسجد جامع فتح پوری، دہلی

محمد کفایت اللہ کان اللہ لہٗ
دہلی

۷۸۶

(۶) کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں:

زید کو ایک مسجد میں نماز پڑھنے کی حالت میں ۲۰۰ (دو سو) روپے پڑے ہوئے ملے یہ مسجد اسٹیشن پر ہے جہاں پر مسافروں کی آمد و رفت رہتی ہے زید نے مسجد ہذا میں بار بار اعلان کرایا اور اخبارات میں بھی اعلان کیا لیکن ابھی تک اس روپے کا مالک نہیں آیا جس کو تقریباً ۴ ماہ کی مدت ہو گئی ہے۔ زید اس روپے کو شرعاً کس طریقہ پر خرچ کرے آیا اسی مسجد میں کسی تعمیر وغیرہ میں لگا دے یا کسی ایسے آدمی کو دے دے جو حج بیت اللہ کو جا رہا ہو اور اس کے پاس روپیہ خرچ کے لیے کم ہو یا کسی اور جگہ صرف کرے۔

زید نے اس رقم کے سلسلہ میں اخبارات میں جو اعلان کیا اس میں بھی اس کا خرچ

ہو اوہ اس میں سے وضع کرے یا نہ کرے۔ بینواو توجروا

الجواب:

زید اپنا خرچہ جو اشتہارات اور اخباروں میں اعلان کرنے پر خرچ ہوا ہے اس رقم میں سے وضع کر کے باقی رقم محتاجوں پر صدقہ کر دے۔

لیکن دو سو روپیہ ہیں تو ان کے لیے کم از کم چھ ماہ انتظار کرے۔

محمد کفایت اللہ کان اللہ لہ

دہلی

۷۸۶

(۷) کیا فرماتے ہیں حضرات علمائے دین و مفتیان شرع متین ادام اللہ فیوضہم اس مسئلہ میں کہ زید کراچی شہر میں سرکاری ملازم ہے اہل وعیال حیدر آباد سندھ میں ہیں وہیں پر اس کو مکان الاٹ ہوا ہے لیکن زید کا خیال ہے اگر کراچی میں مکان مل جائے تو اہل وعیال کو یہیں لے آؤں لیکن یہاں مکان ملنا آسان نہیں ایسی صورت میں اگر زید اہل وعیال سے ملنے کے لیے ایک دو روز کے لیے حیدر آباد جائے تو وہ مسافر کی نماز پڑھے یا مقیم کی۔

بینواو توجروا

الجواب:

جب حیدر آباد میں مکان ہے اور وہیں بال بچے ہیں تو وہاں جاکر مقیم کی نماز پڑھے۔

محمد کفایت اللہ کان اللہ لہ

دہلی

(۸) الجواب

(۱)- جمعہ کے روز بھی زوال ہوتا ہے اور اگرچہ بعض فقہاء نے جمعہ کے روز زوال کے وقت بھی نماز کو جائز قرار دیا ہے مگر صحیح اور مفتے بہ یہی ہے کہ زوال کے بعد ہی اذان اور نماز پڑھی جائے۔

(۲)- بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ایک مرتبہ قرآن مجید میں پڑھنا چاہیے۔ خواہ سورۂ بقرہ پر پڑھے یا اور کسی سورت پر۔ اس میں کوئی تعیین نہیں ہے۔ کار خیر بسم اللہ سے شروع ہونا چاہیے وہ بسم اللہ تو سورۂ فاتحہ سے پہلے پڑھی جاتی ہے۔

(۳)۔ اخیر میں سورۂ فاتحہ کے بعد سورۃ الناس اور الناس کے بعد پھر سورۂ فاتحہ پڑھنا ثابت نہیں ہے۔ آخر کی دو رکعتوں میں سے پہلی رکعت میں سورہ فاتحہ کے بعد سورۃ الناس پر رکوع کردیا جائے اور دوسری رکعت میں سورۂ فاتحہ کے بعد الم مفلحون تک پڑھ کر رکعت کی جائے۔ یہ بہتر ہے۔ دو رکعتوں میں ترتیب قرآن مجید کا پلٹ جانا اس میں کوئی کراہت یا ممانعت نہیں ہے۔ وہ تو قصداً رکھا گیا ہے۔ تاکہ ختم قرآن کے بعد متصلاً شروع ہو جائے۔

سورہ فاتحہ ہر رکعت میں جو پڑھی جاتی ہے وہ بھی تو قرآن پاک کی سورت کی حیثیت سے ہی پڑھی جاتی ہے۔ اس کو یہ شرف حاصل ہے کہ ہر رکعت میں اسکا پڑھنا لازم کردیا گیا۔ اس لیے قرآن مجید پورا کرنے کے لیے کسی رکعت میں اس کو مکرر پڑھنا کہ فاتحہ کے بعد پھر فاتحہ پڑھی جائے نہ ضروری نہ ثابت۔

محمد کفایت اللہ کان اللہ لہ
دہلی

۷۸۶

(۹) کیا فرماتے ہیں حضرات علمائے دین و مفتیان شرع متین ادام اللہ فیوضہم مندرجہ ذیل مسائل کے متعلق

(۱)۔ ہندہ اور اس کے والدین یہ کہتے ہیں کہ ہندہ کو اس کے خاوند نے طلاق دیدی ہے لیکن شاہد کوئی نہیں۔ کیا والدین کے کہنے پر طلاق واقع ہو جائیگی۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ ہندہ کا بھائی یہ کہتا ہے کہ اس کے خاوند نے طلاق نہیں دی۔

(۲)۔ ہندہ کے والدین نے اس کا نکاح ثانی کردیا کیا یہ نکاح درست ہوگا۔

(۳)۔ اس نکاح کے بعد جو اولاد ہو گی اس کے متعلق کیا حکم ہے۔

(۴)۔ ہندہ نے نکاح ثانی کیا۔ اس کے بعد اس کے دوسرے خاوند نے اس کو طلاق دی طلاق ہو جانے کے بعد زوج ثانی کے والدین نے اپنے گھر پر عدت پوری کرائی عدت کے بعد اپنے دوسرے لڑکے سے نکاح کرا کر پھر اس سے طلاق دلوائی اور پھر اپنے پہلے لڑکے سے (جس کی زوجیت میں پہلے تھی) عقد ثانی کردیا کیا یہ جائز ہے اور اس قسم کی حرکت کرنے والے کے بارے میں کیا حکم ہے۔

(۵)- اس شخص سے قطع تعلق اور کھانا پینا بند کر دینا کیسا ہے۔

بینوا و توجروا

المستفتی (قاری) شریف احمد از کراچی (پاکستان)

مورخہ ۲۲/اگست ۱۹۵۱ء

الجواب:

ہندہ کے والدین کا قول کہ لڑکی یعنی ہندہ کو اس کے خاوند نے طلاق دیدی معتبر نہ ہو گا۔ خصوصاً جبکہ ہندہ کا بھائی طلاق نہ دینا بیان کرتا ہے۔

اگر صرف ماں باپ ہی طلاق دینے کے مدعی ہیں اور در حقیقت خاوند نے طلاق نہیں دی تھی تو دوسرا نکاح ناجائز اور حرام ہوا اور اس صورت میں اولاد بھی ناجائز ہو گی۔

لڑکے نے طلاق مغلظ دی تھی تو اس میں حلالہ کی ضرورت تھی۔ حلالہ کے لیے دوسرے لڑکے سے نکاح کر دیا اور اس سے بعد جماع کے طلاق دلوا کے پہلے لڑکے سے مکرر نکاح کر دیا تو یہ بات اگرچہ بے شرمی کی ہے مگر دوسرا نکاح جائز ہو گیا۔

کس شخص سے قطع تعلق کا حکم دریافت کرنا ہے۔ لڑکی کے ماں باپ سے یا لڑکی کے خاوند سے یا خاوند کے ماں باپ سے یا دوسرے لڑکے سے۔ ان کے احکام مختلف ہیں۔

محمد کفایت اللہ کان اللہ لہٗ

دہلی

۷۸۶

(۱۰) کیا فرماتے ہیں حضرات علمائے دین و مفتیان شرع متین ادام اللہ فیوضہم مندرجہ ذیل مسائل کے بارے میں:

(۱)- حج بدل کون شخص ادا کر سکتا ہے یعنی یہ کہ حج بدل وہی کر سکتا ہے جو حج فرض ادا کر چکا ہو اگر کوئی ایسا شخص چلا جائے جس نے حج فرض ادا نہ کیا ہو تو حج بدل ہو جائے گا یا نہیں۔

(۲)- کیا یہ مسئلہ ہے کہ اگر کوئی بچہ بچپن میں اپنے والدین کے ساتھ حج کو چلا جائے تو جب تک وہ بچہ بالغ ہو کر حج نہ کر لے والدین کا حج قبول نہیں ہوتا۔

(۳)- اگر کوئی ایسا شخص حج بدل کو چلا جائے جو بچپن میں والدین کی ساتھ حج کو گیا ہو تو حج

بدل ادا ہو گیا نہیں۔ بینوا و توجروا۔

الجواب:

(۱)- حج بدل کے لیے ایسے آدمی کو بھیجنا چاہیے جو اپنا حج پہلے کر چکا ہو کسی ایسے شخص کو جس نے حج نہ کیا ہو بھیج دینے سے بھی حج تو ادا ہو جائیگا لیکن ایسا کرنا بہتر نہیں۔

(۲)- نہیں یہ بات تو صحیح نہیں۔

(۳)- بچپن میں والدین کے ساتھ حج کو گیا تھا اس کو بھی حج بدل کے لیے بھیجنا بہتر نہیں گو حج ادا ہو جائیگا۔

محمد ضیاء الحق دہلوی

الجواب صحیح

محمد کفایت اللہ کان اللہ لہٗ

دہلی

۷۸۶

(۱۱) کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین ادام اللہ فیوضہم مندرجہ ذیل مسائل کے متعلق:

(۱)- تکبیرات تشریق تیرہ کی عصر تک ہیں اور قربانی بارہ تک۔ اہلحدیث حضرات عوام کے سامنے یہ دلیل پیش کر دیتے ہیں کہ دیکھو تکبیر کے ساتھ قربانی بھی ختم ہوتی ہے۔ حنفیہ کے پاس اس کا کیا جواب ہے۔

(۲)- عید کے موقع پر امام نماز کے بعد دعا مانگے یا خطبہ کے بعد۔

(۳)- زید نے اپنی لڑکی کا نابالغی کے زمانہ میں ہندوستان میں نکاح کیا تقسیم کے بعد لڑکی اپنی والدین کے ہمراہ پاکستان آگئی۔ لڑکی کے ورثا نے کوشش کی کہ لڑکی کا خاوند یا تو خود پاکستان آجائے یا لڑکی کو ہندوستان بلالے مگر لڑکے نے نہ تو اپنی اہلیہ کو ہندوستان بلایا نہ خود آیا مجبور ہو کر لڑکی کے والد نے پاکستان میں ایک مسلمان مجسٹریٹ کے ہاں فسخ نکاح کی درخواست دی اور نکاح ثانی کی اجازت مانگی مجسٹریٹ نے دے دی۔ کیا مجسٹریٹ کی اس اجازت پر فسخ نکاح ہو کر زید اپنی لڑکی کا نکاح ثانی کر سکتا ہے۔

(۴)- حضرت مفتی صاحب مرحوم سے ایک مرتبہ لاؤڈ اسپیکر پر نماز کے متعلق دریافت کیا تھا تو معلوم ہوا تھا کہ جمعیۃ علماء نے علماء کی ایک کمیٹی بنائی ہے وہ فیصلہ کرنے والی ہے اسکا فیصلہ ہوا یا نہیں آپ کا اس مسئلے میں کیا خیال ہے حضرت والا کی کیا رائے تھی۔
بینوا و توجروا

المستفتی قاری شریف احمد غفرلہٗ
از کراچی۔ پاکستان

الجواب:

(۱)- تکبیرات تشریق کے وقت کے بارے میں خود حضرات صحابہ کرامؓ کے اقوال مختلف ہیں۔ احناف کا عمل حضرت علیؓ کے قول پر ہے۔ وھو مارواہ ابن شیبة حدثنا حسن بن علی عن زائدة عن عاصم عن شقیق عن علی انه کان یکبر بعدالفجر یوم عرفة الی صلاة العصر من آخر ایام التشریق۔ حضرت ابن عمرؓ سے بھی ایک روایت ہے قال علی وابن عمر فی احد الروایتین عنه انتهائه من صلاة العصر من آخر ایام التشریق۔

(۲)- عید کی نماز کے بعد دعا مانگنے کا ثبوت تو بخاری شریف کی ایک روایت سے ملتا ہے۔ البتہ یہ ثابت نہیں کہ نماز سے فارغ ہوتے ہی مانگنی ہے یا خطبہ پڑھ کر۔ لہذا دونوں صورتیں جائز ہیں۔

(۳)- مسلمان عالم نے اگر نکاح فسخ کر دیا تو فسخ ہو گیا۔ میاں بیوی میں اگر یکجائی ہو چکی تھی تو فسخ کے بعد عدت لازم ہے۔ عدت گذار کر نکاح کر سکتی ہے۔ اور اگر یکجائی نہیں ہوئی تھی تو فسخ کے بعد نکاح جائز ہو گا۔

(۴)- کمیٹی نے ابھی اپنا کوئی فیصلہ نہیں دیا۔ حضرت مفتی صاحبؒ نماز میں لاؤڈ اسپیکر کے استعمال کرنے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ ہندوستان کے دوسرے علما بھی اس بارے میں محتاط ہیں۔

محمد ضیاء الحق دہلوی
مدرسہ امینیہ، دہلی

☆☆☆

نوادرِ علمیہ

بزرگان واکابر دارالعلوم دیوبند کے مختصر سوانح

حضرت مفتی اعظم کا شاہ کار و عظیم الشان قصیدہ "روض الریاحین" اور اس کا اردو ترجمہ قارئین کرام کی نظر سے گزرا۔ اس نے قلب کو منور، دماغ کو روشن اور ایمان کو تازہ کیا۔ اس قصیدے کا ایک اہم حصہ وہ تحریرات ہیں، جو قصیدہ نگار نے اس میں مذکور و مشار الیہ بزرگان واکابر علمائے دارالعلوم (دیوبند) کے سوانح میں بہ طورِ حواشی تالیف فرمائی تھیں۔ یہ تحریرات مستند حالات کے لیے حوالہ اختصار و جامعیت کی مثال اور شگفتہ اندازِ نگارش کا نمونہ ہیں۔ ان کے فاضل مرتب مولانا حافظ پروفیسر رشید احمد ارشد (استاد جامعہ کراچی) مرحوم نے جو تمہیدی نوٹ لکھا تھا، اسے شامل کیا جارہا ہے۔ البتہ پروفیسر مرحوم نے ان پر جو حواشی تحریر فرمائے تھے، چونکہ وہ حواشی قصیدے کے متعلقہ اشعار سے ماخوذ تھے اور قصیدے کے متن کے ساتھ اس کا ترجمہ بھی شامل ہے، اس لیے ان حواشی کی ضرورت معلوم نہیں ہوتی۔ اصحاب ذوق اور شائقین کے لیے مشکل نہیں کہ قصیدے میں ان اشعار کے ترجمے میں ان مطالب کو تلاش کرلیں۔ پروفیسر ارشد صاحب کی یہ کاوش قلم بینات کراچی کے ذی قعدہ و ذی الحجہ ۱۳۸۶ھ کے دو شماروں میں چھپی تھی۔

اب قارئین کرام سے گزارش ہے کہ وہ بزرگان واکابر علمائے دارالعلوم دیوبند کے سوانح مطالعہ فرمائیں۔ لیکن اس سے پہلے پروفیسر مرحوم کی تعارفی و تمہیدی تحریر سے لطف اندوز ہولیں۔ تحریر ہے:

مندرجہ ذیل نادر تحریر حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب کے نایاب عربی قصیدہ "روض الریاحین" کے حواشی سے ماخوذ ہے جو ۱۳۲۷ھ مطابق ۱۹۰۹ء میں مطبع افضل المطابع دہلی میں زیور طبع سے آراستہ ہوا تھا اور ۱۳۲۶ھ میں یہ عربی قصیدہ مدرسۂ امینیہ دہلی کے سالانہ جلسہ میں پڑھ کر سنایا گیا تھا۔ اس عربی قصیدہ میں حضرت مفتی صاحب نے مشاہیر

اساتذۂ دیوبند کے علمی اور مذہبی کارناموں کا نہایت شاندار الفاظ میں تذکرہ کیا تھاچنانچہ یہ قصیدہ اپنی فصاحت وبلاغت کی وجہ سے اس قدر پسند کیا گیا کہ حاضرین جلسہ اور مدرسہ امینیہ کے سرپرستوں نے یہ فرمائش کی کہ اسے اُردو میں ترجمہ اور مختصر حواشی کے ساتھ شائع کیا جائے ان حواشی میں ان اساتذہ دیوبند کے مختصر حالات بھی بیان کیے جائیں جن کے اسماء گرامی کا تذکرہ قصیدہ روض الریاحین میں آیا ہے۔

لہذا حضرت مفتی صاحب نے خود ان اشعار کا سلیس اور بامحاورہ اُردو ترجمہ کیا اور حواشی بھی خود اپنے قلم سے تحریر فرمائے جو مختصر ہونے کے باوجود جامع ہیں۔

یہ رسالہ شائع ہوتے ہی نایاب ہو گیا۔ مجھے بھی اپنی طالب علمی کے زمانے میں اس کا کوئی علم نہ تھا اور نہ بعد میں نظر سے گذرا۔ خوش قسمتی سے حضرت مفتی صاحب کے صاحبزادے مولانا حفیظ الرحمٰن واصف دہلوی نے مجھے مدرسہ امینیہ کی روئیداد کے ساتھ اسے بھی ارسال فرمایا۔ مطالعہ کرنے پر اس کے حواشی اُردو کی نادر تحریر اور علمائے دیوبند کے بارے میں نادر معلومات کا ذخیرہ نظر آئے لہذا برائے افادۂ عام وخاص ان اُردو حواشی کو مربوط متن بنا کر قارئین کرام کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔ مزید استفادہ کے لیے اس مضمون کے حواشی میں متعلقہ حضرات سے متعلق عربی اشعار کا اُردو ترجمہ بھی پیش کیا گیا ہے۔ ان حواشی کو ایک مربوط شکل دینے کے لیے عنوانات میں نے قائم کیے ہیں اور قوسین میں مناسب توضیح کی گئی ہے کہیں کہیں کچھ الفاظ ربط دینے کے لیے بڑھائے گئے ہیں اصل عبارت حضرت مفتی صاحب کی خود تحریر کردہ ہے۔ توقع ہے کہ یہ نادر تحریر علمائے دیوبند کے حالات کی تحقیق کرنے والوں کے لیے مستند مواد کا کام دے گی اور عوام کے لیے بھی مفید ثابت ہوگی۔ (ارشد)

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی:

مولانا ومقتدانا حضرت مولوی محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنے زمانے کے بے مثل و بے نظیر عالم تھے آپ فن مناظرہ اور علم کلام کے تو امام تھے اگر اپنے زمانہ کا ان کو امام رازی کہا جائے تو بجا ہے آپ نے مختلف مقامات میں بڑے جلسوں میں معرکہ آراء مناظرے کیے ہیں آپ جس وقت تقریر فرماتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ علوم ومعارف کا ایک سمندر ہے جو موج زن ہو رہا ہے۔ دلائل وبراہین کا پل ٹوٹ گیا ہے بڑے بڑے متبحر عالم آپ کی تقریر سن

کر دنگ رہ جاتے تھے آپ کی تصنیفات (۱) آبِ حیات (۲) تقریر دل پذیر (۳) قبلہ نما وغیرہ آپ کی قوت بیانیہ اور قوت استدلال اور وفور علم و ذہانت خداداد کی شاہد عدل ہیں علوم ظاہری میں کامل دستگاہ اور بے نظیر مہارت کے علاوہ زُہد و اتقاء اور علم معرفت میں بھی آپ اعلیٰ پایہ رکھتے تھے حضرت شیخ المشائخ جنید وقت اعلیٰ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی نے اپنے ملفوظات میں آپ کی اور آپ کے رفیق درس و برادرِ طریقت حضرت مولانا و مقتدانا مولانا حاجی حافظ شاہ رشید احمد صاحب محدث گنگوہی کی بہت تعریف کی ہے اور اپنے مریدین با اخلاص و معتقدین بالاختصاص کو تاکیدی ارشاد فرمایا ہے کہ "جو لوگ اس فقیر سے محبت و ارادت رکھتے ہیں، وہ ان دونوں بزرگوں کو اپنا بزرگ سمجھیں اور ان کی صحبت کو غنیمت جانیں اور ان سے روحانی فیض حاصل کریں یہ دونوں بزرگ اس لائق تھے کہ میں ان کا "مرید" ہوتا اگرچہ ظاہر میں معاملہ برعکس ہو گیا کہ میں ان کی جگہ اور یہ میری جگہ ہیں۔"

مولانا مرحوم و مغفور نے باوجود اعلیٰ علمی مرتبہ اور مرجع عوام و خواص ہونے کے بظاہر دنیا کی جانب کبھی توجہ نہیں فرمائی نہایت سادگی کے ساتھ زندگی بسر کی، جن لوگوں نے مولانا کی زیارت کی ہے وہ اب تک آپ کی سادگی یاد کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ ایسا باکمال اور اسقدر سادہ آدمی ہم نے آج تک نہیں دیکھا۔

مولانا محمد قاسمؒ نے واقعہ "غدر" کے بعد ہندوستان میں جہالت و گمراہی کی گھٹا چھائی ہوئی دیکھ کر بمعیت بعض اکابر،، قصبہ دیوبند میں ایک مدرسہ کی بنیاد ڈالی گو اس وقت مدرسہ کی بنیاد فقیرانہ حالت پر رکھی گئی تھی، مگر مولانا کے اخلاص نے اس کو ایسے مرتبہ پر پہنچادیا کہ ہندوستان کیا دیگر اقالیم میں بھی کوئی خالص دینی تعلیم دینے والا چندہ کا مدرسہ اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ مدرسہ دیوبند اپنے مقدس اور مخلص بانی کی خالص نیت اور مدرسین و کارکنان کی تقویٰ شعاری اور انتھک کوششوں کی برکت سے آج بھی اُفق ہندوستان پر ماہ کی طرح چمک رہا ہے کوئی شہر و قصبہ بلکہ کوئی قریہ بھی اس مدرسے کے فیض یافتوں سے خالی نہیں۔ ہندوستان کے عربی مدارس کے اکثر مدرسین اس مدرسے کے بواسطہ یا بلاواسطہ تعلیم یافتہ ہیں علم و علماء کی یہ کثرت جو مشاہدہ میں آرہی ہے، زیادہ تر اسی مدرسے سے وابستہ ہے۔

مدرسہ دیوبند کے قائم ہونے سے اکابر ہندوستان جو علمائے دیوبند سے تعلق ارادت و محبت رکھتے تھے، اشاعت علم دین کی طرف متوجہ ہو گئے چنانچہ تھوڑے ہی عرصہ میں

مدرسہ مظاہر العلوم، سہارن پور میں مدرسہ الغرباء مراد آباد میں اور مدرسہ گلاوٹھی ضلع بلند شہر میں قائم کیے اور آج تک قائم ہیں۔

ان کے بعد بہت سے مدرسے مختلف اطراف میں قائم ہوئے اور ہوتے جاتے ہیں۔ درحقیقت یہ سب مدارس بھی مدرسہ دیوبند کے نائب ہیں اور بانیان مدرسہ دیوبند کو ان مدارس کی خدمات اسلامیہ کا اجر بھی ملتا رہے گا کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے:

من سن سنة حسنةً فله اجرها واجرمن عملها ۔	جو شخص کوئی اچھا طریقہ جاری کرے تو اس کو اس طریقہ کے جاری کرنے کا اور اس پر عمل کرنے والوں کا ثواب ملے گا۔

حضرت مولانا جبکہ دینی خدمت علی وجہ الکمال انجام دے چکے تو باری تعالیٰ کے غالب ارادے اور مقدر نے آپ کو احباب و اعزہ سے ہمیشہ کے لیے جسمانی مفارقت کے ساتھ جدا کر دیا ۱۲۹۷ء میں آپ نے بمقام دیوبند وصال فرمایا۔

مزار مقدس آپ کا دیوبند میں مدرسے کے شمال مغرب تقریباً نصف میل کے فاصلے پر ایک خوش قسمت خطہ زمین میں چند درختوں کے سائے کے نیچے واقع ہے۔

اللہ اللہ آپ کی سادگی، کہ اب تک حق رفاقت ادا کر رہی ہے، مٹی کی کچی قبر، آس پاس کچا چبوترہ دنیا میں مال و متاع کے عاشقوں کی خامیٔ عقل کی گواہی دے رہا ہے باوجود ہزاروں دولت مند مریدوں اور صاحب ثروت معتقدوں کے، آپ کی قبر پر یہ سادگی کا عالم آپ کی بے نظیر متابعت شریعت کا تصرف ہے قبر پر جلال اور ہیبتِ حق کا اثر نمایاں ہے۔

آپ کے احباب و تلامذہ اشاعت دین میں سعی اور کوشش کرنے کے لیے مستعد ہو گئے اور آپ کی وصیت کو اپنے گلے میں بمنزلہ ہار کے ڈال لیا۔

مولوی امین الدین صاحب:

مولوی امین الدین صاحب مہتمم مدرسہ امینیہ اورنگ آبادی مولداً دہلوی مسکناً ۱۳۰۴ھ میں بغرض تحصیل علم دیوبند آئے اور باستثنائے آٹھ ماہ، ۱۳۱۴ھ تک دیوبند رہے ۱۳۰۷ھ میں دیوبند سے شاہ جہاں پور کے مدرسہ میں آٹھ ماہ کے لیے چلے گئے تھے۔ پھر دیوبند آکر کتابیں پوری کیں ۱۳۱۴ھ کے آخیر میں دہلی آئے اور مدرسہ (امینیہ) کی وجہ سے

دہلی میں سکونت اختیار کرلی۔

آپ مثل اپنے نام، امین، رحمدل، حقوق دوستی کی رعایت کرنے والے، صاف باطن شخص ہیں۔

سنہری مسجد (جہاں یہ مدرسہ امینیہ قائم ہے) دہلی میں ایک تاریخی یادگار اور وسط بازار چاندنی چوک میں ایک خوشنما اور فرحت بخش مقام پر واقع ہے مدرسہ قائم ہونے سے پہلے اس میں اس قدر آبادی نہ تھی شمالی جانب سڑک ہے جنوبی جانب مسجد کی تھوڑی زمین جسمیں ایک چھوٹا سا حجرہ تھا پڑی ہوئی تھی اور مشرق اور گوشۂ جنوب مشرق میں ایک شاندار بڑی عمارت شاہی زمانہ کی ہے جو اس مسجد سے متعلق تھی اور سنا جاتا ہے کہ وہ مدرسہ کے لیے مسجد سے متعلق کی گئی تھی جیسا کہ اس زمانہ میں اکثر رواج تھا کہ مسجد کے ساتھ مدرسہ بھی بناتے تھے اب اس میں کوتوالی ہے۔

جب سے سنہری مسجد میں یہ مدرسہ قائم ہوا ہے، اس وقت سے عجیب رونق ہو گئی ہے جنوبی جانب میں مدرسہ کی دو منزلہ عمارت تعمیر کرائی گئی ہے عمارت کچھ ایسے انداز سے بنائی گئی ہے کہ تھوڑی جگہ میں بہت کام نکالا گیا ہے۔ دس بارہ طالب علموں کے رہنے کے لیے حجرے بنائے گئے ہیں۔

جب مولوی صاحب نے اہل دہلی کو اشاعت علم دین کی جانب، متوجہ کیا اور از خود متوکلا علی اللہ سنہری مسجد میں پڑھانے بیٹھ گئے تو قدرت نے یہ کرشمہ دکھایا کہ دہلی کے اہل دولت میں سے نامور مخیر جناب حاجی شیخ محمد الحق صاحب اور جناب محمد الف خاں مرحوم نے مدرسہ کی اشاعت و امداد میں خاص دل چسپی لی خود بھی بیش بہار قموں سے امداد کی اور دوسروں کو بھی اس کی جانب متوجہ کیا اس سبب سے مہتمم صاحب نے ایک جلسہ منعقد فرمایا اور جناب مولوی محمد منفعت علی صاحب دیوبندی سابق صدر مدرس فتح پوری دہلوی نے کوشش کر کے جناب محمد الحق صاحب و جناب محمد الف خاں صاحب کے ساتھ اعیان دہلی کو جلسہ میں شامل کیا۔ اور پھر باتفاق رائے اہل جلسہ، حاجی محمد الحق صاحب و جناب محمد الف خاں صاحب سے مدرسہ کی سرپرستی قبول فرمانے کی درخواست کی گئی اور ان دونوں نیک نفس بزرگوں نے محض للہیت، سرپرستی قبول فرمائی۔

مدرسہ امینیہ کی تعلیم و تربیت کے متعلق فضلائے دہلی متفق ہیں کہ مدرسہ عربیہ

دہلی میں اس مدرسہ کی تعلیمی حالت بہت عمدہ ہے مولانا ابو محمد عبدالحق صاحب مصنف تفسیر حقانی نے مدرسہ ہذا کے سالانہ جلسہ میں مجمع کثیر کے روبرو فرمایا:

"میں حلفاً کہتا ہوں کہ یہ مدرسہ مدارس دہلی میں تعلیمی حالت اور طلبہ کی تہذیب و متانت، مدرسین کی لیاقت مہتمم مدرسہ کی دیانت کے اعتبار سے اعلیٰ پیمانہ پر ہے اور دہلی میں فقط یہی ایک مدرسہ ہے جس میں فتویٰ نویسی کی اعلیٰ مہتم بالشان اسلامی خدمت باقاعدہ انجام دی جاتی ہے (دیکھو روئداد مدرسہ ہذا بابت ۲۵-۱۳۲۶ھ)"

(۱) مولوی حافظ محمد ضیاء الحق بن مولوی سراج الحق ساکن دیوبند ضلع سہارن پور، جواں صالح، عالم باعمل، ذکی الطبع عابد وزاہد شخص ہیں اس مدرسہ میں ابتدائی زمانہ سے مدرس ہیں۔ بندہ عاجز کفایت اللہ اور مولوی صاحب موصوف اور مولوی محمد قاسم صاحب مدرسہ دیوبند میں دورہ حدیث میں شریک تھے اور خدائے تعالیٰ کے فضل وکرم سے مدرسہ ہذا کی خدمت میں بھی شریک ہیں یہ مجمع ہے کہ اس پر جس قدر غبطہ کیا جائے بجا ہے:

وذلك فضل الله يوتيه من يشاء و الله ذو الفضل العظيم ۔	یہ اللہ کا فضل وکرم ہے جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔

(۲) مولوی حافظ محمد قاسم بن مولوی عبدالحق دیوبندی نہایت منکسر المزاج بے تکلف، سادہ مزاج، عالم باعمل صالح وعابد ہیں، مولوی ضیاء الحق صاحب کے ساتھ ساتھ خدمت تدریس پر ۱۳۱۶ھ سے معین ہیں مولوی سید انظار حسین، ساکن سہنس پور ضلع بجنور، مدرس عربی سادگی طبیعت اور بے تکلفی میں اپنی نظیر آپ ہیں۔ نیک نفس ظریف ہیں۔

مولوی عبدالغفور صاحب ساکن دہلی کوچہ رائماں، مدرس فارسی، آپ فارسی میں مہارت رکھتے ہیں، سادہ مزاج رحمدل صوفی منش شخص ہیں۔

حافظ قاری رحمت اللہ صاحب ساکن خان پور ضلع انبالہ مدرس قرآن مجید، نیک نفس، جفاکش، صالح شخص ہیں۔

حضرت مولانا انور شاہ صاحب:

علامہ فہامہ جناب مولانا مولوی محمد انور شاہ صاحب ساکن کشمیر بے نظیر شخص ہیں

ذہن وذکاء ورع و تقویٰ میں فرد کامل مدرسہ ہذا میں ابتداء مدرس اول تھے بلکہ جیسا آئندہ شعروں میں بیان کیا گیا ہے اس شجر علم کے لگانے والے آپ ہیں کیونکہ مولوی محمد امین الدین صاحب جب دہلی تشریف لائے اور مدرسہ قائم کرنے کا ارادہ کیا تو اس وقت اُن کے پاس نہ سامان تھا اور نہ روپیہ آپ نے محض متوکلا علی اللہ سنہری مسجد میں پڑھانا شروع کیا اور مولانا محمد انور شاہ صاحب آپ کے شریک تھے دونوں صاحبوں نے طرح طرح کی تکلیفیں اٹھائیں فاقے کیے مگر استقلال کو ہاتھ سے نہ چھوڑا آہستہ آہستہ اہل دہلی کو خبر ہوئی اور لوگ متوجہ ہونے لگے یہاں تک کہ مدرسہ امینیہ اس حالت تک پہنچا جو آپ کی نظر کے سامنے ہے غرض کہ ابتدائی زمانہ کی کسمپرسی کی حالت میں مولوی محمد انور شاہ صاحب اس مدرسے کے اعلیٰ واوّل محسنین میں ہیں ان کا شکریہ ادا کرنا اور ہمیشہ ان کو یاد رکھنا اہل مدرسہ پر فرض ہے۔

مولانا نے ایک عرصہ تک مدرسہ ہذا میں درس دیا اور طلبہ کو مستفید فرمایا پھر والدین سلمہم اللہ تعالیٰ کے تقاضے اور اصرار سے وطن واپس تشریف لے گئے ۱۳۲۵ھ میں حج کو تشریف لے گئے واپسی پر دہلی میں دو ماہ قیام کیا۔ اب بھی وطن میں تشریف رکھتے ہیں خدا تعالیٰ مولانا کو تادیر سلامت رکھے اور ان کے بے نظیر علمی کمال سے لوگوں کو فائدہ پہنچائے آمین۔

مولانا مسعود احمد گنگوہی:

بعد ازاں علماء ہند کے علمی احسانات کا ذکر کرتے ہوئے مولانا مسعود احمد صاحب گنگوہی کا تذکرہ کیا ہے مخدومنا و مکرمنا حافظ مسعود احمد صاحب خلف الرشید حضرت مولانا رشید احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ محدث گنگوہی نہایت زیرک، عاقل، باوقار، صائب الرائے، متین اور طبیب حاذق ہیں، مولانا مرحوم کے متوسلین کو جب مولانا کے دیدار کا شوق غالب ہوتا ہے تو انھیں دیکھ کر دل کو تسکین دیتے ہیں آپ حضرت مولانا مرحوم کا بے انتہا ادب کرتے تھے کبھی حضرت مرحوم کے سامنے چار زانو نہ بیٹھے نہ زور سے بات کی، حق تو یہ ہے کہ قدرت نے ان کو بیٹا بھی ایسے باپ کا بنایا تھا کہ وہ جس قدر ادب کرتے، بجا تھا آپ گنگوہ ہی میں قیام رکھتے ہیں خدا تعالیٰ آپ کے دراز سایہ سے خلقِ خدا کو ظاہری و باطنی نفع پہنچائے اور تادیر سلامت رکھے۔

شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب:

حضرت مولانا و مقتدانا و مرشد نا مولوی محمود حسن صاحب دیوبندی علم کے بحر زخار، معرفت و حقیقت کے غیث مدرار (موسلا دھار بارش) تواضع وانکساری کی تصویر صحیح، مواساۃ و مہمانی میں فردِ اعظم، شیوخ ہند کے شیخ اعلیٰ، سلسلۂ روایت کے منتہی، مدرسہ عالیہ دیوبند کے مدرسِ اعلیٰ، طلبہ کے لیے میدانِ طلب کے مقصود اقصیٰ، کریم النفس، صافی السریرۃ، ذکی القلب، متوقد القریحہ (نہایت ذکی) ہیں، حضرت مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ کے تلمیذِ خاص اور حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی کے منظورِ نظر و مقربِ بااختصاص علم حدیث کے امام، قدوہ اعلام، نخبۃ الکرام، سلالۂ خاندان اتقیاء عظام۔ آپ کا وجود طالبینِ علوم کے لیے رحمت ہے۔ خاکسار کو بھی حضرت اقدس سے شرفِ تلمذ حاصل ہے خدا تعالیٰ آپ کے وجودِ باجود کو تادیر سلامت رکھے اور مستفیدین ظاہر و باطن کو آپ کے انفاسِ قدسیہ سے منتفع فرمائے (آمین)

مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری:

حضرت مولانا و مقتدانا مولوی خلیل احمد انبیٹھوی، جامع بین الشریعۃ والحقیقۃ، مظہر کمالات، منبعِ حسنات صاحب انفاس ذکیہ واخلاقِ مرضیہ، فقاہت میں اعلیٰ ملکہ، مناظرہ میں ید طولیٰ رکھتے ہیں، علوم ظاہری تفسیر حدیث وفقہ کے علاوہ ارشاد وہدایت طالبین میں بھی مصروف رہتے ہیں، حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ آپ کی جانب خاص التفات فرماتے تھے آج کل آپ مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور میں مدرسِ اعلیٰ ہیں، خاکسار کو آپ سے بھی تلمذ حاصل ہے۔ خدائے تعالیٰ آپ کو مسترشدین کے سروں پر تادیر سلامت رکھے (آمین)

مولانا عبدالرحیم رائے پوری:

مولانا و سیدنا مولوی محمد عبدالرحیم صاحب قصبہ رائے پور ضلع سہارن پور میں قیام پذیر، بے نظیر سچائی رکھنے والے، متبع حق، صاف باطن، رہنمائے طریقت، صاحب سوز وگداز، مواضع، منکسر المزاج (ہیں) ہم نے آپ کی تواضع وانکساری کی مثال نہ دیکھی اور نہ سُنی، اولیاء اللہ کی پہچان یہ ہے کہ ان کی خدمت میں جانے سے ان کی زیارت سے خدائے تعالیٰ یاد

آجائے یہ بات حضرت مولانا میں ہر کس وناکس کے مشاہدہ میں آجاتی ہے، بدعت کے دشمن، سنت کے عاشق، اشاعت کلام اللہ کے اسباب مہیا کرنے میں محو، صاحب تاثیر ہیں، حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ بسا اوقات آپ کا نام لیکر تعریف فرمایا کرتے اور حضرت موصوف کو آپ کے ساتھ ایک خاص اُنس اور وابستگی تھی آپ کا روحانی فیض بکثرت تشنہ لبانِ معرفت کو سیراب کررہا ہے۔ خدائے تعالیٰ آپ کی عمر میں برکت اور فیض میں وسعت عطا فرمائے (آمین)

مولوی احمد:

مولوی حافظ احمد خلف مولانا مولوی محمد قاسم نانوتوی بقیۃ السلف ہیں اور بلند مراتب وکمالات پر فائز ہیں وہ آج کل دیوبند کے مدرسہ عربیہ کے مہتمم وناظم ہیں۔

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی:

حضرت مولانا حافظ رشید احمد گنگوہی قدس سرہٗ امام وقت، شیخ المشائخ، جنید عصر، شبلی زماں، بخاری ومسلم دوراں، شیخ کامل، قطب الاقطاب، گنگوہ کے رہنے والے، مفسر ومتکلم، فقیہ ومحدث تھے۔ درس فقہ وحدیث میں خداداد لیاقت وذہانت کے علاوہ بے انتہا محنت وریاضت کرکے شہرۂ آفاق ہوگئے قصبہ گنگوہ آپ کی زندگی میں محطِ رجالِ افاضل بن گیا تھا، حدیث وفقہ کے درس کے علاوہ خانقاہ قدوسیہ میں پچھلے پہر رات کو سوائے نواہائے ذکر کے اور کچھ سنائی نہ دیتا تھا، علومِ ظاہرہ وباطنہ کے طالب جوق درجوق خدمت اقدس میں حاضر ہوتے اور کامیاب وبامراد جاتے۔ تقویٰ شعاری آپ پر ختم تھی۔ متوکلانہ زندگی کا آپ کی زندگی سے زیادہ عمدہ نمونہ ملنا محال معلوم ہوتا ہے۔ علماء معاصرین، کیا موافق کیا مخالف آپ کے فضل وکمال کے معترف تھے۔ "الفضل ماشهدت به الاعداء" فضیلت وہی ہے، جس کی دشمن بھی شہادت دیں۔ طالبین علوم ومعرفت کے ساتھ پدرانہ شفقت کے ساتھ پیش آتے۔ اپنے راحت وآرام پر ان کی ضروریات کو مقدم فرماتے، مہمان نوازی میں عدیم النظیر تھے۔ آپ کا فیض ہندوستان میں پھیل کر محیط اعظم سے گذر گیا جزیرۂ عرب اور بلاد دور دراز تک جا پہنچا آپ کے مریدین میں علماء اس کثرت سے ہیں کہ ان کا شمار کرنا محال ہے۔ ہندوستان کے کسی سلسلۂ طریقت میں اس کی نظیر نہیں۔ علومِ وجدانیہ میں جو بلند مرتبہ آپ

کو حاصل تھا، اس کو ناظرین حضرت قبلہ عالم مولانا حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی کی اس عبارت سے معلوم فرما سکتے ہیں جو ہم مولانا محمد قاسم صاحب کے حالات میں نقل کر چکے ہیں تمام عمر خدمتِ دین، و درسِ فقہ و حدیث و افتاء اور ارشادِ طالبین میں صرف کی۔ ہر وقت زبان پر ذکرِ خدا جاری اور قلب میں ساری (سرایت کیے ہوئے) تھا۔

مدرسہ امینیہ کی جانب بھی خاص التفات فرماتے تھے اور اکثر اس کے واسطے دعا فرماتے تھے۔ آپ کی دعا ہی کی برکت ہے کہ مدرسہ باوجود کم مائیگی تمام مدارسِ دہلی میں ممتاز ہے اور انشاء اللہ تعالیٰ ہمیشہ ترقی کرتا رہے گا آپ کے اوصاف بیان کرنا ہماری طاقت سے باہر ہے یہ چند ٹوٹے پھوٹے لفظ صرف بہ نیت ادائے واجب لکھ دیئے ہیں ورنہ کہاں ہماری عبارت اور کہاں آپ کے اوصاف و کمالات۔

مولانا رشید احمد گنگوہی نے ۸/ جمادی الثانی ۱۳۲۳ھ بروز جمعہ بوقت دوپہر مقام گنگوہ میں وصال فرمایا آپ ۱۷/۱۸/ روز بیمار رہے بظاہر سبب وصال یہ ہوا کہ ایک روز نمازِ تہجد میں آپ کے پاؤں کی اُنگلی میں کسی زہریلے جانور نے کاٹ کھایا۔ (غالباً سانپ نے کاٹا ہوگا کیونکہ آثار سے یہی ثابت ہوتا تھا) مگر آپ کو لذتِ عبادت نے اس کے ادراک سے بے خبر رکھا۔ صبح کو حاضر باشانِ خدمت نے پاجامہ اور کُرتے پر خون دیکھ کر استفسار کیا کہ "یہ خون کیسا ہے۔ فرمایا مجھے خبر نہیں اور کپڑے بدل کر نمازِ فجر کو تشریف لے گئے تین چار روز تک اس کا اثر ظاہر نہ ہوا اور اس کی وجہ غالباً یہ ہوئی کہ خون بکثرت نکل گیا تھا پھر پاؤں پر آبلے پڑنے شروع ہوئے اور زہر کا اثر ظاہر ہونے لگا چونکہ علم ازل سے اسی زہر سے آپ کی شہادت مقدر تھی، اس لیے ہر چند علاج کیا گیا فائدہ نہ ہوا۔ وفات سے تقریباً ایک ہفتہ پیشتر غفلت و بیہوشی رہنے لگی مگر باوجود غفلت ظاہری آپ کے خدا رسیدہ قلب کی بیداری دیکھیے کہ نماز کے وقت میں ہوشیار ہو کر نماز ادا فرماتے اور زبان اور انگلیوں کی ممارست (مشق) کے قربان جائیے کہ زبان سے ذکر اللہ اور انگلیاں بغیر تسبیح، تسبیح دانی میں مشغول رہتی تھیں جمعہ کے دن قبل از زوال، زبان مبارک پر سورۂ کہف جاری تھی (حضرت مولانا مولوی عبدالرحیم صاحب رائے پوری جو خدمت میں حاضر تھے، ان کا بیان ہے) دنیا سے غفلت، عالم ملکوت کی طرف محویت تھی، ہزاروں علماء و صلحاء عیادت کے لیے حاضر تھے، آتے تھے اور جاتے تھے، ہزاروں زبانیں اور دل جناب باری تعالیٰ میں آپ کے لیے دعا میں مشغول تھیں یہاں تک کہ باری

تعالیٰ کے غالب ارادہ اور اجلِ مقدر نے تاریخ مذکور پر آپ کو ہمیشہ کے لیے دارِ خلد اور جوارِ رحمت میں پہنچادیا عین اذان جمعہ کا وقت تھا کہ روحِ مقدس بارگاہِ ایزدی میں حاضر ہوئی اور آپ کی یہ تمنا کی جمعہ کے روز انتقال ہو۔ پوری ہو گئی۔

متوسلین کی بڑی جماعت، جو اسوقت گنگوہ میں موجود تھی، میدان قیامت کا معاینہ کر رہی تھی ادھر مولانا کی وفات کا پہاڑ اُن کے سروں پر گرا تھا ادھر نماز جمعہ کی تیاری تھی آخر ان برگزیدگانِ منزلِ تقرب نے صبر واستقلال سے کام لیا۔ اور حضرت کے خادم خاص، منظورِ نظر، نیک نفس، خیر محض، صلاح مجسم جناب مولانا مولوی محمد یحییٰ صاحب کاندھلوی نے نماز پڑھائی اور پھر سب حضرت کی تجہیز و تکفین میں مصروف ہوئے۔ اور اس پاک و مطہر بدن کو غسلِ مسنون دے کر شہر سے باہر نماز جنازہ ادا کی اور پھر با چشم گریاں و دلِ بریاں اس گنجینۂ علوم و کنزِ معرفت کو قبلِ مغرب، ہمیشہ کے لیے خاک میں چھپا کر خدائے عظیم و خبیر کے سپرد کر دیا۔ "فانا لللہِ و انا الیہ راجعون"

مولانا کے مرض اور وصال کے تفصیلی حالات رسالہ وصل الحبیب سے معلوم ہو سکتے ہیں آپ کی منور خوابگاہ خانقاہ قدسیہ سے بجانب جنوب تقریباً نصف میل کے فاصلہ پر ایک صاف میدان میں پلکھن کے سایہ دار درخت کے نیچے واقع ہے قبر پر حق پرستی کی ہیبت اور جلال نمایاں ہیں زائرین کے لیے اطمینان دل ہے اب اگرچہ طالبانِ رشد وہدایت یتیم ہو گئے ہیں لیکن خدائے تعالیٰ کی بے انتہا رحمت سے اب بھی امیدیں لگا رکھی ہیں کہ وہ مولانا کے فیوضِ باطنیہ سے بہرہ ور فرمائے اور مولانا کو جوارِ رحمت اور فردوسِ اعلیٰ میں تمکین فرما کر ان کی دینی خدمات کا نعم البدل عطا فرمائے آمین یاالہ لعالمین۔

حضرت مولانا اشرف علی تھانوی:

مولانا مولوی حاجی حافظ قاری محمد اشرف علی صاحب تھانہ بھون ضلع مظفر نگر کے رہنے والے اعلیٰ حضرت جناب حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی قدس سرہٗ کے ارشد خلفاء میں سے ہیں آپ نہایت جید عالم زاہد و عابد، متورع شخص ہیں، زمانہ کے نبض شناس اور اہل زمانہ کی ضروریات سے واقف۔ آپ کی تصنیفات بہت ہیں اور سب اہل زمانہ کے ضرورت کے موافق، خدائے تعالیٰ کی جانب سے آپ کی تصنیفات کو ایک خاص مقبولیت عطا ہوئی، تھوڑے زمانے میں تمام اطراف واکناف ہندوستان میں شائع ہو گئی ہیں۔

صاحبِ ارشاد و تعلیم ہیں۔ وعظ میں عدیم المثل، بڑے بڑے ماہر آپ کے وعظ کی تعریف کرتے ہیں نہایت سادہ طرز بیان اور لوگوں کی حالت کے مناسب۔ اور قلوب کے امراض کا روحانی علاج صرف آپ کا وعظ ہے، آپ کا رسالہ بہشتی زیور، جو عورتوں کی تعلیم و تہذیب اور ان کی معاشرت و تمدن کی درستی کے لیے لکھا گیا ہے واقعی اسم بامسمیٰ ہے۔ تمام ضروری مسائلِ شرعیہ کے علاوہ اس میں خانہ داری کی ضروریات بھی علی وجہ الکمال درج کیے گئے ہیں اب آپ تھانہ بھون میں دولت خانہ پر ہی مقیم ہیں البتہ بغرض ارشاد و ہدایت اکثر سفر فرماتے رہتے ہیں خدائے تعالیٰ آپ کے فیوض ظاہریہ و باطنیہ سے ہمیشہ خلق کو بہرہ ور فرمائے اور آپ کو تادیر سلامت رکھے۔ (آمین)

☆☆☆

چند نادر خطوط

حضرت مولانا امین الدین حیدر آبادی ثم دہلوی
(بانی مدرسۂ امینیہ، دہلی)
۱۸ر فروری ۱۹۱۵ء

جناب مکرم محترم!
بعد سلام مسنون، بندہ مع الخیر ہے۔ مدرسے میں خیریت ہے۔ آپ کے مکان پر خیریت ہے۔

کل چہار شنبہ کو بیمہ پارسل کی اطلاع ڈاک خانہ سے آئی تھی۔ پوسٹ مین نے کہا کہ پارسل تمھیں مل جائے گا۔ میں ڈاک خانے گیا۔ پوسٹ مین نے وہاں بیان بھی کر دیا کہ میں انھیں جانتا ہوں اور مولوی امین الدین صاحب کے پارسل اور رجسٹریاں یہ وصول کرتے ہیں۔ اور انھیں اُن کی اجازت ہے۔ مگر باوجود اس کے ڈاک خانے کے اسسٹنٹ انسپکٹر نے یہی کیا کہ پارسل نہیں دیا اور کہا یہ بات خلاف قاعدہ ہے۔ بلکہ اس نے پوسٹ مین کو بھی ڈانٹا، اب پارسل امانت ہے۔ جب آپ آئیں گے اس وقت پارسل وصول ہوگا۔ مولوی ابراہیم صاحب بھی اسی مضمون کا کارڈ میں لکھ دیا ہے۔

حضرت اقدس مولانا مدظلہم العالی کی خدمت میں خاکسار کا نیاز مندانہ سلام عرض کر کے دعا کی درخواست کریں اور جو حضرات کہ بندے سے واقف ہوں، ان سے بھی سلام فرمادیں۔ مکرمی حافظ عبد المغنی صاحب کی خدمت میں بھی سلام مسنون معروض۔

کفایت اللہ
سنہری مسجد، دہلی

حضرت مولانا اشرف علی تھانوی:

ذیل میں حضرت مفتی صاحب کے تین خط مولانا اشرف علی تھانوی علیہ الرحمہ کے نام یادگار ہیں۔ ان کے جواب میں دو خط حضرت تھانوی کے بھی درج ہیں۔ اس طرح مفتی و تھانوی مراسلت کا یہ چھوٹا سا مجموعہ بن گیا ہے۔ مفتی صاحب مولانا تھانوی سے وقت کے اہم "خلافت اور ترک موالات" کے مسئلہ پر ملک کی آزادی، خلافت اسلامیہ کے تحفظ اور عالم اسلامی میں استعمار کی ریشہ دوانیوں کے پس منظر میں مشورہ کرنا چاہتے تھے۔ اس پر حضرت تھانوی علیہ الرحمہ نے جو رویہ اختیار فرمایا اور جس ردِ عمل کا اظہار کیا، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ حضرت کو ہندوستان کے مسلمانوں اور عالم اسلامی کے اجتماعی، سیاسی اور ملی مسائل سے اور ملک کی آزادی کی تحریک سے کتنی دلچسپی تھی یا وقت کے کن ہاتھوں میں ان کے فکر و عمل اور فیصلوں کی باگ ڈور تھی یا اس پر یہ کہنا کہ وہ تحریک پاکستان کے رہنماؤں میں سے تھے، تعجب انگریز ہے۔ اور اگر پاکستان کے رہنما ایسے ہی تھے تو سوچنا چاہیے کہ وہ تحریک کب ہوئی تھی؟ حضرت شیخ الہند نے اپنے خطبۂ افتتاحِ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں جب یہ کہا تھا:

> "بہت سے نیک بندے ہیں، جن کے چہروں پر نماز کا نور اور ذکر اللہ کی روشنی جھلک رہی ہے۔ لیکن جب ان سے کہا جاتا ہے کہ خدارا اٹھو اور اس امت مرحومہ کو کفار کے نرغے سے بچاؤ تو ان کے دلوں پر خوف وہراس مسلط ہو جاتا ہے۔ خدا کا نہیں بلکہ چند ناپاک ہستیوں کا اور ان کے سامانِ حرب و ضرب کا!"

تو حضرت کے سامنے بزیلی و بدایوں یا لاہور و لکھنؤ کے کسی بزرگ کی مثال نہ تھی۔

حضرت مفتی صاحب کے خطوط کے جواب میں حضرت تھانوی علیہ الرحمہ کی ردو قدح اور اس کے پس پردہ اسلامی سیرت کو حضرت شیخ الہند کے اس بیان کی تصدیق و توثیق میں پیش کیا جاسکتا ہے!

بہر حال غور کرنے کی چیز یہ ہے کہ ۱۹۲۰ء میں ہمارے بعض اکابر جن افکار و توہمات کے اسیر اور بے عملی کی جس سمیت کا شکار تھے، آج بھی صورت کچھ اس سے زیادہ مختلف نہیں۔ لیکن یہ بات ہر کسی کے لیے الگ الگ حالات کے گرد و پیش میں سوچنے کی ہے۔ آپ حضرت مفتی صاحب اور حضرت تھانوی کی یہ تاریخی مراسلت ملاحظہ فرمایئے۔

۱۲ر دسمبر ۱۹۲۰ء

جناب محترم دامت فیوضہم!

بعد سلام مسنون۔ عرض ہے کہ عرصے سے حاضری کا ارادہ تھا۔ مگر بوجوہ پورا نہ ہو سکا۔ اب تصمیم عزم کے بعد مناسب معلوم ہوا کہ جناب والا سے اجازت حاصل کر لی جائے اس لیے یہ عریضہ ارسال خدمت ہے۔ اگر اجازت ہو تو حاضر ہوں حاضری سے غرض جمعیۃ علمائے ہند اور مسائل حاضرہ کے متعلق کچھ عرض معروض کرنا ہے۔ اس غرض کے لیے میں بلا شرکت غیرے صرف جناب سے عرض کروں گا اگرچہ میرے ساتھ ایک اور صاحب بغرض زیارت حاضر ہوں گے مگر ان کو بھی اس گفتگو میں کوئی مداخلت وشرکت کا موقع نہ ہو گا۔

محمد کفایت اللہ

جوابِ خط از حضرت مولانا تھانوی:

مکرمی سلمہ۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ الطاف نامہ نے ممنون فرمایا۔ بسر و چشم تشریف لائیے۔ مگر قبل تشریف آوری اتنا معلوم ہو جائے کہ جن امور میں آپ کچھ فرمانا چاہتے ہیں آیا صرف میرے سن لینے پر ہی کفایت فرمالیں گے یا میرے ذمہ جواب بھی ہو گا۔ والسلام۔

خاکسار اشرف علی

از تھانہ بھون، (۱۶ر دسمبر ۱۹۲۰ء)

مکتوب گرامی حضرت مفتی اعظم:

۱۶ر دسمبر ۱۹۲۰ء

مولانا المحترم دامت فیوضہم۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ

میں جناب والا کی خدمت میں جن مسائل کو پیش کرنے کے لیے حاضر ہوتا ہوں ان میں جناب والا کی رائے اقدس معلوم کرنا مقصود ہے۔ اگر میرے معروضات میں غلطیاں ہوں تو ان کی اصلاح کی توقع ہے اور اگر صحیح ہوں تو تصویب وتصدیق کی تمنا۔ صرف میں سنا دوں اور جناب کچھ نہ فرمائیں اس میں کچھ زیادہ فائدہ نہیں۔ اس لیے براہِ کرم اس صورت کی اجازت مرحمت فرمائیں۔

جوابِ خط از حضرت مولانا تھانوی:

مکرمی سلمہ !السلام علیکم ورحمۃ اللہ

الطاف نامہ کا حاصل دوامر ہیں۔ایک مسائل پیش کرنے پر احقر کی رائے معلوم ہو جانے کی غایت کا مرتب ہونا۔دوسرا میرے کچھ عرض نہ کرنے پر کسی غایت کا مرتب نہ ہونا۔سوامر اول کے متعلق یہ عرض ہے کہ خود یہ غایت محتاج غایت ہے مجھ کو اس رائے معلوم کرنے کی کوئی غایت معلوم نہیں ہوتی نہ رفع تردد نہ عمل (اور استقراء سے معتد بہ غایت یہی ہے) کیونکہ اب تک بلا تردد اپنی رائے پر عمل فرمایا گیا ہے۔اور محض تخطیہ و تصویب کوئی معتد بہ غایت نہیں۔علاوہ اس کے تخطیہ کی شق میں اگر میں نے اس پر دلیل قائم نہ کی یا قائم کی مگر آپ کا جواب نہ سنا تو گویا آپ کو اپنی تقلید پر مجبور کرنا ہوا جو جائز نہیں اور اگر اس کی بھی نوبت آئی تو مناظرہ کا رنگ پیدا ہو جائے گا جو اس وقت مضر ہے۔

اور امر ثانی کے متعلق یہ عرض ہے کہ میرے کچھ نہ کہنے کی صورت میں کیا یہ فائدہ محتمل نہیں کہ میں سن کر بطور خود اس میں غور کروں اگر شرح صدر ہو جاوے اس پر عمل کروں ورنہ ردوقدح کے سوءِ ادب سے محفوظ رہوں۔والسلام

محتاج دعا اشرف علی

از تھانہ بھون

۷ ربیع الثانی ۱۳۳۹ھ

خط حضرت مفتی اعظم:

۱۰ ربیع الثانی ۱۳۳۹ھ

مخدوم محترم دام فیضہم

سلام مسنون نیاز مشحون کے بعد گزارش ہے کہ مکرمت نامہ موصول ہوا۔میں دو تین روز تک حیران رہا کہ اس کے جواب میں کیا عرض کروں۔یعنی میرے عریضہ سابق پر جو ردوقدح ہے اس کو تقلیداً تسلیم کرلوں یا اس کا نیاز مندانہ جواب لکھ کر (خدانخواستہ غیر مفید) مناظرہ کا رنگ پیدا کروں۔بالآخر یہی مناسب معلوم ہوا کہ میں تو بنام خدا حاضری کا ارادہ مصمم کرلوں۔اور اپنی عرض معروض پر جواب دینا نہ دینا بالکل جناب والا کی خوشی پر چھوڑ

دوں۔ اگر رائے عالی میں مجھ جیسے ناکارہ کی تسکین مناسب ہو گی تو خود فرمادیں گے۔ ورنہ اپنی محرومی پر صبر کروں گا۔ واللہ الموفق۔

(کفایت المفتی، جلد نہم، ص ۵۵-۴۵۳)

یکے از نیاز مندانِ خانقاہ اشرفیہ تھانہ بھون:

حضرت مفتی اعظم کے یہ دو خط مولانا اشرف علی تھانوی کے وابستگانِ دامن سے کسی صاحب کے نام ہیں۔ اس میں مکتوب الیہ کے نام کو حذف کر کے اس کی شخصیت پر پردہ ڈال دیا گیا ہے۔ اس میں "تحذیر الناس نامی رسالہ مؤلفہ مولانا ظفر احمد عثمانی اور رسالہ ترک قربانی گاؤ" مولفہ خواجہ حسن نظامی کا ذکر ہے۔ حضرت مفتی صاحب نے نہایت احتیاط و دیانت کے ساتھ دونوں رسائل کی فتنہ انگریزیوں اور فساد آفرینیوں پر تبصرہ فرمایا ہے اور اپنے قلم کو اس بحث کی معصیت میں ملوث ہونے سے دور رکھا ہے۔

ان خطوں کا ایک ایک جملہ حکمت آفریں، سبق آموز اور عبرت انگیز ہے۔ حضرت مفتی صاحب کی مومنانہ فراست اور ان کے کمالِ تدبر کا آئینہ دار ہے۔ اسلام اور ملت کی غم گساری، قومی بہی خواہی اور ملک کی آزادی کے لیے مخلصانہ جذبات سے معمور اور عزائم کار سے لبریز ہے۔

ان خطوط کا مضمون مستغنی عن التبصرہ ہے۔ پڑھیے اور عبرت حاصل کیجئے:

مولانا المحترم دامت الطافکم:

نوازش نامہ پہنچا۔ رسالہ "ترک قربانی گاؤ" کے متعلق جو کچھ تحریر فرمایا ہے وہ دیکھا۔ مجھے بھی اس رسالے کے مضامین متعلقہ حضرت مولانا تھانوی کے پڑھنے سے سخت رنج اور قلق ہوا ہے۔ کیونکہ مضمون مذکور میں بہت سی باتیں خلاف واقع اور بہت سی خلاف شان اہل اللہ اور بہت سی دھوکا دینے والی ہیں۔ اور مجموعی طرز کلام توہین آمیز ہے۔ نہ صرف مجھے بلکہ ساری جماعت کو اس کا رنج ہے۔ اسی رنج کے ساتھ مجھے اس کا بھی بے حد قلق ہے کہ اس تمام کشمکش کی ابتدا رسالہ 'تحذیر المومنین سے ہوئی اور اس میں بلاوجہ مولانا عبد الباری اور خواجہ حسن نظامی کا نام لیکر ان کے متعلق لکھا گیا، جو لکھا گیا۔ [اس میں] اظہار حق کا مضائقہ نہ تھا لیکن نام لینے اور لکھنے کی اور ذاتیات سے تعرض کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ اور مزید بر آں وہ رسالہ خانقاہ امدادیہ سے شائع ہوا جس کے متعلق لوگوں کو یہ علم ہے کہ یہاں کی تمام

مطبوعات مولانا کی نظر سے گزرنے اور اجازت کے بعد شائع ہوتی ہیں۔ اسی طرح مجھے اس کا بے حد قلق ہے کہ اسلام کی موجودہ مصیبت ایسی عظیم الشان مصیبت ہے کہ کسی شخص کو خدا کے سامنے خاموشی کا کوئی عذر نہ ہوگا۔ بالخصوص اس حد تک کہ وہ زبان سے تغیر منکر پر قادر ہو پھر بھی جو علماء اس وقت تک ساکت ہیں اور ان کی خاموشی اعدائے اسلام کو فائدہ پہنچا رہی ہے، اس کا بھی بے حد قلق ہے۔

جناب کا یہ فرمانا کہ دہلی میں کسی نے خواجہ حسن نظامی کی تحریر کا رد لکھا یا نہیں۔ نہ لکھا گیا ہو تو میں جواب شائع کروں۔ اس کے متعلق گزارش ہے کہ تھانہ بھون سے انھیں مولوی ظفر احمد نے مختصر سا رد تو رسالہ الامداد بابت ربیع الاول ۱۳۳۹ھ میں لکھ دیا ہے اور آئندہ مفصل رد لکھنے اور شائع کرنے کا اسی رسالہ میں وعدہ کیا ہے۔ رہا یہ کہ میں رد لکھوں تو اس کے جواب میں گزارش ہے کہ میں آج کل اس کام کو دشمنان اسلام کی اعانت سمجھتا ہوں۔ جن کا مقصد یہی ہے کہ کسی طرح ہندوستان کا اتفاق ٹوٹے ہندو مسلمان لڑیں یا مسلمان مسلمان لڑیں۔ ان کی قوت کمزور ہو اور گورنمنٹ کو اپنا الّو سیدھا کرنے کا موقع ملے۔

بیشک حضرت حکیم الامۃ کے خلافِ شان الفاظ استعمال کیے جانے سے مجھے صدمہ ہے۔ لیکن یہ صدمہ ایک مسلمان کے لیے اس صدمے سے کم ہے کہ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے محترم ذرات زمین کی کفار کے ناپاک بوٹوں اور جوتوں سے توہین ہو اور حرم محترم پر گولے گریں اور غلافِ کعبہ جل جائے۔ جدہ کے باب المکہ پر نصاری گولہ باری کریں اور قسطنطنیہ پر انگریزی قبضہ ہو، سلطان اسلام شاہِ شطرنج بنا کر بٹھا دیے جائیں، فوج سے ہتھیار رکھوا لیے جائیں، سمرنا میں ہزاروں مسلمان خواتین کی عصمت دری ہو اور ہزاروں بچے یتیم اور عورتیں بیوہ ہوں اور ہم ابھی آپس کے قصوں میں ہی لڑتے جھگڑتے رہیں اور اپنی شخصیات کو مرتفع سربفلک عمارتوں کو ساتویں آسمان تک پہنچانے کی کوشش جاری رکھیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ سینے اور چولی پر آگ لگ جانے کے بعد کون عقلمند عجلت کے ساتھ اس کو بجھانے کے واسطے جھکنے کو اس وجہ سے ناجائز قرار دے گا کہ کہیں جھکنے کی وجہ سے سر کی ٹوپی گر کر عزت نہ جاتی رہے۔

میں پھر عرض کرنا چاہتا ہوں کہ تحذیر المومنین میں مولوی ظفر احمد صاحب نے میرا نام بھی لکھا اور مجھے توجہ دلائی کہ میں معاملاتِ متنازعہ میں کچھ تحریر بازی شروع کروں

لیکن میں نے بالکل سکوت کیا اور کوئی تحریر جس میں باہمی منازعت کی جھلک ہو نہیں لکھی اسی وجہ سے میں باوجود اس کے کہ "رسالہ ترک قربانی گاؤ" سے مجھے بے حد صدمہ ہوا ہے اس کے متعلق کوئی تحریر لکھنی اور شائع کرنی اور ذاتیات سے تعرض کو پسند نہیں کرتا۔

خواجہ حسن نظامی کی "بیہودگی" سے (جیسا کہ آپ نے یہ لفظ لکھا ہے) ان اعدائے اسلام کی بیہودگی ہزاروں درجہ بڑھی ہوئی ہے جنھوں نے سیزدہ صد سالہ اسلامی شوکت کو تباہ کر دیا مسلمانوں کی عزت کو برباد کر دیا۔ اماکن مقدسہ کا احترام ضائع کر دیا افسوس! صد افسوس!

آسماں را حق بود گر خون ببارد بر زمین
برزوالِ ملک اسلام وضیاعِ مسلمین

بہر حال یہ میری رائے ہے اگر جناب اور احباب کی رائے اس کے خلاف ہو تو بادب امید ہے کہ اُس سے مجھے بھی مطلع فرما کر استفادہ کا موقع عنایت فرمائیں گے۔

دیگرے از نیاز مندانِ خانقاہِ اشرفیہ تھانہ بھون:

مولانا المکرّم دامت معالیکم!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ نوازش نامہ پہنچا جناب نے "رسالہ ترک قربانی گاؤ" کے مضامین متعلقہ مولانا تھانوی پر جس صدمہ اور رنج کا اظہار فرمایا ہے اس میں یہ خاکسار بھی بوجوہ ذیل شریک ہے۔

(۱)۔ رسالہ مذکورہ میں بعض مضامین متعلقہ مولانا تھانوی بالکل غلط اور بے بنیاد ہیں۔

(۲)۔ بعض مضامین علم اور علما کی توہین کرتے ہیں۔

(۳)۔ بعض مضامین شریعت کی کسوٹی پر کھوٹے ہیں۔

(۴)۔ مجموعی طرز تحریر توہین آمیز اور زیر بحث امور سے ہٹ کر ذاتیات پر حملے کے قریب ہے۔ اگرچہ مولوی ظفر احمد صاحب نے رسالہ الامداد بابت ماہ ربیع الاول ۱۳۳۹ھ میں اس کا جواب دیا ہے اور آئندہ مفصل جواب دینے کا وعدہ کیا ہے۔ لیکن اگر آپ یا کوئی صاحب جواب دینا چاہیں تو مضائقہ نہیں۔ لیکن جو صاحب جواب دیں ان کو امور ذیل کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔

(۱)۔ جواب سے غرض محض للّٰہیت ہو عصبیت کو دخل نہ ہو۔

(۲)۔ ذاتیات پر حملہ نہ ہو۔ بلکہ نہایت ٹھنڈے دل سے مضامین کا جواب مہذب طریق سے ہو۔ اور اذا مروا باللغو مروا کراماً سے تجاوز نہ کیا جائے۔

(۳)-اس کا لحاظ رکھا جائے کہ اس ناگوار کشمکش کی ابتدا مولوی ظفر احمد صاحب کے رسالہ تحذیر المؤمنین سے ہوئی ہے۔

(۴)-زمانہ موجودہ کی اسلامی تباہی اور مسلمانوں کے مصائب اور اعدائے اسلام سے ترکِ موالات کا پہلو مرعی رہے تاکہ کسی کو یہ کہنے کا موقع نہ ہو کہ کعبۃ اللہ کی بے حرمتی ہوئی۔ روضۃ الرسول کی توہین کی گئی، خلیفۂ اسلام کی عزت خاک میں ملائی گئی سلطنتِ اسلامیہ تباہ کی گئی اور اس کے متعلق ایک لفظ نہ کہا گیا اور نہ لکھا گیا۔ اور ان کے ایک عالم (مولانا تھانوی) کے متعلق ایک شخص نے گستاخانہ الفاظ لکھ دیئے۔ تو اس قدر جوش آگیا۔ تو گویا ان لوگوں کے نزدیک مولانا کی عزت روضۂ رسول، کعبۃ اللہ، خلیفہ اسلام، اسلامی سلطنت سے بھی زیادہ ہے؟

(۵)- جمعیۃ علمائے ہند نے حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب قبلہ نور اللہ مرقدہ کے فتوے اور تمام قومی مجلسوں کے فیصلے کے بموجب اعدائے اسلام (گورنمنٹ برطانیہ) کے ساتھ ترکِ موالات کا حکم دے دیا ہے۔ اور ترک موالات کی کامیابی ہندو مسلم اتحاد پر مبنی ہے۔ حدودِ شرعیہ کے اندر رہ کر ہندو مسلمانوں کا اتفاق اور اسی طرح مسلمانوں کا باہمی اِتفاق نہایت ضروری ہے اور تمام ایسے کام جو اتحاد میں رخنہ ڈالیں گورنمنٹ کی خوشنودی کا باعث ہیں۔ اس لیے جواب لکھنے والے کو اس کا اہتمام ضروری ہے کہ وہ باہمی اتفاق کو توڑنے والا نہ بن جائے اور اپنی تحریر سے تفرقہ پیدا کرنے والا نہ سمجھا جائے۔ ورنہ وہ گورنمنٹ کا آدمی اور اعدائے اسلام کا حامی سمجھا جائے گا اور اس کی تحریر بجائے مفید اثر پیدا کرنے کے مضر نتائج پیدا کرے گی۔

بہر حال میں نے نہایت دلسوزی کے ساتھ اور اُس صدمے کی وجہ سے جو مجھ کو حالاتِ حاضرہ اور مضامین متعلقہ مولانا تھانوی کی وجہ سے ہے یہ سطریں لکھ دی ہیں۔ اور امید کرتا ہوں کہ اگر جناب کی رائے اس کے خلاف ہو گی تو اس سے مجھے مطلع فرما کر ممنون بنائیں گے۔ مجھے بے حد مشغولی کی وجہ سے بالکل فرصت نہیں ہے کہ جواب لکھنے کا ارادہ کروں۔ اور نہ اس قسم کی غیر مفید مجادلانہ بحث کو میں پسند کرتا ہوں۔ فقط

....

۲۲ر ربیع الاول ۱۳۳۹ھ

(۴ر دسمبر ۱۹۳۰ء)

(۱)

مولانا عبد الباری فرنگی محلی (لکھنؤ)

المدرسۃ العالیہ الامینیہ الاسلامیہ ،الواقعہ بدہلی (۱)

۲۷/ جمادی الاولیٰ ۱۳۴۱ھ (۲)

جناب مخدوم محترم دام فیضہم!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ مولانا محمد عبد الحلیم صدیقی کی زبانی معلوم ہوا کہ جناب والا کو کسی نے یہ خبر پہنچائی ہے کہ خاکسار اور مولانا حبیب الرحمٰن صاحب (کانگریس) کے ،اجلاس میں، باوجود اس کے کہ وہ منہیات شرعیہ سے مملو تھا، شریک ہونے اور اخبار خلافت میں اس اجلاس کے شرکاء میں مولانا حبیب الرحمٰن صاحب (۳) کا نام لکھ دیا ہے۔ میں جناب کو یقین دلاتا ہوں کہ مجھ کو اور مولانا حبیب الرحمٰن کو کانگریس پنڈال میں جانے ہی کا اتفاق نہ ہوا۔ نہ اجلاس کانگریس میں نہ اجلاس خلافت میں؟ ہمیں یہ بھی معلوم نہیں کہ کانگریس پنڈال کی وضع قطع کیا تھی؟ میں صرف خلافت کمیٹی کی سبجیکٹ کمیٹی کے دو جلسوں میں شریک ہوا، لیکن سبجیکٹ کمیٹی کے جلسے کانگریس پنڈال میں نہیں ہوئے تھے۔ بلکہ خلافت آباد کے ایک کمرے میں ہوئے تھے۔ جہاں میرے خیال میں کوئی متعذر نہیں ہوتا تھا۔

امید ہے کہ خیالِ مداہنت کو دل سے دور فرمادیں۔ فقط

خاکسار

محمد کفایت اللہ غفرلہٗ

دہلی، مدرسۂ امینیہ

جواب خط از حضرت مکتوب الیہ

آپ کا عنایت نامہ آیا خوشی ہوئی کہ آپ حضرات نے خلافِ شرع امور میں شرکت نہیں کی۔ جن لوگوں نے اپنا دیکھنا بیان کیا ہے۔ اس کی وجہ غالبًا یہ ہے کہ شیطان اکثر نیک آدمیوں کی صورت میں ظاہر ہو کر اوروں کو بدنام کرتا ہے۔

حواشی:

(۱)- حضرت مفتی صاحب علیہ الرحمہ کا حضرت مولانا عبدالباری فرنگی محلی کے نام یہ خط نقوش، لاہور، ۱۹۶۸ء خطوط نمبر حصہ دوم سے نقل کیا گیا ہے۔

(۲)- ۷-۲۷/ جمادی الاولیٰ ۱۳۴۱ھ مطابق ۱۵/ جنوری ۱۹۲۳ء

(۳)- مولانا حبیب الرحمٰن سے مراد مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی دیوبندی نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند ہیں جو جمعیت علمائے ہند کے چوتھے سالانہ اجلاس منعقدہ گیا، مورخہ ۲۴ تا ۲۶/ دسمبر ۱۹۲۲ء کے صدر تھے۔ گیا میں اس سال کانگریس (زیر صدارت سی آر داس) اور خلافت کمیٹی (زیر صدارت ڈاکٹر مختار احمد انصاری) کے سالانہ اجلاس اسی دسمبر (۱۹۲۲ء) کے آخری ہفتے میں منعقد ہوئے تھے۔ اس موقع پر کانگریس کے کسی اجلاس میں منہیات کے وقوع اور حضرت مفتی صاحب اور حضرت عثمانی کی اس میں شرکت کی حضرت فرنگی محلی کو خبر سنائی گئی تھی۔ منہیات کی تفصیل کے بارے میں خط میں کوئی اشارہ موجود نہیں۔ لیکن یہ بات عام طور پر معلوم ہے کہ مخلوط اجتماع اور لڑکیوں کا کوئی ترانہ پڑھنا یا نغمہ سنانے یا خواتین کے عام روایتی لباس کے پہناوے کے سوا جو ہندوؤں میں کوئی معیوب باتیں نہ سمجھی جاتی تھیں کوئی قابل اعتراض بات نہ ہوئی تھی۔ یہ باتیں مسلم لیگ کے اجلاس میں بھی ہوتی تھیں۔ علمائے کرام ان پر معترض بھی ہوئے تھے لیکن گوارا بھی کی جاتی تھیں۔ یقین ہے کہ حضرت فرنگی محلی سے یہ بات کسی مقتدر عالم دین نے نہ کہی ہو گی۔ یہ نکتہ چیں حضرات صرف لگائی بجھائی کرنے والے اور وسوسے ڈالنے والے تھے۔

(۲)

۱۹۲۴ء میں جو فرقہ وارانہ فسادات ہندوستان کے طول و عرض میں پھوٹ پڑے تھے۔ ان سے متاثر ہو کر گاندھی جی نے مرن برت کا آغاز کر دیا۔ فرقہ وارانہ مسئلہ ہمیشہ سے ہندوستان میں توجہ طلب رہا تھا۔ گاندھی جی کے برت نے پورے ملک کی توجہ کا اسے مرکز بنا دیا اور اس پر بہت سنجیدگی سے غور کیا جانے لگا۔ غور و فکر کے اسی نتیجے نے ایک بین المذاہب کانفرنس کا ڈول ڈالا۔ ملک کی اہم شخصیات نے اس میں حصہ لیا۔

جمعیت علمائے ہند کی جانب سے حضرت مفتی اعظم ہند مولانا محمد کفایت اللہ دہلوی اور شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی نے اس میں سرگرم حصہ لیا۔ مولانا محمد عبدالباری

فرنگی محلی لکھنوی کسی وجہ سے اس کانفرنس میں شریک نہیں ہو سکے تھے۔ وہ لکھنؤ میں تھے اور کانفرنس کے حالات جاننے کے لیے بہت بے چین تھے۔ بعض اطلاعات نے انھیں بہت متوحش کر دیا تھا۔ اس سلسلے میں انھوں نے ہر دو حضرات کو تفتیش حالات کے لیے خطوط لکھے۔ جب انھیں صحیح اطلاعات ملیں تو اطمینان ہو گیا۔ حضرت فرنگی محلی نے انھیں جواب میں جو خطوط لکھے تھے، ان سے ان کے قلب کا اطمینان بھی جھلکتا ہے اور حضرت مفتی صاحب کی خدمات کا انھوں نے اعتراف بھی کھلے دل سے کیا ہے۔

کانفرنس کی تفصیلات کے مطالعے کے لیے تو کفایت المفتی، جلد نہم، سے رجوع کرنا چاہیے کہ مولانا حفیظ الرحمٰن واصف نے ان تفصیلات کو مرتب کر دیا ہے۔ یہاں حضرت فرنگی محلی کے جواب میں حضرت مفتی اعظم کا ایک تاریخی اور یادگار خط پیش کیا جاتا ہے۔

دہلی

۱۱ر ربیع الاوّل ۱۳۴۳ھ

مولانا المحترم! دامت فیوضکم

السلام علیکم ورحمۃ، مجھے سخت ندامت اور افسوس ہے کہ میں مفصل طور پر جناب کے تاروں کا جواب اس سے قبل نہ دے سکا۔ ایک اجمالی تار ارسال خدمت اقدس کر دیا تھا۔ جناب کے تاروں سے جناب والا کا تیقظ اور اسلامی غیرت اس پائے کا ثابت ہو گیا کہ اکی نظیر ملنی مشکل ہے۔

مولانا! واقعہ یہ ہے کہ پہلے ان کے اجلاس موتمر میں خاکسار اگرچہ شریک تھا۔ مگر پہلا ریزولیوشن انگریزی میں پڑھا گیا اور اس کا اردو ترجمہ یا حاصل مطلب بیان کیا گیا۔ مگر میں حلفاً بیان کرتا ہوں کہ مجھے اس فقرے کا جو سزائے ارتداد کے متعلق ہے، اس وقت بالکل علم اور احساس نہ ہوا۔ واللہ اعلم کہ اردو میں وہ بیان سے رہ گیا یا میں نے نہیں سنا۔ تجویز پاس ہو گئی۔

دوسرے روز جناب کا تار ملا۔ اس سے مجھے فوری خیال ہوا اور میں نے پہلی تجویز کو تلاش کر کے دیکھا تو اس میں وہ الفاظ موجود تھے۔ سخت افسوس ہوا۔ اگرچہ معاملہ سب کا سب ہندوستان کے متعلق تھا۔ تاہم الفاظ میں عموم ضرور تھا۔ میں سخت کشمکش میں پڑ گیا۔ بالآخر سوائے اس کے کوئی تدبیر نہ کر سکا کہ ریزولیوشن نمبر ۴ کی تمہید میں میں نے اپنی ترمیم بہ ایں الفاظ پیش کی اور صدر صاحب کو معاملہ سمجھا کر اور ہاؤس اور اپنے بعض مہربانوں سے بحث مباحثہ

کر کے یہ الفاظ بڑھوائے کہ "ریزولیوشن نمبر ۱، میں ہندوستان کی مختلف قوموں کے تعلقات کو بہتر بنانے کے لیے جو عام اصول قرار دیے گئے ہیں۔ الخ... اب ریزولیوشن نمبر ۴ بتاتا ہے کہ ریزولیوشن نمبر ۱ کا عموم مطلقاً نہیں ہے۔ بلکہ وہ ہندوستان کے ساتھ مقید ہے اور ہندوستان سے بھی برٹش انڈیا مراد ہے۔ ہندوستانی ریاستیں بھی اس میں داخل نہیں ہیں۔ نیز جب کہ بعض ہندو مقررین کی طرف سے یہ مضمون بیان کیا گیا کہ جب تک مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے کہ وہ مرتد کو واجب القتل سمجھتے ہیں اور گویا قتل کرتے رہیں گے اس وقت تک ہندو مسلمانوں میں نباہ نہیں ہو سکتا۔ میں نے بھرے مجمع میں اس کا جواب دیا کہ بیشک اسلام میں مرتد کی سزا قتل ہے اور ارتداد اسلام کے نزدیک ہولناک گناہ اور بدترین جریمہ ہے اور یہ اسلام کا ایک کھلا ہوا روشن اصول ہے۔ میں اسکے ظاہر کرنے میں اور بیان کرنے میں کسی قسم کا تامل نہیں کرتا۔ مگر یہ کہنا کہ ہندوستان کے فسادات اس عقیدے کے نتائج ہیں اور مسلمان اس لیے ہندوؤں سے لڑتے ہیں کہ ان کے ارتداد یا اشاعت ارتداد کی سزا دیں، غلط ہے۔ اس لیے کہ جیسا یہ اسلام کا مستحکم اصول ہے کہ ارتداد کی سزا قتل ہے۔ اسی طرح یہ بھی اسلام کا اصول ہے کہ اس سزا کو جاری کرنے کا اختیار سلطانِ اسلام کو ہے۔ بس موجودہ حالات میں ہندوستان میں مرتد کی سزا قتل ہونے سے کوئی تعلق نہیں۔ جس طرح تمام حدود اور قصاص یہاں جاری نہیں، اسی طرح مرتد کی سزا بھی جاری نہیں اور نہ مسلمان اس پر قادر ہیں۔

اس پر مولانا ابوالکلام صاحب نے فرمایا۔ "سوراج کے بعد کیا ہوگا؟ میں نے کہا: "سوراج کے بعد واضعان قانون کے اختیارات کی جو نوعیت ہو، اس کے مطابق فیصلہ ہوگا۔ اگر سوراج کے بعد اسلامی قانون کی ترویج کا کوئی موقع ہوا تو یقیناً اس کے موافق احکام جاری ہوں گے اور نہ ہوا تو حالت جس کی مقتضی ہو گی، وہ ہوگا"۔

تبلیغ کے متعلق میں نے صاف صاف کہہ دیا: "اسلام کی بنیاد تبلیغ پر ہے اور اس کے ضمیر میں تبلیغ داخل ہے۔ وہ ایک کھلا ہوا تبلیغی مذہب ہے۔ اس کا دروازہ تمام دنیا کے لیے کھلا ہوا ہے۔ اور اس کے دامن کے نیچے تمام بنی آدم آسکتے ہیں۔ اس کو حق تبلیغ سے کوئی نہیں روک سکتا۔ اور ہندوستان کی موجودہ فضا میں مسلمانوں کو بھی یہ موقع نہیں کہ وہ کسی کو تبلیغ سے روک سکیں۔ ہاں! جس طرح اسلام کی تبلیغ جبر و اکراہ، اطماع و خداع وغیرہ سے پاک ہے۔ اسی طرح سبھی ان ذمائم سے علیحدہ رہ کر صرف تبلیغ کر سکتے ہیں۔ یہ ذمائم دراصل تبلیغ مذہب

کے لیے نہیں، بلکہ اغراض نفسانی کے لیے کام میں لائے جاتے ہیں"۔

ان مضامین کو میں نے بھرے مجمع میں پوری بلند آہنگی اور وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا۔ حتیٰ کہ سوامی شردھانند اور پنڈت مدن موہن مالویہ وغیرہ بڑے بڑے ہندوؤں نے بھی کہہ دیا کہ اب ہمیں کوئی اعتراض نہیں"۔ہاں! پنڈت رام چندر جی نے کہا کہ کیوں صاحب! اگر سلطان اسلام کے حکم کے بغیر کوئی مسلمان مرتد کو قتل کر دے تو اس کی کوئی سزا ہے؟ میں نے کہا: "ہاں! وہ "افتیات علیٰ السلطان' کے جرم کا مرتکب ہے اور اس کی سزا بادشاہ کی رائے پر ہے"۔

ہاں! مفتی محمد صادق قادیانی نے کہا کہ اسلام میں مرتد کی سزا قتل نہیں ہے۔ بلکہ اسلام ہر شخص کو ضمیر کی آزادی دیتا ہے۔ اس پر مولانا حسین احمد نے نہایت بلند آہنگی سے اور میں نے بھی کہہ دیا کہ "یہ آپ کی رائے ہے، اسلامی اصول نہیں۔ اسلام میں بیشک مرتد کی سزا قتل ہے"۔

مولانا! ایک ہفتے تک رات دن معاملات کو سلجھانے اور حقوقِ اسلامیہ و قومیہ کی حفاظت کی غرض سے کام کرنے میں جن دقتوں کا سامنا ہوا، اس کا بیان مشکل ہے۔ جن حضرات نے دیکھا ہے، وہی اندازہ کر سکتے ہیں۔ میں صرف اس قدر عرض کر سکتا ہوں کہ میری شرکت شخصی حیثیت سے تھی اور اس کی تصریح بھی کر دی گئی تھی اور میں نے اپنی عقل فاتر و فہم قاصر اور اپنی بساط کے موافق مذہبی اور قومی حقوق کی حفاظت میں کوئی فروگزاشت نہیں کی۔ اپنوں سے بھی اور غیروں سے بھی پوری نبرد آزمائی ہوئی۔ ہاؤس میں تقریراً اور بحثاً ہر طرح حقوق کی حفاظت کی۔ مطمح نظر صرف یہ تھا کہ ہندوستان میں آپس کا نفاق اور جنگ و جدل بند ہو اور ہر فریق اپنی جگہ اپنے فرائض مذہبی میں آزاد ہو اور دوسروں کے لیے رکاوٹ نہ ڈالے۔ ہندوستان کی موجودہ حالت میں یہی ہماری پوزیشن ہے۔ اور اسی کو پیش نظر رکھ کر تجاویز مرتب کی گئی ہیں۔ باوجود اس کے اگر مجھ سے کوئی غلطی یا فروگزاشت ہوئی ہو تو میں اس کے اعتراف کے لیے تیار ہوں۔ امید کہ جناب والا دعا سے فراموش نہ فرمائیں گے۔

خاکسار

محمد کفایت اللہ غفرلہٗ

جواب خط از مولانا عبدالباری رحمۃ اللہ علیہ:

مولانا المحترم السلام علیکم

گرامی نامہ آیا۔ کاش! میرے تار کے جواب میں فوراً کوئی اطمینان بخش جملہ آجاتا تو مجھے تین چار دن تک بے اطمینانی نہ رہتی اور مزید اصرار کی ضرورت نہ ہوتی۔

اس میں شک نہیں کہ جناب نے پوری سعی فرمائی اور اپنے فرائض کو بہت خوبی سے انجام دیا۔ یہ واقعات جو جناب نے تحریر فرمائے، مجھے معتبر ذرائع سے معلوم ہو چکے ہیں۔ میرے نزدیک کوئی ادنیٰ لغزش جناب سے نہیں ہوئی۔ علام الغیوب اگر کسی غلطی سے واقف ہو تو اس کے رحم کا مقتضی ہے کہ معاف فرمائے۔ مسلمانوں کو تو آپ کا شکریہ ادا کرنا واجب ہے۔ والسلام

فقیر

محمد عبدالباری عفا اللہ عنہ

(کفایت المفتی: ج۹، ص ۶۲-۳۵۸)

☆☆☆

مولانا محمد عرفان ایڈیٹر الجمعیۃ دہلی:

اک دفعہ اخبار سہ روزہ الجمعیۃ (دہلی) میں ایک تصویر والا اشتہار چھپ گیا۔ حضرت مفتی صاحب نے فوراً ایڈیٹر الجمعیۃ کو خط لکھا۔

دہلی،

مولانا ابو المعارف محمد عرفان صاحب مدیر الجمعیۃ!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

اخبار الجمعیۃ میں دو اشتہاروں میں تصویریں چھپی ہیں۔ تصویر بنانا چھاپنا جائز نہیں۔ بالخصوص جمعیت کا اخبار ایسی چیزوں سے ملوث نہ ہونا چاہیے۔

(محمد کفایت اللہ غفرلہٗ)

(۱) الجمعیۃ کے مدیر نے ۲۶ر اگست ۱۹۲۵ء کے اخبار میں اپنی معذرت چھاپ دی تھی۔

(۱)

مولانا سید سلیمان ندوی:

کوچہ چیلان دہلی

۱۰ر اکتوبر ۱۹۲۸ء

مولانا المحترم دام فضلہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ مکرمت نامہ نے مشرف فرمایا، مولانا مسعود علی صاحب سے لکھنؤ میں ملاقات ہوئی تھی، اور صاحبزادی کی علالت کی خبر بھی معلوم ہوئی تھی، اور جناب کے لکھنؤ تشریف نہ لانے کا سبب معلوم ہوا تھا۔ میں بچی کی حالت دریافت کرنے کے لیے خط لکھنے کا ارادہ ہی کرتا رہا، ہجوم افکار نے موقع نہ آنے دیا کہ جناب کے مکرمت نامہ سے خیر وعافیت معلوم ہو کر اطمینان ہو گیا۔ والحمد للہ علیٰ ذالک

لکھنؤ کے اجتماعات میں آپ کی عدمِ شرکت کو میرے دل نے خاص طور پر محسوس کیا، مگر مشیت یوں ہی تھی۔

اب ڈاکٹر انصاری اور مولانا شوکت علی صاحب میں اختلاف ہو گیا جو خلافت کے

صفحات میں ملاحظہ فرماتے ہوں گے۔

اس میں شبہ نہیں کہ آل پارٹیز کانفرنس کو کامیاب بنانے میں ڈاکٹر صاحب کا رویہ مسلمانوں کے ساتھ غیر ہمدردانہ تھا۔ اور نہرو رپورٹ میں مسلمانوں کے مفاد کے لحاظ سے خامیاں ہیں۔ جمعیۃ علماء کی مجلس عاملہ نے ایک سب کمیٹی بنائی ہے جو رپورٹ پر مفصل تبصرہ کرے گی، حتی الامکان ہم تو نہایت احتیاط سے قدم اٹھا رہے ہیں، امید کہ جناب بھی مفید مشوروں سے رہنمائی فرمائیں گے۔

منجن کے استعمال سے غالباً فائدہ محسوس ہوا ہو گا، اگر فائدہ ہو تو اطلاع فرمادیں کہ اور بھیجدیا جائے۔ آج کی ڈاک میں ایک مطبوعہ عربی نظم جو آج سے دس بارہ سال پہلے کی لکھی اور چھپی ہوئی ہے، بغرض ملاحظہ ارسال خدمت کی گئی ہے۔ شاذونادر کبھی ضرورت ہوتی ہے تو الٹے سیدھے دس پانچ شعر موزوں کرلیا کرتا ہوں، اردو فارسی میں بھی اقل قلیل کچھ کچھ کہا ہے، اردو کے چند شعر روداد مدرسہ میں چھپے ہیں، وہ بھی ارسال خدمت ہے۔

میں باوجود سعی اور شاہجہاں پور کے اسٹیشن سے گزر کر لکھنؤ جانے کے بھی ابھی تک شاہ جہاں پور نہ جاسکا اس لیے ابھی یکسوئی نہ ہوئی، کوشش کر رہا ہوں کہ جلد سے جلد جاکر معاملہ کو طے کردوں۔ یقین فرمایئے کہ امکانی عجلت سے کام لوں گا۔ والامر بید اللہ۔ اور ابھی تو مہینہ بھی پورا نہیں ہوا، ۱۴/ اگست کو میں آپ سے جدا ہوا ہوں۔ ارکان دارالمصنفین کی خدمات مبارکہ میں میرا اور مولانا احمد سعید صاحب کا سلام مخلصانہ عرض ہے۔ حکیم صاحب سے سلام فرمادیں۔

محمد کفایت اللہ غفرلہٗ

(۲)

۸/ جون ۱۹۲۹ء

جناب محترم دام فضلہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، گرامی نامہ موجب امتنان واطمینان ہوا، کیا براہ کرم اس شعر کے معنی پر روشنی ڈالیں گے۔

یستصغر الخطر الکبیر لوفدہ

وبطن وجلۃ لیس یکفی شاربا

نیز بچے کے معالج سے درخواست کی جائے کہ ایسا کوئی مقوی نسخہ تجویز فرمادیں کہ اس کے بعد کسی دوسرے طبیب کی امداد کی حاجت نہ ہو۔

ندوۃ العلما کے کلاس حدیث و تفسیر کے پرچہ ہائے امتحان کے لیے جو ارشاد فرمایا گیا ہے، میں باوجود اپنی بے بضاعتی کے تعمیل ارشاد کے لیے حاضر ہوں، انشاءاللہ دونوں پرچے ۲۰ رجون تک ارسال خدمت کروں گا۔

صغرسنی کی شادی کے متعلق جس وقت کمیٹی شہادتیں لے رہی تھی، اتفاق سے میری شہادت کی کوئی صورت نہ ہو سکی، میں اس زمانے میں سورت راندیر میں تھا، تاہم میں نے ایک مفصل تحریر مولوی محمد یعقوب صاحب کو بھیج دی ہے، کہ وہ رپورٹ لکھتے وقت اسے پیش نظر رکھیں اور جہاں تک ان کے امکان میں ہو اس کی رعایت مرعی رکھیں۔ اگر ارشاد عالی ہو تو اس تحریر کی نقل بغرض ملاحظہ خدمت مبارکہ میں بھیج دی جائے۔

مولانا احمد سعید صاحب سے پیام ہمایونی کہہ دیا جائے گا۔ مگر چھپ گئی یا چھپ گئی اور نکل گئی اور نکل گئی کے معنی کی دو صورتیں میرے نزدیک تو تقریباً برابر ہی ہیں، شاید کوئی مخفی اشارہ ہو، جسے آپ اور مولانا احمد سعید صاحب ہی سمجھیں تو وائے بر من محروم الذوق۔

مولانا اتنا اور عرض کردوں کہ امتحان کے پرچوں کے بنانے میں میرا رویہ ہمیشہ سے بے حد نرم ہے، اگر کوئی خاص ہدایت فرمانی چاہیں تو بواپسی ڈاک لکھ بھیجیں تاکہ اس کی رعایت رکھوں۔

امید کہ مزاج اقدس بخیر ہوگا۔ رفقائے دارالمصنفین کی خدمت عالیہ میں سلام مسنون عرض ہے۔ جناب حکیم محمد اسحاق صاحب سے سلام فرمادیں۔

محمد کفایت اللہ غفرلہٗ

محمد عبداللہ خویشگی (خورجوی):

جناب مولانا عبداللہ خویشگی نے دو حصوں میں مشاہیر علم وادب کے علمی، ادبی، سوانحی اور متفرق خطوط کے جمع وترتیب اور اشاعت کا ایک منصوبہ بنایا تھا۔ اس کا صرف پہلا حصہ "بوستان قلم" کے عنوان سے ۱۹۶۲ء میں شائع ہو سکا تھا۔ اس مجموعے کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے تمام خطوط فاضل مرتب نے اس مجموعے کے لیے مکتوب نگاروں کے حالات وسوانح میں بالاصرار لکھوائے تھے۔ اس میں دو خط حضرت مفتی اعظم کے بھی یادگار ہیں۔ یہ

علمی تبرک یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

(۱)

اخی المحترم جناب محمد عبداللہ خاں صاحب خویشگی دام مجدکم!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

جناب کے استفسارات کا جواب عرض کرتا ہوں۔

☆ میرا سنِ ولادت غالباً ۱۲۹۳ھ ہوگا، جو ضبط تحریر میں تو نہیں لیکن میری عمر کے اس تخمینے کے تحت ہے جو میں نے کیا ہوا ہے۔

☆ میں ۱۳۱۵ھ میں دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہو کر نکلا ہوں۔

☆ میرا وطن شہر شاہجہاں پور ہے جو یوپی کی قسمت روہیل کھنڈ کا ایک قدیم شہر ہے۔

☆ اور اب چالیس سال سے دہلی میں قیام ہے اور تقریباً دہلی ہی وطن بن چکی ہے۔

حضرت مخدوم محترم مولانا عبدالرحمٰن صاحب کا مزاج گرامی کیسا ہے اور وہ کہاں تشریف فرما ہیں۔ خورجہ میں تشریف فرما ہوں تو میرا سلام عرض کردیں اور حضرت والدہ ماجدہ محترمہ کی خدمت میں بھی، بھائیوں سے بھی سلام فرمادیں۔

(مہر ڈاک خانہ ۲۲؍ ستمبر ۱۹۴۲ء) محمد کفایت اللہ کان اللہ لہٗ

(۲)

کشمیری دروازہ، دہلی

۱۷؍ ذی قعدہ، ۱۳۶۵ھ۔ (۱)

جناب محمد عبداللہ خان صاحب خویشگی دام مجدہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کے خط سے حضرت مولانا مولوی مفتی محمد عبدالرحمٰن خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے وصال کی کیفیت معلوم ہوئی سخت صدمہ ہوا، حضرت مولانا بزرگوں کی جماعت کے ایک ممتاز رکن تھے اور آپ کا وجود خیر وبرکت کا مظہر تھا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

حق تعالیٰ مرحوم کو جنت الفردوس عطا فرمائے۔ آمین! حضرت والدہ صاحبہ محترمہ کی خدمت میں بھی میرا سلام اور تعزیت مسنونہ عرض فرمادیں۔

محمد کفایت اللہ کان اللہ لہٗ

(۱) ۱۷ ذی قعدہ مطابق ۱۲/اکتوبر ۱۹۴۶ء

نامعلوم:

کسی شخص نے اخباری خبر کے حوالے سے دریافت کیا تھا کہ آیا یہ درست ہے کہ حضرت مفتی صاحب کا جمعیت علمائے ہند سے اختلاف ہو گیا ہے اور وہ جمعیت سے الگ ہو گئے ہیں؟ اور یہ کہ انھوں نے مسلم لیگ کو اچھا کہا ہے اور مسلمانوں کو اس میں داخل ہونے کا مشورہ دیا ہے؟ اس قسم کا پروپگنڈا مسلم لیگ اس زمانے میں زور شور کے ساتھ کر رہی تھی۔ حضرت مفتی صاحب نے سائل کو جواب دیا تھا، وہ مولانا محمد ضیاء الحق صاحب نے اپنے ایک بیان کے ساتھ اخبارات کو بھیج دیا تھا۔ ذیل میں حضرت مفتی صاحب کا یہ جواب زمزم۔ لاہور مورخہ ۲۹/اکتوبر ۱۹۴۵ء کے حوالے سے نقل کیا جاتا ہے۔

دہلی

جناب مکرم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

میں جمعیت العلماء کا خادم اور اس میں شریک ہوں۔ جو الفاظ آپ نے تحریر فرمائے ہیں کہ سائل کے الفاظ یہ تھے:

"جناب نے کسی اجلاس میں یہ فرمایا تھا کہ مسلم لیگ ایک بہتر جماعت ہے اور اس میں مسلمانوں کو شرکت کرنا چاہیے"۔

وہ الفاظ میں نے نہیں کہے۔ یہ کسی نے میرے ذمے جھوٹ باندھا ہے۔ مسلمانوں کو جمعیت علمائے ہند کی شرکت اور اس کے کاموں میں امداد کرنی چاہیے

محمد کفایت اللہ کان اللہ لہٗ

مولانا محمد ضیاء الحق، مدرسۂ امینیہ، دہلی:

مولانا ضیاء الحق نے کانگریس کی ممبری کے بارے میں حضرت مفتی صاحب سے ایک صراحت اور خود ممبر شپ اختیار کرنے کے بارے میں مشورہ طلب کیا تھا۔ حضرت مفتی صاحب کا جواب ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

دہلی

جناب محترم دام مجدہم!

بعد سلام مسنون۔ میں کانگریس کا ممبر نہیں ہوں۔ مگر مسلمانوں کی شرکت اور ممبری جائز سمجھتا ہوں۔ بہت سے جمعیت العلماء کے ممبر کانگریس کے ممبر ہیں۔ مولانا حسین احمد بھی ممبر ہیں۔ اور جو مسلمان کانگریس میں شریک ہوں اور ممبر بن جائیں۔ ان کے لیے یہ جائز اور بہتر ہے۔

کانگریس ہندوستان کی مشترکہ قومی جماعت ہے۔ اس میں سب ہندوستانیوں کو شریک ہونا جائز ہے اور کام کرنا مفید ہے۔

(مفتی اعظم) محمد کفایت اللہ کان اللہ لہٗ (۱)

(۱) سہ روزہ زمزم، لاہور، ۳۲ر دسمبر ۱۹۴۵ء

نامعلوم

کسی صاحب نے جناح صاحب کے بارے میں اور چند دیگر سؤالات حضرت مفتی صاحب سے دریافت کیے تھے اور مفتی صاحب نے ان کے مفصل جواب دیئے تھے۔ کسی دوسرے صاحب نے مفتی صاحب کے خط اور جوابات کو دیکھا تو اس کا خلاصہ کر کے مفتی صاحب کو بھیجا اور ان کی تصدیق اور تفصیل کی خواہش ظاہر کی۔ مفتی صاحب نے ان کی تیار کردہ تلخیص کی تصدیق نہیں فرمائی۔ البتہ انھیں ذیل کا مفصل خط لکھ دیا۔

دہلی، ۵، ۱۹۴۵ء

جناب مکرم!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

مجھے یاد نہیں کہ یہ سوالات میرے سامنے کبھی آئے تھے اور میں نے ان کے جوابات لکھے تھے۔ اگر جواب لکھے ہوں گے تو غالباً جواب میں کسی قدر تفصیل ہو گی۔

مسٹر جناح کے حقیقی خیالات تو فی الحقیقت مجھے معلوم نہیں مگر ان کے ظاہری طرزِ عمل کا اسلامی طرز عمل کے موافق نہ ہونا آفتاب سے زیادہ ظاہر ہے۔ ان کا فرقہ شیعہ سے ہونا بھی یقینی ہے۔ وہ ایک تعلیم یافتہ شخص ہیں۔ ان کی تعلیم و تہذیب یوروپ کی تعلیم و تہذیب ہے اسلامی تعلیم و تہذیب سے اس کا علیحدہ ہونا کھلی ہوئی روشن بات ہے۔

غیر مسلم کو اسلامی حقوق کا محافظ نہیں قرار دیا جاسکتا۔ یہ صحیح ہے، مگر یہ کس مسلمان نے کہا ہے کہ غیر مسلم اسلامی حقوق کے محافظ ہیں! کانگریس میں مسلمان اپنے حقوق

کی حفاظت خود کریں گے۔ وہ ہندوؤں سے تو اسلامی حقوق کی حفاظت کی خواہش نہیں کرتے!

یہ صحیح ہے کہ مسلمان پہلے مسلمان ہے۔ بعد میں کانگریس یا مسلم لیگی یا کوئی اور!

مسٹر جناح قانون کے ماہر ہیں، مگر انگریزی قانون کے، نہ کہ اسلامی قانون کے، اور انگریزی سیاست کے نہ کہ اسلامی سیاست کے؟ کیوں کہ انھوں نے اسلامی قانون اور اسلامی سیاست کی مہارت تو درکنار ابتدائی درجہ بھی حاصل نہیں کیا۔

محمد کفایت اللہ کان اللہ لہٗ

دہلی

مولوی خلیل الرحمٰن ابن حضرت مفتی اعظم ہند (دہلی):

حضرت مفتی اعظم کے چھوٹے بیٹے مولوی خلیل الرحمٰن جو گورنمنٹ آف انڈیا کے سپلائی ڈپارٹمنٹ دہلی میں ملازم تھے، ۱۹۴۷ء کے ہنگامہ خیز حالات سے مجبور ہو کر پاکستان آگئے تھے۔ ان کے نام حضرت مفتی صاحب کا ایک یادگار خط ہے۔

ایون جونز نے مشاہیر عالم کے خطوط کا ایک مجموعہ بہ ایں ادعا مرتب کیا تھا:

"تاریخ عالم کی مشہور و معروف ہستیوں کے قلم سے نکلی ہوئی ان تحریروں کا ایک نادر مجموعہ جن کی تخلیق میں قلب انسانی کا خلوص فطرۃ کارفرما رہا ہے۔ ان کے ہر ورق پر حکمت و دانش کے جواہر ریزے جگمگا رہے ہیں اور ہر سطر سے زندگی کی جھلکیاں نمودار ہیں"۔

یہ مجموعہ ہلال احمد زبیری مرحوم سابق اسسٹنٹ ایڈیٹر الجمعیۃ، دہلی و رکن مجلس عاملہ جمعیت علمائے ہند جو بعد میں سہ روزہ انصاری، دہلی کے مدیر مسئول ہو گئے تھے۔ نیشنلسٹ تحریک کے اہم رکن تھے، ۱۹۴۷ء میں حالات سے مجبور ہو کر پاکستان آگئے تھے اور ایک نئی زندگی شروع کی تھی۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کی کئی کتابوں کے تراجم ان کے قلم سے یادگار ہیں۔

زبیری صاحب نے ایون جونز کی تالیف کا ترجمہ کیا اور تہذیب و تزئین اور بعض اہم اضافات سے ایک نہایت دلچسپ اور مفید تالیف بنا دیا جو "پیارے بیٹے، پیاری بیٹیاں (بیٹوں اور بیٹیوں کے نام باپوں کے خط)" کے نام سے شیخ غلام علی تاجران و ناشران کتب۔ لاہور نے

۱۹۶۶ء میں شائع کیا تھا۔ مولوی خلیل الرحمٰن کے نام ان کے والد گرامی حضرت مفتی صاحب کا یہ یادگار خط اسی مجموعے سے ماخوذ ہے۔ زبیری مرحوم نے اس خط پر ایک نوٹ بھی لکھا ہے۔ خط کے ساتھ یہ تاریخی نوٹ بھی یہاں محفوظ کر دیا گیا ہے۔

زبیری صاحب مرحوم ہمارے بزرگ تھے، ہم نے ان کے افکار سے اپنے آئینہ خانہ قلب و ذہن کو سجایا ہے، ہم ان کے احسانات کو بھول نہیں سکتے۔ ان کی خدمات کے معترف ہیں۔ یہ خط انھوں نے مولوی خلیل الرحمٰن سے لیا تھا۔ اب یہ نادر خط کہاں ہے، پتا نہیں چل سکا۔ زبیری مرحوم کے قلم سے خط پر یہ نوٹ ہے:

"۱۹۴۷ء میں تقسیم کے وقت ہندوستان میں جو خوں چکاں فسادات ہوئے، انھوں نے لاکھوں مسلمانوں کو ہجرت کر کے پاکستان آنے پر مجبور کر دیا۔ ماں، باپ، بیٹے، بیٹیاں اور بھائی بہن ایک دوسرے سے اس طرح جُدا ہوئے جیسے گوشت کو ناخن سے جدا کیا جائے۔ مولانا مفتی محمد کفایت اللہ جو ایک جید عالم اور فقیہہ تھے اور ہندوستان کی آزادی کے لیے قید و بند کے مصائب برداشت کر چکے تھے، ان کے چھوٹے بیٹے خلیل الرحمٰن بال بچوں کے ساتھ پاکستان آگئے تھے اور خود مفتی صاحب دہلی میں رہ گئے ذیل کا خط اسی زمانے میں مفتی صاحب نے اپنے محبوب بیٹے کو تحریر فرمایا تھا۔ اس میں بیٹے اور دیگر متعلقین کی صحت اور آرام و آسایش کے متعلق جو جچے تلے الفاظ لکھے ہیں، ان سے جذبات پر مکمل قابو کے باوجود اندرونی اضطراب صاف ظاہر ہو رہا ہے۔ اسی طرح دلّی کی ویرانی کا نقشہ جن چند الفاظ میں کھینچا ہے، وہ بہت جامع ہے"۔

خط کے خاتمے پر بھی زبیری صاحب نے چند سطریں تحریر فرمائی تھیں۔ مناسب ہوگا کہ ان کو بھی یہیں نقل کر دیا جائے: یہ سطریں یہ ہیں:

"مشکلات و مصائب کا ابتدائی دور جو پاکستان آنے والے بے شمار مہاجرین پر گزرا، وہ خلیل الرحمٰن پر بھی گزر گیا۔ مگر اس خط کو وہ اب بھی گراں قدر یادگار کی طرح محفوظ رکھے ہوئے ہیں۔ مفتی صاحب کا انتقال دہلی میں ۳۱ر دسمبر ۱۹۵۲ء کو ہو گیا"۔

اب قارئین کرام حضرت مفتی صاحب کا یہ یادگار اور تاریخی خط ملاحظہ فرمائیں:

۱۶ر نومبر ۱۹۴۷ء

نور چشم خلیل الرحمٰن سلمہ،

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

تمہارا لفافہ مورخہ ۳ر نومبر، ۱۳ر نومبر کو ملا۔ اس سے پہلے ایک اور خط ملا تھا۔ میں تم کو خط لکھ چکا ہوں۔ تمہارا تار بھی ۱۲ر نومبر کو ملا تھا۔ کل ایک کارڈ حفیظ الرحمٰن کے نام دکان کے پتے سے مورخہ ۹ر نومبر ملا تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ اب طبیعت اچھی ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ اس نے صحت عطا فرمائی۔ امید ہے کہ اب ڈیوٹی مل گئی ہوگی۔ ابھی تو کراچی جانے والا گھر میں سے کوئی نہیں کہ اس کے ہاتھ تمہارے کپڑے اور دوسرا سامان روانہ کیا جائے۔

میں نے پہلے خط میں لکھا تھا کہ محلہ کھڈہ کراچی میں مدرسہ اسلامیہ ہے۔ اس میں مولوی محمد صادق صاحب مہتمم ہیں۔ ان سے ملاقات کر کے میرا اسلام پہنچاؤ اور مکان کی ضرورت ہو تو ان سے ذکر کرو۔ اگر ان کے امکان میں ہوگا تو کرائے کا کوئی مکان مل جائے گا۔

گاڑیاں چلنی شروع ہوئی تھیں مگر کل سے پھر آٹھ نو دن کے لیے بند ہوگئیں۔ معلوم نہیں کیا ہونے والا ہے؟ یہاں بھی بے حد پریشانی ہے۔ اپنا محلہ پونا خالی ہو گیا ہے اور ۱/۴ (ایک چوتھائی) رہ گیا ہے۔ وہ بھی خالی ہونے کو ہے۔

امید ہے کہ ننھی اور اس کی والدہ اور منّی اور ان کے بچے سب بہ خیرت ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ خیریت سے رکھے۔ تمہیں خرچ کی ضرورت ہو تو لکھ دینا، جو ہو سکے گا روانہ کر دیا جائے گا۔ گھر میں سب بہ خیریت ہیں۔ والدہ صاحبہ اور بھائی صاحب اور بچوں کی طرف سے تمہیں اور سب کو دعا سلام۔

محمد کفایت اللہ کان اللہ لہٗ

دہلی

☆☆☆

حضرت قاری شریف احمد صاحب دہلوی (کراچی)

(۱)

حضرت مفتی اعظم کا ایک رسالہ نہایت مفید و معلومات افزا "اصول اسلام" کے نام سے چھپا تھا۔ یہ رسالہ ایک چارٹ کی شکل میں بھی ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں سے شائع ہوا ہے۔ محترم قاری صاحب مدظلہ یہ رسالہ افادہ عامۂ مسلمین کے مقصد سے چھپوانا چاہتے تھے اور اس کے لیے حضرت مفتی صاحب سے اجازت کے خواہاں تھے۔ حضرت مفتی صاحب نے اجازت بھی دے دی اور محترم قاری صاحب نے اسے چھپوایا۔ یہ محترم قاری صاحب کی خدمات دینی کا ایک نیا میدان تھا۔ مسلمانوں کو اس سے بڑا فائدہ پہنچا۔

حضرت مفتی صاحب مرحوم کا دوسرا مکتوب گرامی بھی اسی سلسلے میں ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔

(۲)

جناب قاری صاحب دام مجدہم

بعد سلام مسنون، تعلیم الاسلام تاج کمپنی والے میری اجازت سے چھاپ رہے ہیں اور کافی معاوضہ دیتے ہیں۔ ان سے یہ معاملہ اس سال یا اس سے بھی زیادہ عرصے سے ہے۔

نقشۂ مسائل آپ چھپوانا چاہیں تو بہ شرطے کہ عمدہ کتابت اور صحت کا پورا پورا اہتمام ہو، آپ طبع کرالیں۔ اس کا کوئی معاوضہ نہیں ہے۔ صرف عمدگی اور صحت مدِ نظر رہے۔

امید کہ آپ بہ خیریت ہوں گے!

محمد کفایت اللہ کان اللہ لہٗ

۱۴ ؍ مارچ ۱۹۵۱ء

(۳)

محترمی قاری صاحب دام مجدہم

بعد سلام مسنون کے عرض ہے۔ نقشہ مطبوعہ پہنچا۔ جزاکم اللہ خیراً فی الدنیا والآخرۃ کاغذ اچھا لگایا ہے۔ مگر کتابت اچھے کاتب کی نہیں ہے۔ قلم بہت باریک کر دیا ہے اور خط بھی اعلیٰ درجے کا نہیں ہے۔ غلطیاں تو دیکھنے کے بعد معلوم ہوں گی۔

بہرحال جناب کی سعی خیر حق تعالیٰ قبول فرمائے اور جزائے خیر عطا فرمائے۔ آمین!

محمد کفایت اللہ کان اللہ لہٗ

دہلی، ۱۰ ؍ شعبان، ۷۰ھ [مئی ۱۹۵۱ء]

(۴)

قیام پاکستان کے بعد دونوں ملکوں کے مابین سفر کی جو مشکلات پیدا ہوئیں ان کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلا کہ بزرگان دین کے فیض صحبت اور شرف دید وزیارت میں رکاوٹیں پیدا ہوگئیں۔ محترم قاری صاحب مد ظلہٗ نے اپنے گرامی نامے میں اس محرومی کا شکوہ کیا تھا۔ حضرت مفتی صاحب کا جواب ملاحظہ فرمائیں۔

اخی فی اللہ جناب قاری صاحب زاد مجدہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ! جناب کا یہ خط دیکھ کر خوشی ہوئی۔ دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت اور سلامتی کے ساتھ رکھے اور اپنی مرضیات کی توفیق عطا فرمائے۔ مجھے بھی دعائے خیر میں یاد فرماتے رہیں۔ بہ ظاہر تو ملاقات کی امید نہیں ہے، اور اللہ تعالیٰ کو منظور ہو تو مشکل بھی نہیں۔

والسلام خیر ختام

محمد کفایت اللہ کان اللہ لہٗ

کوچۂ چیلان، دہلی (۱)

(۵)

حضرت مفتی صاحب کی یہ آخری بیماری تھی۔ وہ کئی مہینے اس میں مبتلا رہے۔ ہندوستان اور پاکستان، دونوں جگہ حضرت مفتی صاحب کے نیاز مندوں کو اس سے بڑی تشویش تھی۔ محترم قاری صاحب کو آں حضرت سے خاص تعلق تھا۔ انھوں نے ایک خط کے ذریعے حال دریافت کیا تھا۔ جواب سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دنوں مرض میں افاقہ تھا، لیکن خط خود نہ لکھ سکے۔ مولوی محمد اختر سے جواب لکھوایا۔ حضرت مفتی صاحب کی جانب سے جواب ملاحظہ فرمایئے!

محترم المقام دام مجدہم

السلام علیکم ورحمتہ اللہ برکاتہ

حضرت مفتی صاحب مد ظلہٗ، اب روبصحت ہیں۔ بخار بالکل نہیں ہے۔ ابکائی کی تکلیف میں کافی کمی ہے۔ ورم معدہ وجگر آہستہ آہستہ تحلیل ہو رہا ہے۔ غرض اب کوئی تشویش کی بات نہیں۔ البتہ سوا ماہ کی متواتر تکلیف سے نقاہت بے حد ہو گئی ہے، جس کے ازالے میں تقریباً

(۱) مکتوب نگار کے خط مورخہ ۶؍اپریل ۱۹۵۲ء کے جواب میں۔

مہینہ ڈیڑھ مہینہ لگ جائے گا۔ افتاء کا کام آپ خود نہیں کرتے۔ نماز تیمم سے بیٹھ کر پڑھتے ہیں۔

آپ اور سب متوسلین حضرت کے لیے دعائے صحت جاری رکھیے۔ حضرت مفتی صاحب آپ کو سلام مسنون فرماتے ہیں۔

محمد اختر عفی اللہ عنہ
مدرسۂ امینیہ، دہلی (۱)
۱۔۱۱۔ ۱۹۵۲ء

مولانا حافظ فرید الدین صاحب (کراچی):

۱۸ر ذی قعدہ (۸ر ستمبر ۱۹۵۲ء)

برخوردار فرید الدین زاد اللہ علمہ،
السلام علیکم ورحمۃ اللہ

تمہارا کارڈ موصول ہوا۔ اس سے موضع میرے شاہ کے مدرسہ میں تقرر کا حال معلوم ہوا۔ الحمد للہ بہت بہتر ہوا کہ یہ جگہ مل گئی۔ تم اطمینان اور سکون سے کام شروع کرو۔ اللہ تعالیٰ برکت کرے گا۔

اگر درسیات میں سے بھی کچھ پڑھانے کو مل جائے تو ایک دو سبق اس کے بھی مناسب ہوں گے۔ صرف تجوید اور قرأت سے علمی استعداد میں ترقی نہ ہو گی۔

یہاں سب بخیریت ہیں۔ تمہاری پھوپی جان اور ان کے گھر خیریت ہے (۲) حفیظ الرحمٰن ان کے بچے سب بخیریت ہیں۔ سلام و دعا کہتے ہیں۔

محمد کفایت اللہ کان اللہ لہٗ
کوچہ چیلان، دہلی

عزیز القدر مولوی حافظ فرید الدین صاحب
موضع میرے شاہ، مدرسہ خدام القرآن
صادق آباد، ریاست بہاول پور

---

(۱)۔ مکتوب نگار کے خط مورخہ ۲۹ر اکتوبر ۱۹۵۲ء کے جواب میں۔

(۲)۔ مولانا سعید الدین کی بہن میمونہ خاتون جو مولانا حفیظ الرحمٰن واصف کی خوش دامن بھی تھیں۔

آٹوگرافس

حاجی بشیر احمد مرحوم کی آٹوگراف بک (غیر مطبوعہ) سے

باسمہ سبحانہ

هما خطتا اما اسار و ذلة

واما دم والقتل بالحرا جدر

پستی اور ذلت کی زندگی سے شریف کے لیے عزت اور شرف کی موت بہتر ہے۔

محمد کفایت اللہ عفاعنہ مولاہ

لاہور ۲۳/ دسمبر ۱۹۳۱ء

حضرت مولانا مفتی محمدؒ کفایت اللہ صاحب، صدر جمعیۃ العلماء ہند

جنید احمد کی آٹوگراف بک سے☆

انسان کا فرض ہے کہ وہ حق کے لیے پوری امکانی جدوجہد کرے اور خدائے تعالیٰ سے توفیق کی دعا کرتا رہے

محمد کفایت اللہ کان اللہ لہٗ

۲۰/ جنوری ۱۹۴۶ء

☆مطبوعہ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ

چند شعری تبرکات

کلام

(جو دستیاب ھیں)

بسم اللہ الرحمن الرحیم ط

حمد و نعت

حضرت مفتی اعظم کی یہ جامع الاصناف نظم جو کل انیس اشعار پر مشتمل ہے، ہمیں مولانا حفیظ الرحمٰن واصف دہلوی کی عنایت سے موصول ہوئی ہے۔ اسے انھوں نے کفایت المفتی کی جلد اول کے آغاز میں درج کیا ہے۔ ادب میں یہ روایت رہی ہے کہ کتاب کا آغاز حمد و نعت اور منقبت سے کرتے ہیں۔ اسے کفایت المفتی کی جلد اول کے شروع میں شامل کر کے گویا انھوں نے اس روایات کو نبھایا ہے۔

اس نظم پر نظر ڈالتے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ نظم حمد، نعت اور منقبت میں تین اصناف کی جامع ہے۔

۱۔ اس کے ابتدائی تیرہ اشعار حمد باری تعالیٰ میں ہیں جن میں اللہ تعالیٰ کے مختلف اسمائے صفات کی کرشمہ سازیوں کو بیان کیا ہے۔

۲۔ اس کے بعد چار اشعار نعت میں ہیں۔ پہلے ان میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر درود وسلام کا نذرانہ پیش کیا ہے اور ایک روشن، پرامن، صاف ستھری، کمی بیشی کے عیب سے پاک، تحریف سے مبرا اور عرب کے بگڑے ہوئے معاشرے میں، ایک دوسرے کے جانی دشمنوں کو بھائی بھائی بنا دینے والی شریعت اور اللہ کی مخلوق کو جہنم میں گرنے اور دنیا اور آخرت کی تباہی سے بچانے والے پیغمبرانہ کارنامے اور خدا کی حمد و ثنا میں سرگرم اور مقام محمود پر فائز احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظیم الشان شخصیت کا ذکر کیا ہے۔

۳۔ آخر کار دو اشعار میں علمائے حق اور قرآن و حدیث کے خدام پر سلامتی بھیجی ہے۔ اور اللہ کی رضا کا طالب اور اس کی خوشنودی کی شراب سے سرشار ہونا، ان کی صفت بیان کی ہے۔

یہ جامع الاصناف والصفات نظم عربی زبان میں ہے۔ بین الاشعار اردو ترجمے سے مزین ہے۔ البتہ یہ صراحت کہیں نظر سے نہیں گزری کہ ترجمہ خود شاعر کے قلم سے ہے یا پیش کنندہ نے کیا ہے۔ لیکن میرا یقین ہے کہ یہ ترجمہ جناب واصف مرحوم کے قلم سے ہے۔ اس لیے کہ جو شاعر اپنے کلام کی جمع ترتیب سے بے نیاز اور اس کی اشاعت سے بے پروا ہو، وہ ترجمہ کس کے لیے کرنے کی زحمت اٹھائے گا۔ انھوں نے نہ شعر کہنے کی کبھی سنجیدہ کوشش کی، نہ کلام چھپوانے میں ان کے شوق کا پتا چلتا ہے۔ حتی کہ کلام کی حفاظت سے بھی ان کی دلچسپی کا پتا نہیں چلتا۔

ان کی زبان دلی کی ٹکسالی زبان ہے اور اس میں سادگی، صفائی اور سلاست کی خوبیاں پائی جاتی ہیں اور کلام میں فصاحت وبلاغت، مضمون آفرینی اور فکر وفن کی بلندی اور پختگی بھی بہ درجہ کمال موجود ہے۔ یہ چیزیں اہل ذوق اور اصحاب نظر کو مرعوب ہوتی ہیں۔ لیکن ان کا یہ شوق زبان وبیان کی خوبیاں دکھانے اور شہرت ومقبولیت حاصل کرنے کے بجائے صرف تفریح طبع کے لیے تھا۔ انھوں نے ہمیشہ اس جذبے کے تحت اشعار کہے اور اس کے بعد اس سے بے نیاز ہو گئے۔ اور اس کے خیال کو دل سے ایسا نکالا کہ اس کی جمع وترتیب واشاعت کی فکر تو کجا۔ کسی کے سامنے اسکا ذکر تک نہ کیا۔ یہ خیال ان کی عام شاعری کے بارے میں ہے۔

بہرحال اب تک حضرت کا کلام جو دستیاب ہوا ہے، اسے یکجا کر دیا ہے کہ کم از کم یہی ضائع ہونے سے بچ جائے۔ (ا۔ س۔ ش)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حمد و نعت

از حضرت مفتی اعظم مولانا محمد کفایت اللہ رحمہ اللہ

یَاخالِقَ الْاَرْوَاحِ وَ الْاَبْدَانْ
اے وہ کہ تونے ارواح واجسام کو پیدا کیا

یَامُنبِتَ الْاَزْهَارِ فِی الْبُسْتَانْ
اے وہ کہ تونے چمن میں پھولوں کو اگایا

یَا مُودِعَ الْالْوَانِ فِی الرَّیْحَانْ
پھولوں کو مختلف رنگ عطا کیے

وَمُزَیِّنَ الْاَفْلاکِ با لشُّهبَانْ
آسمانوں کو ستاروں سے سجایا

یَامُرْسِلَ النُّشُرِاللَّوَاقِحِ رَحْمَةً
ہواؤں کو حامل رحمت بناکر بھیجا

یَا مُنْزِلَ الْاَمْطارِ بِالْهَطْلَانْ
موسلادھار بارشیں نازل کیں

یَاسَاقِیَ الرَّوْضِ الْبَهِیِّ نَضَارَةً
تروتازہ گلستانوں کو رعنائی سے سیراب کیا

یَامُخْرِجَ الْاَثْمَارِ وَالْقِنْوَانْ
پھل اور کھجور کے خوشے پیدا کیے

یَاحَاشِرَالْاَجْسَادِمِنْ بَعْدِالْبِلیٰ
بوسیدہ اجسام کو از سر نو اٹھانے والا تو ہے

یَا نَافِخَ الْاَرْوَاحِ فِی الْجُثْمَانْ
مجسمے میں روح پھونکنے والا تو ہے

حَمْدًالَّكَ اللّٰهُمَّ رَبِّیْ بَالِغاً
اے اللہ میرے پروردگار تیری ستائش کی

اَقْصیٰ الْمَدیٰ مِنْ قُوَّةِ الْاِنسانْ
کوشش کرتا ہوں قوت انسانی کے آخری حدود تک

حَمْداً كَمَا اَنْتَ اصطَفَیْتَ لِنَفْسِكَ
ستائش ہے تیرے لیے جیسی کہ تونے اپنے لیے

اَسْنیٰ الْمَحَامِدِ مُحْكَمَ الْاَرْكَانْ
پسند کی ہے۔ تمام ستائشوں سے بالاتر پایدار

اَنْتَ الرَّقِیْبُ عَلیٰ الْعِبَادِ مُقِیْتُهُمْ
تو اپنے بندوں سے باخبر اور انکا نگراں ہے

اَنْتَ الْعَلِیْمُ بِمَنْ یُّطِیْعُ وَ جَانی
تو طاعت شعاروں اور خطاکاروں کو جاننے والا ہے

شَہِدَتْ بِتَوْحِیْدِ الْاِلٰہِ سَمَائُہٗ
گواہ ہیں خدا کی یکتائی پر آسمان
وَ بُرُوْجُھَا کَالْجَدیِ وَالْمِیزَان
اور اس کے بروج مثلاً جدی ومیزان

وَالشَّمْسُ وَ الْقَمَرُ الْمُنِیْرُ بِضَوْئِہَا
اور سورج اور اس کی روشنی سے چمکنے والا چاند
وَنجو مُھا وَ الْاَرْضُ ذَاتُ حسَان
اور تمام ستارے اور زمین جو مرکزِ حسن وجمال ہے

وَوِھَادُھَا وَ جِبَالُھَا وَ بِحَارُھا
اور گھاٹیاں اور پہاڑ اور سمندر
وَ جَمِیْعُ مَافِیْھَا مِنَ الْحِیْتَان
اور سمندر کی تمام مچھلیاں

شَہِدَتْ بِہٖ ذَرَّاتُ رَمْلٍ عَالِجٍ
گواہ ہیں اس کی یکتائی پر ریگستانوں کے ذرات
وَ بنَا تُھَا وَالرَّوْضُ ذُوْاَفْنَان
اور ان کی بوٹیاں اور گھنے باغات

اَوْرَاقُھَا وَ غُصُوْنُھَاوَ ثِمَارُھَا
باغوں کے پتے، شاخیں اور پھل
اَزْھَارُھَاوَ شَمَائِمُ الرَّیْحَان
پھول اور پھولوں کی خوشبوئیں

ثُمَّ الصَّلٰوۃُ عَلَی الَّذِیْ قَدْجَاءَ نَا
اس کے بعد درود وسلام ہے اس پر جو ہمارے لیے
بِشَرِیْعَۃٍ غَرَّاءَ ذَاتِ اَمَان
ایک روشن اور پرامن شریعت لے کر آیا

بَیْضاء صَافِیَۃٍ نَقِیٍّ لَوْنُھَا
صاف ستھری شریعت جو تحریف
عَنْ وَصمۃِ التَّحْرِیْفِ وَ النُّقْصَان
اور کمی بیشی کے عیب سے پاک ہے

اَلْھَاشِمِیِّ الابطحی مُحَمَّدٍ
محمد ہاشمی مکی (ﷺ) جس نے دشمنوں
مَنْ حَوَّلَ الْاَعْدَاءَ کَالْاِخْوَان
کے دل پھیر کر ان کو آپس میں بھائی بھائی بنادیا

اَلحَامِدِالْمَحْمُوْدِ اَحْمَدِنَاالَّذِیْ
خدا کا حقیقی ثناگر اور خود قابلِ ستائش ہمارا احمد
نَجَّی الْوَرٰی مِنْ حُفْرَۃِ النِّیْرَان
جس نے مخلوق کو جہنم کے گڑھے سے نجات دلوائی

ثُمَّ الَّذِیْنَ اخْتَارَ ھُمْ مَوْلَاھُمْ
پھر سلام ہے ان پر جن کو ان کے پروردگار نے
لِتَحَمُّلِ الْاَخْبَارِ وَالْقُرْآن
حدیث اور قرآن کی امانت برداری کے لیے چنا

حَازُوْالْفَضَائِلَ ثُمَّ فَازُوْابِالْمُنٰی
جو اپنے اندر فضائل کو جمع کر کے مقاصد میں کامیاب اور
وَسُقُوْا شَرَابَ الْفَضْلِ وَ الرِّضْوَان
خدا کی مہربانی وخوشنودی کی شراب سے سرشار ہوئے

(کفایت المفتی جلد اول، ص ۵-۴)

نالۂ فراق

۱۹۱۸ء مولانا مفتی اعظم کفایت اللہ شاہ جہاں پوری ثم دہلوی نے حضرت شیخ الہند کے حالات میں جو رسالہ "شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحب قبلہ محدث دیوبندی کے مختصر سوانح وحالات اسیری" کے عنوان سے تحریر فرمایا تھا اور انجمن اعانت نظر بندان اسلام دہلی نے دلی پرنٹنگ ورکس، دہلی میں چھپوا کر شائع کیا تھا، اس کے آخر میں تیرہ اشعار کی ایک عربی نظم جو حضرت کے درد جدائی و مہجوری میں "مالٹا" کو مخاطب کر کے لکھی تھی شامل ہے۔ اس وقت تک حضرت کے حالات میں یہ پہلا رسالہ تھا جو شائع ہوا۔ اور نظم دوسری جو حضرت کی شان میں اور دردِ فراق کے بیان میں لکھی تھی۔ پہلی نظم وہ قصیدہ ہے جو ۱۹۰۸ء میں مفتی صاحب نے تحریر کیا تھا اور مدرسہ امینیہ اسلامیہ کے جلسے میں پڑھا تھا۔ اس کے بعد ترجمہ و حواشی سے مزین کر کے ۱۹۰۹ء میں "روض الریاحین" کے نام سے کتابچے کی شکل میں چھپا تھا اور ۱۹۱۰ء میں ماہنامہ القاسم دیوبند میں بھی شائع ہوا تھا۔ زیر نظر نظم کا ترجمہ بھی مفتی اعظم مرحوم کے قلم کا یادگار ہے۔ رسالے میں یہ ترجمہ بین الاشعار تھا یہاں الگ کر دیا ہے۔ نظم اور اس کا ترجمہ ملاحظہ فرمایئے۔ رسالے میں اس نظم کے عنوان میں جو مضمون درج ہے۔ اسے بعینہ درج کیا جاتا ہے۔

"حضرت مولانا کے ایک خادم (۱) نے اپنے درد دل کا اس طرح اظہار کیا ہے"

آلَا يَا مَالْٹَا! طُوبیٰ وَبُشْریٰ	(۱)	ثَوِیٰ بِكِ مَنْ مَحَا آثَارَ كُفْرٍ
وَ لَمْ تَكُ قَبْلَهٗ اِلَّا خَرَاباً	(۲)	خَمُولاً غَيْرَ مَعْرُوْفٍ بِخَيْرٍ
فَلَمَّا حَلَّهَا عَادَتْ رِيَاضاً	(۳)	مُنَضَّرَةً مِنَ التَّقْوٰى وَذِكْرٍ
مُكَلَّلَةً بِاَزْهَارِ الْمَزَايَا	(۴)	وَاَزْهَارُ الْمَزَايَا خَيْرُ زَهْرٍ
آلَا يَا مَالْٹَا ! كُوْنِیْ سَلَاماً	(۵)	عَلٰى مَحْمُوْدِنَا الرَّاضِیْ بِقَدْرٍ
اِمَامُ الْخَلْقِ قُلُوْبُهُمْ جَمِيْعاً	(۶)	لَهٗ كَرَمٌ اِلَى الْاٰفَاقِ يَسْرِیْ

(۱)۔ خادم سے مراد حضرت مفتی صاحب ہی کی ذات ستودہ صفات ہے۔

جُنَیْدُ الْعَصْرِ سِرِّیُّ الزَّمَانِ (۷) غُیُوْثُ فُیُوْضِہٖ تَھْمِیْ وَ تَجْرِیْ
فَرِیْدٌ فِیْ خَلَائِقِہٖ الْعِذَابِ (۸) وَحِیْدٌ فِی التُّقٰی مِنْ غَیْرِ فَخْرٍ
اَشَدُّ النَّاسِ اَمْثَلُھُمْ بَلَاءً (۹) فَیَاشَمْسَ الْھُدٰی یَا طَوْدَصَبْرٍ
ذَکَرْنَا یُوْسُفَ الصِّدِّیْقَ لَمَّا (۱۰) اُسِرْتَ بِغَیْرِ اِسْتِحْقَاقِ اَسْرٍ
لِجَرِّ الْبَیْنِ فِیْ صَدْرِالْکَئِیْبِ (۱۱) تَفِیْضُ دُمُوْعُہٗ حُمْرًا کَجَمْرٍ
سَیُنْزِلُکَ الْعَزِیْزُ مَحَلَّ عِزٍّ (۱۲) وَ یَنْصُرُکَ النَّصِیْرُ اَعَزَّ نَصْرٍ
(۱۳) سَیَکْفِیْکَ الْاِلٰہُ فَاَنْتَ مَرْءٌ
کَفَاکَ اللّٰہُ قِدْ مًا کُلَّ شَرٍّ

ترجمہ:

(۱)- ہاں! اے مالٹا! تجھے مبارک باد اور خوش خبری ہو کیوں کہ تیرے اندر وہ بزرگ مقیم ہے، جس نے کفر کے نشان مٹا دیئے!

(۲)- اس سے پہلے (مالٹا) ایک ویرانہ اور گم نام مقام تھا، جس کی کوئی خوبی معروف و مشہور نہ تھی۔

(۳)- جب اس نفس مقدسہ نے اس میں نزول فرمایا تو وہ ذکر اللہ اور تقویت کا سرسبز باغ بن گیا۔

(۴)- ایسا باغ جس میں تمام اوصاف حمیدہ کے پھول کھلے ہیں اور در حقیقت فضائل کے پھول بہترین پھول ہیں۔

(۵)- ہاں! اے مالٹا! تو ہمارے مقتدا مولانا محمود حسن پر جو خدا کے حکم پر سر تسلیم خم کیے ہوئے ہیں مجسم سلامتی بن جا!

(۶)- حضرت مولانا کل مخلوق کے امام اور پیشوا ہیں۔ ان کا صیت کرم دنیا کے کناروں تک پہنچا ہوا ہے۔

(۷)- اس زمانے کے جنید اور سری سقطی آپ ہی ہیں۔ آپ کے فیوض کی بارشیں برستی اور بہتی ہیں۔

(۸)- اپنی شیریں عادات میں فرد اور تقویٰ و پرہیز گاری میں یکتائے زمانہ ہیں۔

(۹)- جو شخص مخلوق میں برگزیدہ ہوتا ہے۔ اس پر مصائب بھی سخت ہوتے ہیں، تو اے

ہدایت کے آفتاب اور صبر کے پہاڑ۔

(۱۰)- ہمیں حضرت یوسف علیہ السلام یاد آگئے جب کہ آپ کو بغیر اظہار کسی جرم کے قید کر لیا گیا۔

(۱۱)- اس غم فراق کی گرمی سے جو ایک محب غم گین کے سینے میں جاگزیں ہے، اس کے آنسو انگاروں کے مانند سرخ بہتے ہیں۔

(۱۲)- عن قریب خدائے عزیز آپ کو مقام عزت میں جگہ دے گا اور خدائے نصیر آپ کی قوی مدد فرمائے گا۔

(۱۳)- اور عن قریب خدائے تعالیٰ کی مدد آپ کو کافی ہو گی۔ کیونکہ آپ وہ شخص ہیں جسے خدا نے ہمیشہ ہر قسم کے شر سے بچایا ہے۔

حضرت شیخ الہند کا خیر مقدم

حضرت شیخ الہند ۱۶ر ستمبر ۱۹۱۵ء کو بمبئ سے پانی کے جہاز اکبر ثانی سے حج کے لیے روانہ ہوئے تھے اور پورے ۴ سال ۸ ماہ ۲۲ دن کے بعد ۷ر جون ۱۹۲۰ء کو ساحل بمبئ پر واپسی کا قدم رکھا تھا۔ یہ زمانہ ملک اور بیرون ملک میں انقلابات کا زمانہ ثابت ہوا۔ حضرت شیخ اور ان کے رفقا ایک عظیم ابتلا سے کامیاب اور سرخرو گزرے۔

(۱)- افغانستان میں ہندوستان کی پرویژنل گورنمنٹ قائم ہوئی۔ افغانستان آزاد ہوا اور اس کی آزادی کی جنگ میں مولانا عبید اللہ سندھی، ان کے رفقا اور لاہور سے ہجرت کرنے والے طلبہ نے اہم حصہ لیا۔ روس میں زار کی حکومت کا تختہ الٹ دیا گیا۔ ترکی حکومت کے مقبوضات پر قبضہ کر لیا گیا۔ اس کی عیسائی ریاستوں میں بغاوت کرائی گئی۔

(۲)- حجاز میں ترکی حکومت کے گورنر حسین کو بغاوت پر آمادہ کیا۔ حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی اور ان کے چار رفقاء مولانا سید حسین احمد مدنی، مولانا عزیز گل، حکیم نصرت حسین، اور محمد مسعود احمد کو گرفتار کر کے انگریزوں کے حوالے کر دیا گیا۔ جنہیں جزیرۂ مالٹا میں لے جا کر قید کر دیا گیا۔ حجاز و عرب میں ترکوں پر ظلم ڈھائے گئے، ان کے خون کو حلال سمجھا گیا اور بے دریغ ان کا قتل کیا گیا۔ عربوں پر غلہ بند کر دیا گیا۔ سیکڑوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا اور انھیں بزور شمشیر نئے بادشاہ حسین، کا وفادار بنایا گیا۔ عراق، اردن میں نام نہاد

قومیت کی بنیاد پر عرب حکومتیں اور مصر، شام، ایران وغیرہ میں پٹھو قومی حکومتیں قائم کی گئیں اور سیکڑوں آزاد خیال اور حریت پسند زعما کو گرفتار کر کے قید خانوں میں ڈال دیا گیا یا نظر بند یا جلاوطن کر دیا گیا۔

۳- اندرون ملک تحریک ریشمی رومال تحریک کا افشا ہوا۔ پچاسوں لوگوں کے خلاف سازش کا مقدمہ قائم کیا گیا۔ رولٹ ایکٹ کا نفاذ ہوا، جلیان والا باغ کا حادثہ پیش آیا۔ پنجاب میں مارشل لا کا نفاذ عمل میں آیا۔ ستیہ گرہ (مقاومت بالصبر) کی تحریک نے انقلاب پیدا کر دیا، جمعیت علمائے ہند قائم ہوئی۔ خلافت، ہجرت، ترک موالات، سدیشی وغیرہ تحریکات شروع ہوئیں۔ برطانوی حکومت نے ترکی پر جو نام نہاد صلح نامہ تھوپا تھا، ہندوستان نے اسے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور جشن فتح یا صلح کا بائیکاٹ کر دیا۔ قوم نے اس کے خلاف تحریک چلائی اور اس میں شرکت سے قطعاً انکار کر دیا۔ لکھنؤ کی مسلم کانفرنس کی تجویز کے مطابق ۱۷ر اکتوبر ۱۹۱۹ء کو ترکی کی حمایت میں "خلافت ڈے" منایا گیا۔ گاندھی جی نے اعلان کیا:

"۱۶ر دسمبر کو صلح کا جشن منانے کے لیے ہندوستان بالکل شامل نہ ہوگا"۔

اس روز پورے ملک میں ہڑتال ہوئی، لوگوں نے روزہ رکھا اور دعا مانگی۔ اس تحریک کو کامیاب بنانے کے لیے ملک میں جلسوں کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ الہ آباد، لکھنؤ، علی گڑھ، کراچی، کلکتہ، بمبئی کے جلسے بہت کامیاب رہے جن میں مسلمان اور ہندو جوش و خروش سے شریک ہوئے۔ دہلی کی خلافت کانفرنس اسی سلسلے کی کڑی تھیں جس میں حضرت مفتی اعظم نے جشن صلح کی تجویز پیش کی تھی۔ اس کے اگلے روز ۲۴ر نومبر کو ہندو مسلم کانفرنس (دہلی) نے ملک کی سیاسی فضا کو بدل کر رکھ دیا۔

ملک کے اندر اور باہر کے سیاسی اسیروں کی رہائی کے مطالبے شروع ہوئے۔ کونسل میں سوالات شروع کیے گئے۔ خلافت، کانگریس، جمعیت، قومی کانفرنس، دینی اداروں میں قرار دادیں پاس ہونا شروع ہوئیں۔ اخباروں میں مضامین و مراسلات میں حضرت مولانا محمود حسن اور ان کے ساتھی قیدیوں اور اندرون ملک مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، مولانا ابوالکلام آزاد وغیرہم کی رہائی کے لیے گورنروں اور وائسرائے کو میمورنڈم پیش کیے جانے لگے۔ ملک میں ان مظلوموں اور ستم رسیدہ اسیروں کی رہائی کا اتنا چرچا ہوا کہ وہ لوگ بھی جن کے بارے میں شبہ تھا کہ انھوں نے حضرت شیخ الہند کو گرفتار کروایا ہے یا اس میں ان کا کوئی

حصہ ہے، وہ بھی ان کی رہائی کی کوششوں میں نہ صرف شریک تھے، بلکہ پیش پیش تھے۔ حال آں کہ حضرت شیخ الہند اور ان کے رفقا کی مالٹا سے روانگی کی خبر آ چکی تھی اور کوئی وجہ نہ تھی کہ اس کا اعتبار نہ کیا جائے!

حکومت کے لیے انہیں قید میں رکھنا مشکل ہو گیا تھا۔ بین الاقوامی حالات تبدیل ہو چکے تھے، جشن فتح کا دن (۱۴ر دسمبر) گزر چکا تھا۔ اس لیے اب گورنمنٹ بھی انھیں قید میں رکھنا ضروری نہ سمجھتی تھی۔ اسیروں کی رہائی کا سلسلہ شروع ہوا۔ دسمبر ۱۹۱۹ء کے آخر میں برادران کو رہا کیا گیا۔ یکم جنوری ۱۹۲۰ء کو مولانا آزاد کی رہائی عمل میں آئی۔ ۱۳ر مارچ کو حضرت مولانا محمود حسن اور ان کے رفقا کی مالٹا سے روانگی ہوئی اور ۷ر جون کو انھیں بمبئی پہنچا کر رہا کر دیا گیا۔

اگرچہ یہ تمام سیاسی اسیر برسوں قید میں رہے تھے اور شدید مصائب سے گزرے تھے۔ ان کی قید تمام اہل ہند کے لیے اور خاص طور پر وطن دوستوں اور حریت پروروں کے لیے سخت کوفت اور اشتعال کا موجب بنی ہوتی تھی۔ لیکن اب جب کہ انھیں رہائی مل گئی تھی تو اہل وطن میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی تھی۔ خاص طور پر حضرت مولانا محمود حسن کی رہائی پر ملک میں ایک جشن کا سماں پیدا ہو گیا تھا۔ بمبئی میں جہاز سے اترتے ہی ملک کی جید سیاسی اور قومی شخصیت جن میں مولانا عبدالباری فرنگی محلی، حکیم اجمل خاں، مہاتما گاندھی جی، ڈاکٹر انصاری، مولانا شوکت علی، مفتی کفایت اللہ، مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی، حافظ محمد احمد مع اپنے دونوں صاحب زادگان مولوی محمد طاہر اور مولوی محمد طیب کے حاجی سیٹھ محمد چھوٹانی، حاجی احمد صدیقی کھتری، مولانا قاضی محی الدین مراد آبادی، حکیم عبدالرزاق برادرِ بزرگ ڈاکٹر انصاری، مولانا سید مرتضٰی حسن اور حضرت کے تلامذہ و اعزہ میں سے کوئی ایسی شخصیت نہ تھی جو کسی عذر کے بغیر بمبئی نہ پہنچی ہو، حضرت کے استقبال کے لیے ساحل پر موجود تھیں۔ بمبئی میں حضرت کے قیام کے دو دنوں میں عقیدت مندوں، شاگردوں اور اکابر و مشاہیر کا ایک مجمع ہر وقت لگا رہتا تھا اور عید کا سماں پیدا ہو گیا تھا۔ خصوصاً خلافت کمیٹی کا یادگار جلسہ جس میں حضرت کو "شیخ الہند" کا خطاب دیا گیا۔ بمبئی سے دہلی اور پھر دیوبند کے سفر میں درمیان کے اسٹیشنوں پر بھی زائرین و مشتاقانِ دید کا ہجوم قابل دید تھا۔ میرٹھ کے اسٹیشن پر تو گاڑی روک کر اہالیانِ شہر کی طرف سے حضرت شیخ الہند کو سپاس نامہ پیش کیا گیا تھا اور اس کے جواب میں مولانا حسین احمد مدنی نے

ایک تحریر پڑھی تھی۔ دہلی کے ایک روزہ قیام کے دوران اور دیوبند میں کئی دنوں تک جب کہ حضرت نے ضروری سفر نہیں شروع کر دیئے تھے، شائقین اور عقیدت مندوں کا ایسا ہی ہجوم رہا۔ دیوبند میں ایک قومی میلے کا سماں نظر آتا تھا۔

حضرت شیخ الہند کی وطن واپسی پر ہر کسی نے اپنے ذوق اور اپنی وسعت وہمت کے مطابق خوشی کا اظہار کیا تھا۔ شعرا نے بھی اپنے فن شاعری کو اپنی ارادت ومسرت کے اظہار اور تبریک وتہنیت کا ذریعہ بنایا۔ مولانا سید اصغر حسین صاحب نے اپنی تالیف لطیف "حیات شیخ الہند (دیوبند، رجب ۱۳۳۹ھ مطابق مارچ-اپریل ۱۹۲۱ء) میں مولوی مظہر الاسلام، مولوی طاہر قاسمی، مولانا سراج احمد اور خود اپنے منظومات کا حوالہ اور اس کے ساتھ کلام کا کچھ نمونہ بھی دیا ہے۔

اس تاریخی موقع پر حضرت مفتی اعظم محمد کفایت اللہ شاہ جہاں پوری ثم دہلوی نے بھی ایک نظم میں حضرت شیخ الہند کا استقبال کیا تھا۔ یہ نظم اپنی تاریخی حیثیت ہی کی بنا پر تبرک نہیں بلکہ فن کی بنا پر بھی۔ ندرہ کاری کی مثال ہے۔ نیز زبان کی فصاحت، بیان کی لطافت، اسلوب کی دل ربائی اور پیش کش کے انداز کے لحاظ سے بھی ایک شاہ کار نظم ہے۔ اس کے علاوہ حضرت کے علم وفضل کے محاسن، اخلاق وسیرت کے محامد، جامعیت علوم وفنون کے کمال اور خدماتِ علم وعمل کے تنوع اور خصائص، اخلاصِ عمل، ایثار وقربانی، تقویٰ وتدین کے اوصاف حمیدہ کے بیان میں یہ ایک بے مثال نظم ہے۔ نظم یہ ہے:

قدوۂ اہل یقین و زبدۂ ارباب دیں — پیشوائے سالکین ومقتدائے عارفیں
محرم اسرار وحدت ہادیٔ مستر شدیں — قافلہ سالار عرفاں رہبر راہ یقیں
جاں نثارانِ جمال لم یزل کے رہنما — راز دارانِ بقا کے صدر مجلس بالیقیں
حافظ وشیخ الحدیث و رحلۂ وحجت امام — وقت کے ابن مبارک ثانیٔ ابن معین
مایۂ صد ناز اہل ہند فخر مومناں — فخر جانبازانِ ملت فخر خیل صادقیں
چرخ حقانیت واخلاص کے مہر منیر — افتخار ملک وملت حامی دین مبیں
اہل ایماں کے لیے کافی ہے ان کا اتباع — انکی الفت مخلصوں کے واسطے حصن حصیں
آپ کا چہرہ ہے یا آئینۂ حقانیت — قلب ہے حضرت کا یا اللہ کا عرش بریں
قلب مومن میں سماتا ہے خدائے ذوالجلال — مخلصوں کے دل ہیں عرش پاک رب العلمین

دورِ حاضر میں صداقت استقامت کی مثال — ان سے بہتر تم کو مل سکتی نہیں ہر گز کہیں
خوف غیر اللہ کا دل میں گزر ہو کیا مجال — پاک ظاہر، پاک باطن، پاک دل اور پاک دیں
وعدہ ہائے وصل محبوبِ ازل پیشِ نظر — جسکے ہو جائیں وہ باطل سے ڈرے ممکن نہیں
ضیغم حقانیت شیر وفا مردِ خدا — نام ہی سے جسکے بھاگے فوج شیطانِ لعیں
استقامت وہ دکھائی جس سے ششدر رہ گئے — دشمنانِ بد گہر اور حاسدان کاشحیں
جبر واستبداد کی تھیں جتنی چیرہ دستیاں — نقش سطحِ آب سے زیادہ نہ قائم رہ سکیں
چیرہ دستی جبر واستبداد کی ہے باد مشت — سر فروشان رضا پر اس کا کچھ قابو نہیں
جبر واستبداد کی اس تلملاتی دھوپ میں — سایۂ طوبیٰ تھا بیشک ان کا ظل آستیں
آپ کی ہی مخلصانہ کوششوں سے آج ہیں — جبر واستبداد قعر رنج وغم میں تہ نشیں
خوفِ حاکم، خوفِ عزت خوفِ فخر وخوفِ جان — کر دیا سب کو فدائے خوفِ رب العالمیں
حب جان وحب جاہ وحب اہل وحب مال — سب کی سب ہی حب مولیٰ پر سے قرباں ہو گئیں
نقش تقویٰ نقش حقانیت ونقشِ عمل — نقشِ اخلاص ووفا سب اسکے ہیں نقشِ نگیں
فیض علمی سے تمہارے ہی بنا تھا دیوبند — رشک گلزارِ جنان وغیرت خلد بریں
چہچہاتے رہتے تھے ہر وقت مرغانِ چمن — رات دن بیدار تھی نرگس کی چشمِ خوابگیں
مامن حق سے چلے جب صلح کل ہو کر اسیر — کیوں نہ لرزے آسماں اور کیوں نہ تھرائے زمیں
جو خدا کے گھر میں اسکے دوست کو کر کے اسیر — دشمنانِ حق کو دیدے کون ہے اے مومنیں
مالٹا میں علم وعرفاں کا سمندر تھا اسیر — کیا جزیرے میں سمندر تم نے دیکھا ہے کہیں
نسبت خاصانِ حق کا یہ اثر ہے دوستو! — مالٹا جو اک مکاں تھا ہو گیا دل میں مکیں
گلبنِ ایمان کے خوش رنگ اور ممتاز پھول — جسکی فرقت سے تھے سارے اہل ہند اندوہگیں
مخلصو! بشریٰ لکم! مردانِ حق کا قافلہ — ہیبت حق جسکی آواز جرس کے ہے قریں
آرہا ہے سوئے ہندستاں نرالی شان سے — نورِ حق چہروں سے روشن دل میں ایمان ویقیں
جس نے سوتوں کو کیا بیدار گہری نیند سے — مالٹا سے آرہا ہے پھر وہی شیر عریں

قم باذن اللہ کہہ کر خلق کو زندہ کیا
پھونک دی مردہ تنوں میں روحِ ایماں بالیقیں

(جمعیت علماء پر ایک تاریخی تبصرہ، مولفہ مولانا حفیظ الرحمٰن واصف، دہلی، ۱۹۶۹ء ص ۶۴-۶۲)

حبسیات

زمانۂ اسارتِ ملتان جیل کا یادگار کلام

۱۹۳۲ء میں ۱۱؍ مارچ کو حضرت مفتی اعظم تحریک سول نافرمانی کے سلسلے میں دہلی میں گرفتار کر لیے گئے۔ مقدمے کی سرسری سماعت ہوئی اور مسٹر نیگ کی عدالت سے انہیں ڈیڑھ سال کی سزا کا حکم سنا دیا گیا۔ اگرچہ ان کی رہائی تقریباً تیرہ مہینے کے بعد اپریل ۱۹۳۳ء میں ہو گئی تھی۔ جدید سنٹرل جیل ملتان ان کا محبس قرار پایا تھا۔ تحریک کے سلسلے میں شمال مغربی ہند میں دہلی تا پنجاب کے جو رہنما اور کارکن کانگریس، جمعیت علمائے ہند، مجلس احرارِ اسلام نیشنلسٹ ہندو مسلمان گرفتار ہوئے تھے، وہ بیشتر اس جیل میں رکھے گئے تھے۔

ملتان جیل میں اس وقت یوپی اور دہلی کے حضرت مفتی صاحب کے علاوہ مولانا عبدالحلیم صدیقی، مولانا عارف ہسوی، مولانا احمد سعید، احرارِ اسلام پنجاب کے مولانا حبیب الرحمٰن لودھیانوی، چودھری افضل حق، مولانا عبدالرحمٰن تکودری، مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا مظہر علی اظہر، جمعیت علمائے پنجاب کے مولانا احمد علی لاہوری، پنجاب کانگریس کے مولانا سید داؤد غزنوی، لالہ دیش بندھو، لالہ شام ناتھ، لالہ اونکار ناتھ، مکند لال، چودھری شیر جنگ، مہاشہ اندر، لالہ داؤدیال اور دوسرے بہت سے ہندو مسلمان سیاسی کارکن اور رہنما جمع ہو گئے تھے۔

حضرت مفتی صاحب اپنی ذاتِ ستودہ صفات سے خود مرجع خلایق تھے، لیکن اس بار تو ان کی گرفتاری کانگریس و جمعیت کے نظام ڈکٹیٹر کے تحت ہوئی تھی۔ اس لیے تحریک کے ہندو اور مسلمان سب کے مرکز عقیدت تھے۔ ان کی ذات سرچشمہ علم و حکمت تھی اور جیل کا ہر ساتھی بہ قدرِ ذوق وسعت ان سے فیض یاب ہو رہا تھا۔ ملتان جیل ایک یونی ورسٹی بنی ہوئی تھی۔ صبح سے شام اور رات تک جب تک اسیروں کو ان کی بیرکوں میں نہیں بھیج دیا جاتا تھا، سیاسیات، مذہبیات، اخلاقیات، لسانیات کی کلاسیں جاری رہتی تھیں۔ سیاسی بحث و مباحثے کی بیٹھکیں ہوتی تھیں۔ شعر و شاعری کی مجلسیں بجتی تھیں، قوم وطن کے مسائل و مصائب پر

لیکچر ہوتے تھے، ادب و شعر کے تذکرے ہوتے تھے۔ مشاعرے منعقد کیے جاتے تھے۔ اصلاح و تربیت کے لیے اساتذہ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیے جاتے تھے۔ حضرت مفتی صاحب اس زندگی کی مرکزی شخصیت تھے۔ مولانا امداد صابری دہلوی لکھتے ہیں:

> ''مفتی صاحب جب جیل میں تھے مشاعرے ہوتے تھے اور احباب اصرار کرتے تھے تو کوئی اردو غزل فرمادیا کرتے تھے یا جب کوئی رہا ہوتا اور دل پر اثر پڑتا تو فی البدیہ نظم کہہ دیا کرتے تھے۔ عام طور پر اردو میں آپ غزل گوئی یا شعر و شاعری سے پرہیز کرتے، لیکن عربی میں ضرور آپ قصیدہ اور اشعار فرماتے۔ عربی کے قصیدے عوام نہیں سمجھ سکتے، اس لیے ان کا یہاں لکھنا بے سود ہے۔ البتہ وہ نظمیں جو مفتی صاحب نے حضرت مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا حبیب الرحمٰن اور مولانا احمد سعید کی رہائی پر کہیں۔ ان کے اشعار ملاحظہ فرمائیں''۔

(فرنگیوں کا جال: دہلی، ۱۹۴۹ء، ص ۲۹۳)

اسی زمانے میں رمضان کا مہینہ آیا (۲۹ر دسمبر ۱۹۳۲ء تا ۲۷ر جنوری ۱۹۳۳ء)، جماعت سے تراویح کا اہتمام ہوا۔ مولانا حافظ عبدالحلیم صدیقی نے تراویح پڑھائیں اور ایک نہیں کئی قرآن ختم کیے۔ حضرت مفتی صاحب نے جیل کے سپرنٹنڈنٹ میجر فضل الدین کو عید کی مبارک باد میں ایک عربی نظم لکھی۔ اسی زمانۂ اسارت کی ایک اُردو غزل بھی یادگار ہے۔ حضرت مفتی صاحب کی یہ واحد غزل ہے جو خاکسار کی نظر سے گزری ہے اور حضرت مرحوم کے دوسرے دستیاب شدہ کلام کے ساتھ اس تالیف میں محفوظ کردی ہے۔ اس تفصیل سے معلوم کیا جاسکتا ہے کہ ملتان جیل کی حضرت مفتی صاحب کی پانچ شعری تخلیقات یادگار ہیں۔ ان میں چار تخلیقات جنوری تا مارچ ۱۹۳۳ء میں تقریباً ڈھائی ماہ کی مدت کی ہیں۔ غزل کے اشعار کے بارے میں تاریخ و ماہ کا تعین دشوار ہے۔ اس کلام کی ترتیب یہ ہے؟

(۱)۔ حضرت امیر شریعت مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی رہائی پر نظم ۷ار رمضان المبارک ۱۳۵۱ھ مطابق ۱۴ر جنوری ۱۹۳۳ء بہ روز ہفتہ کہی گئی تھی۔

یہ نو اشعار کی اردو نظم ہے۔ مولانا امداد صابری کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت امیر شریعت کی رہائی کا حکم اچانک پہنچا تھا اور اسی روز انہیں روانہ کیا جارہا تھا۔ حضرت

مفتی صاحب نے ان کی رہائی پر اپنے جذبات کے اظہار میں یہ نظم فی البدیہہ فرمائی تھی۔

(۲)- دوسری نظم عربی زبان میں پچیس اشعار پر مشتمل ہے اور ملتان جیل کے سپرنٹنڈنٹ میجر فضل الدین صاحب کو عید کی تہنیت کے طور پر لکھ کر دی تھی۔ اس سال عید الفطر ۲۸/ جنوری ۱۹۳۳ء کو پڑی تھی۔ اس لیے خیال کیا جاسکتا ہے کہ یہ نظم رمضان کے آخری ہفتے میں، ۲۰/ جنوری کے بعد کہی گئی ہو گی۔

(۳)- تیسری نظم اردو میں ہے اور رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن لودھیانوی کی رہائی کے موقع پر کہی تھی۔ ان کی رہائی ۲/ فروری ۱۹۳۳ء کو ہوئی تھی۔ یہ بیالیس اشعار کی ایک طویل نظم ہے۔ اور یقین ہے کہ مولانا کی رہائی سے ایک دو روز پہلے کہی گئی ہو گی۔

(۴)- چوتھی نظم بھی اردو میں ہے اور چھبیس اشعار پر مشتمل ہے۔ یہ نظم سحبان الہند مولانا احمد سعید دہلوی کی جیل سے رہائی کی تقریب سے کہی گئی تھی۔ حضرت سحبان الہندؒ کی رہائی مارچ کے مہینے میں ہوئی تھی۔ رہائی کی خاص تاریخ کا علم نہیں ہو سکا۔ اس لیے تالیف نظم کی تاریخ یا اس کے قریبی ایام کا تعین بھی نہیں کیا جاسکتا۔

(۵)- ایام اسارت کی پانچویں تخلیق آٹھ اشعار پر مشتمل ایک غزل ہے۔ مولانا امداد صابری مرحوم نے اس کا حوالہ چوں کہ زمانۂ اسارت ملتان جیل کے ضمن میں دیا ہے۔ اس لیے خیال ہے کہ یہ بھی حبسیہ کلام ہے۔ اس کلام کی بڑی خوبی زبان کی سادگی بیان کی صفائی اور بے تکلف اور راست تخاطب ہے۔ اب قارئین کرام کی خدمت میں یہ تاریخی منظومات اسی ترتیب سے پیش کی جاتی ہیں۔

(۱)

شیر بیشۂ حریت کی رہائی

حضرت امیر شریعت مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی ملتان جیل
سے رہائی کی تقریب سے حضرت مفتی اعظم کی ایک تاریخی نظم

جیل دے بے کس کس کو تم پیچھے قفس میں چھوڑ کر — رشتۂ اخلاص کو کس بے رخی سے توڑ کر
بیڈ منٹن ساتھ کس سے کھیلیں گے پنا، پریم — گوری شنکر کس کی اب کھینچیں گے باہیں موڑ کر
کس سے دل بہلائیں گے اب کھیل کر احمد سعید — مظہر و لدھیانوی بیٹھیں کہاں سر جوڑ کر

بادہ نوشو! اب لپیٹو عیش و عشرت کی بساط — کیوں کہ ساقی چل دیا جام و صراحی چھوڑ کر
خیر! کچھ پروا نہیں جاؤ خدا حافظ! مگر — بھول مت جانا ہمیں! غیروں سے رشتہ جوڑ کر
ہوں مبارک! تم کو آزادی کے اب لیل و نہار — فتح و نصرت پاؤ تم دشمن کی گردن توڑ کر
شیر حریت کی آزادی سے میں تو خوش ہوا — بزدلانِ قوم اب بھاگیں گے میدان چھوڑ کر

جسم گو زندانِ ملتاں میں ہمارے ہیں اسیر
دل مگر جاتے ہیں تیرے ساتھ سینہ چھوڑ کر

(فرنگیوں کا جال: مولانا امداد صابری)

(۲)

التهنية بالعيد السعيد

(عید سعید کی مبارکباد)

نیو سنٹرل جیل ملتان میں زمانۂ اسارت کے یادگار کلام میں حضرت مفتی صاحب کی وہ نظم بہت اہم ہے جو انہوں نے جیل کے سپرنٹنڈنٹ میجر فضل الدین کو عید کی مبارکباد میں ''التهنية بالعيد السعيد'' کے عنوان سے لکھی تھی۔ یہ کہنے کو تو عید کے موقع پر مبارکباد میں رسمااشعار تھے، لیکن مفتی صاحب نے انھیں اس میں حکومت سے بغاوت کی کھلی دعوت دی تھی اور جیساوہ چاہتے تھے، ویسا ہی اس کا اثر ہوا اور نتیجۃً وہ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ اس کی پوری تاریخ میجر مرحوم کی سیرت اور عاقبت بالخیر پر باب ششم میں بہ ضمن تذکرہ شاعری تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اور عربی کلام میں یہ تہنیت بھی درج کر دی گئی ہے۔ اس لیے یہاں تکرار سے گریز کی جاتی ہے اور اس کے اشعار کا صرف اردو ترجمہ درج کیا جاتا ہے تاکہ اس پر کسی تبصرہ و حاشیہ آرائی کے بغیر قارئین کرام اس کے مطالب کی اہمیت اور مفہوم کی سنگینی کا اندازہ فرما سکیں۔ اشعار کا ترجمہ صرف مفتی اعظم کے قلم سے ہے۔

تشریح:

(۱)- مبارکباد پیش کرتا ہوں آپ کو اے وہ ذات کہ ہر قسم کی خیر سے بہرہ اندوز اور بزرگی و شرافت کے لبریز جام سے سیراب و شفایاب ہے۔

(۲)- اور اے وہ ذات کہ تو نے عمدہ اور پاکیزہ اخلاق کے ساتھ مخلوق کے دلوں کو شکار کر لیا ہے۔

(۳)- اور اے وہ شخص کہ تو فضل وسخاوت کی وجہ سے ہر عطاء کرنے والے اور جمع کردہ کو خرچ کرنے والے پر فائق ہے۔

(۴)- عید پر کہ جب وہ آتی ہے تو مخلوق کے دلوں کی گہرائیوں میں سرایت کر جانے والی مسرت لے کر آتی ہے۔

(۵)- میں آپ کو عید کی مبارک باد پیش کرتا ہوں اور عید خوش کن ہے ہر ایسے بزرگ شریف انسان کے لیے جو خوش عیش اور آرزوؤں میں کامیاب ہے۔

(۶)- عید قابل تعریف اور بابرکت ہو کر نیز تمہارے لیے فرح وسرور کا سامان لے کر بار بار آپ کے سامنے آئے۔

(۷)- عید تمہارے پاس زیارت کنندہ دوست کی طرح بار بار آتی رہے اور جو خوشی محبوب لے کر آتا ہے وہی عید لیکر آتی رہے۔

(۸)- عید ان چیزوں کو لیکر آتی رہے جن کو تو چاہتا ہے اور جن سے خوش ہوتا ہے یعنی خیر وصلاح، رشد وہدایت۔

(۹)- احباء صبح ہی صبح ایک دوسرے کی زیارت کرتے ہیں اور معانقہ وملاقات کر کے لطف اندوز ہوتے ہیں۔

(۱۰)- جب آدمی پہلے ہی سے اپنے اہل وعیال میں مسرور ہوتا ہے تو عید آکر مزید فرح وسرور کا باعث ہوتی ہے۔

(۱۱)- لیکن جب عید اس حالت میں آئے کہ آدمی پر جیل خانہ کا دروازہ بند ہو تو رنج وغم کے سوا کچھ نہیں لاتی۔

(۱۲)- فرق عظیم ہے بیوی بچوں کے ساتھ مسرور شریف آدمی کے درمیان اور جیل خانہ کی سختی ومشقت برداشت کرنے والے کے درمیان۔

(۱۳)- اور فرق عظیم ہے درمیان شریف آدمی کے جس کی آنکھیں اپنی ہر خواہش حاصل کرنے کی وجہ سے ٹھنڈی ہوں اور قیدی کے جو جدائی کی آگ میں جل رہا ہو۔

(۱۴)- لیکن ہم لوگ تلواروں کے ساتھ کھیلتے ہیں اور ہرنیوں کو ناپسند کرتے ہیں جبکہ وہ سستی اور ذلت کا باعث ہوں۔

(۱۵)- اور ہم شریف ہیں کہ عطاء کے وقت خیر کے مالک ہوتے ہیں اور بہادر شیر ہیں کہ

لڑائی کے وقت شر کی بیخ کنی کرتے ہیں۔

(۱۶)۔ ہم شیروں کی طرح غلامی کی ذلت برداشت نہیں کر سکتے کیوں کہ دشمنوں کے غلام ہونے کی ذلت سے بڑھ کر کوئی عار نہیں ہے۔

(۱۷)۔ ہم کو بلا جرم قید کیا گیا اور طرح طرح سے ستایا گیا ہمارا جرم اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ ہم ممالک اسلامیہ کی حفاظت چاہتے ہیں۔

(۱۸)۔ اگر کوئی ظالم دفاع کو بھی جرم سمجھے تو سمجھا کرے ہم تو اس کو سرداری سمجھتے ہیں۔

(۱۹)۔ اور اگر ظالم زمانہ ہم سے خیانت کرے تو خائنوں کا معاون مت ہو بلکہ حق آشکارا ہو جائے تو اس کا اتباع کر۔

(۲۰)۔ پس آپ شریف ہیں اور شریف زادہ ہیں اور ہم نے کوئی شریف نہیں پایا کہ وہ ظالم و جابر کا مددگار ہو۔

(۲۱)۔ ہم شریف آدمی کے لیے قیدی کو کرامت سمجھتے ہیں اگرچہ یہی قید بدکار کے لیے عذاب و سزا ہوتی ہے۔

(۲۲)۔ مظلوم کے لیے جیل خانہ عطیہ ہے جو آقا اپنے چہیتے غلام کو عطا کرتا ہے۔

(۲۳)۔ سو بار الہا ہم کو مصیبتوں پر صابر و ثابت قدم رکھ اور دشمنوں کے مقابلہ میں ہماری مدد فرما۔

(۲۴)۔ خدا کرے کہ آپ کے دینی فضل میں برکت ہو اور درجہ میں بلندی، اور اطاعت و نیکی اور تقوے کی توفیق نصیب ہو۔

(۲۵)۔ آپ کو یہ عید بھی مبارک ہو اور اس کے بعد جب تک آفتاب طلوع ہوتا رہے آپ عیدوں سے لطف اندوز ہوتے رہیں۔ (تحفۃ الارب)

(۳)

خدمت خلق بود خلق حبیب الرحمٰن

(از حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحبؒ)

مولوی عزیز الرحمٰن جامعی نے اپنی تالیف لطیف "رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی اور ہندوستان کی جنگ آزادی" میں اس نظم پر یہ تعارف لکھا ہے:

"رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی ۲۰ر فروری ۱۹۳۳ء مطابق ۲۴ر شوال ۱۳۵۱ھ کو اپنی مدت قید ختم کر کے ملتان سنٹرل جیل سے رہا ہوئے۔ رہائی سے دو دن قبل جیل کے تمام ساتھیوں کے ایک مجمع میں حسب ذیل نظم حضرت مفتی کفایت اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے سنائی اور خود اپنے ہاتھ سے کتابت کر کے رئیس الاحرار کو پیش کی۔ یہ نظم رئیس الاحرار کی تمام زندگی اخلاق و عادات فکر و تدبّر جرات و دلیری تحمل و بردباری بڑے چھوٹوں کی عزت و تکریم انکساری و عاجزی غرض کہ اس نظم میں تمام اوصاف زندگی کا بیان ہے۔

رہائی

اے صدیق محترم لدھیانوی — لو تمہاری بھی رہائی آگئی
اے شفیقِ قوم رحماں کے حبیب — آگئی تیری جدائی آگئی
دوستوں کو چھوڑ کر تو بھی چلا — آہ کیسی شاق ہے فرقت تری

قیامِ اسیری

تو رہا جب تک تو اپنی قید کو — قید سمجھا ہی نہیں کوئی کبھی
جیل کیا تھا محفلِ احباب تھی — اور تو تھا اس کی رونق روشنی
تو گیا تو اس میں کوئی شک نہیں — رونقِ بزمِ اسیراں بھی گئی
جیل کے عملے بے بالطف و خوشی — کاربر آری تری مخصوص تھی
جب کبھی اُلجھا کسی کا کوئی کام — تو نے سلجھایا بہ لطف و آشتی

اخلاق

گرچہ باہر صدر تھا احرار کا — پر نہ برتی جیل میں کچھ برتری
زیب دیتی ہے قیادت بھی اسے — جو رہے زنداں میں بن کر لشکری
ہے سیاست خدمتِ قومی کا نام — قوم کے خادم کا حق ہے سروری

ساتھیوں کی خدمت

قیدیوں کی ہر طرح کی خدمتیں
تو نے کیں اے مستحقِ افسری
کچھ نہ سمجھا فرق خویش و غیر میں
سب کی یکساں دل سے خدمت تو نے کی
شیر و شکر ہو کے تو ان میں رہا
رنج و راحت میں تری شرکت رہی
سب ترے مداح ہیں ممنون ہیں
تیری فرقت سے ہیں پژمردہ سبھی
اختلافِ رائے پر بھی دوست ہیں
کیونکہ سچی تھی تری بھی دوستی
کوئی سمجھے یا نہ سمجھے پر تری
سچ یہی خدمات ہیں سب سے بڑی
سب کو یاد آئیں گی تیری خدمتیں
تیرا ایثار اور جودِ حاتمی!

ذاتی اوصاف

شکر ہے اللہ کا اے خوش خصال
حق نے کی تجھ کو عطا نیک اختری
حسن صورت حسن سیرت خوش دلی
خوش کلامی خوش مزاجی دل لگی
تو فقیری میں ہے دل کا بادشاہ
تجھ پہ قرباں شوکت شاہنشہی
حق نے دی ہے تجھ کو جرأت بے نظیر
ہمتِ مردانہ اور عزمِ قوی
نہضت ملیہ میں تھی پانچویں!
یہ اسیری تیری اے حرجری
قیدیوں میں چونکہ اقدم تو ہی ہے
اس لیے حاصل ہے تجھ کو برتری

قید و بند

ہر مصیبت ملک و ملت کے لیے
تو نے کامل خوشدلی سے جھیل لی
بند کر دینے سے تجھ کو جیل میں
تیری ہمت میں نہیں آئی کمی
شیر پنجرے میں ہو جب بھی شیر ہے
لومڑی آزاد بھی ہے لومڑی
اک طرف فرقت کا ہے تیری ملال
دوسری جانب خوشی بھی ہے بڑی
قید مظلومی کی تھی صبر آزما
ختم اطمینان و راحت سے ہوئی
ہے یہ استقلال و ہمت کا ثبوت
آن جیسی تھی تری ویسی رہی

دُعا

ہے دعا میری یہ صدق و سوز سے
اجر کامل دے تجھے ربِّ غنی!

ملک وملت کے لیے قربانیاں
ہوں تری مقبول باصد خرمی

ہو امور ملک وملّت منتظم
دشمنانِ ملک وقفِ مدبری

حافظ وناصر ترا اللہ ہو!
اور ترے ہر کام میں ہو بہتری

مال و زر، اقبال ہوں تیرے غلام
کامیابی گھر کی ہو لونڈی تری

تیرا آوازہ رہے جب تک رہے
گھومتا یہ گنبدِ نیلوفری!

اولاد کے لیے دعا

ہو تری اولاد صالح اور سعید
اور حاصل ہو اسے علم علیؓ

دے اسے اللہ اپنے فضل سے
شوکتِ صدیقؓ و فاروقؓ و غنیؓ

اور ہو دنیا میں ان کا نصب عین
اتباعِ سنّتِ پیغمبری

مبارک باد

جیل سے جانا مبارک ہو تجھے
تہنیت لے مخلصانہ اور دلی

یاں سے جاکر بھول مت جانا ہمیں
ہے یہی بس التماسِ آخری

(ختم شد)

(رئیس الاحرار۔۔اور ہندوستان کی جنگ آزادی، ص ۶۸-۱۶۵)

(۴)

الوداع مولانا احمد سعید دہلوی

۱۹۳۲ء کے اواخر میں حضرت مفتی اعظم اور مولانا احمد سعید دہلوی جمعیت علمائے ہند کے صدر اور سکریٹری، دونوں بزرگ تحریک سول نافرمانی کے دوسرے دور میں گرفتار ہوگئے۔

گرفتاری کے واقعات الگ الگ پیش آئے تھے، لیکن ملتان سنٹرل جیل میں دوسرے بہت سے سیاسی قیدیوں کے ساتھ انھیں بھی جمع کر دیا گیا۔ رہائی تقریباً ایک مہینے کے وقفے سے عمل میں آئی۔ مارچ ۱۹۳۳ء میں مولانا احمد سعید رہا ہوئے اور اپریل میں حضرت مفتی اعظم کو رہائی ملی۔

اس نظم میں فن کی پختگی، فکر کی بلندی، زبان کی سلاست، اسلوب کی دل نشینی، زبان و بیان پر شاعر کی قدرت کی بے شمار خوبیوں کے علاوہ ایک بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ مولانا کی شخصیت، سیرت، اخلاق کے محاسن اور علم و فکر، تحریر و تقریر، مجلس آرائی و خوش بیانی کی خوبیوں کی تصویر کشی میں بہت باریک بینی اور نکتہ آفرینی سے کام لیا ہے۔

جن حضرات نے مولانا کو دیکھا ہے، ان کی صحبت سے فیض اٹھایا ہے اور ان کی تصانیف میں ان کے طرز نگارش کی شگفتگی اور دل کشی کا نظارہ کیا ہے، وہ اس نظم کی زبان و بیان اور طرز اسلوب کی طرفگی کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ حضرت شاعر نے مولانا سے جس شائستگی و نفاست کے ساتھ اپنے تعلق خاطر کا اظہار فرمایا ہے وہ قابل تحسین ہے۔

شاعر نے نظم کے آخر میں اپنا نام، تاریخ، پتا وغیرہ بھی درج فرما دیا ہے۔ نظم یہ ہے۔ ملاحظہ فرمایئے:

چل دیا وہ حال دل سے بے خبر	جان و دل کا ہے سفر جس کا سفر
جس سے وابستہ تھیں میری راحتیں	جانتا تھا میں جسے قلب و جگر
کنج تنہائی کا میرے تھا رفیق	مونس جاں تھا سفر ہو یا حضر
مولوی احمد سعید خوش لقا	واعظ آتش بیاں جادو اثر
شیر دل کان مروت سیر چشم	پیکر صدق و وفا والا گہر
ناظم جمعیۃ اعلام ہند	تجربہ کار و امین و باخبر
چھوڑ کر زنداں میں مجھ کو چل دیا	پھیر لی اُنس و محبت کی نظر
تیری فرقت کا تصور الغیاث	الحذر تیری جدائی الحذر
تیرے دم سے قید خانہ باغ تھا	اور ترے اخلاق تھے اس کے ثمر
چونکہ راضی بالقضا تھا اس لیے	قید کا مطلق نہ تھا تجھ پر اثر
تھی بدولت تیرے بزم عیش گرم	جیل میں دن رات اور شام و سحر
مِلک تیری دوستوں پر وقف تھی	جان بھی دیتا کوئی لیتا اگر

رعب وہیبت سے تری اے مردِ حق　　فوج باطل ہو گئی زیر و زبر
ہیبتِ حق تیرے چہرے سے عیاں　　لرزہ براندام تجھ سے شیر نر
یہ حقیقت ہے کہ کرتی ہے تری　　خوش بیانی دل میں پتھر کے اثر
بے شبہ ہے تیری تقریر بلیغ　　دل نشینی میں کنقشٍ فی الحجر
باغ جمعیۃ مساعی نے تری　　سبز و شاداب و شگفتہ پُر ثمر
تیرا دل ہے مال وزر سے بے نیاز　　فضل حق پر رہتی ہے ہر دم نظر
دیکھ کر قربانیاں تیری ہمیں　　یاد آتے ہیں خلیل نامور
حق ترا حامی ہو اور طالع سعید　　اور قدم چومے ترے فتح و ظفر
ہو تری اولاد تیری جانشین　　مثل تیرے بلکہ فائق ہوں پسر
کارناموں کو ترے زندہ رکھیں　　اور ہر اک ان میں ہو سرِ پدر
اور ہو دارین کی آفات سے　　فضل مولیٰ واسطے تیرے سپر
موردِ الطاف باری تو رہے　　عمر بھر ہر سال ہر شام و سحر
پھولتے پھلتے رہیں تیرے فیوض　　صیت ہو تیرا محیط بحر و بر

لطف سے تیرے ہے امید قبول
پیش کش ہے گرچہ میری مختصر!

محمد کفایت اللہ عفاعنہ مولاہ
اسیر سیاسی اے کلاس، نیو سنٹرل جیل، ملتان
بارک نمبر ۱۱، کمرہ نمبر ۴
مورخہ ۱۱/ مارچ ۱۹۳۳ء مطابق ۱۴/ ذی قعدہ ۱۳۵۱ھ

(۵)

غزل

یہ غزل زمانہ اسارت "جدید سنٹرل جیل ملتان" (مارچ ۱۹۳۲ء تا اپریل ۱۹۳۳ء کی یادگار ہے)

اب یہ دھمکی ہے مرے صیاد کی　　ذبح کردوں گا اگر فریاد کی
جس سے وابستہ تھیں میری راحتیں　　جانتا تھا میں جسے قلب کی ؟

کھیل سمجھے، خوش ہوئے پھیری چھری   ان کے بچپن نے مری فریاد کی
دفن کے بعد آئے تربت پر مری   قبر پر گویا بہشت آباد کی
جانتا ہوں کچھ نہیں حاصل مگر   پڑگئی عادت مجھے فریاد کی
لوح دل پر جب مری تصویر لی   روح تڑپی مانی و بہزاد کی
شاخ طوبیٰ میں نہیں اس کی شبیہ   کیا حقیقت سرو یا شمشاد کی

روئے انور ہی کو تیرے دیکھ کر
سورۂ والشمس میں نے یاد کی

(فرنگیوں کا جال: مولانا امداد صابری)

اَلَا يَا مَالْطَا! طُوبیٰ وَبُشْریٰ   ثَوَیٰ بِكِ مَنْ مَحَا آثَارَ كُفْرٍ
وَ لَمْ تَكُ قَبْلَهٗ اِلَّا خَرَاباً   خَمُوْلاً غَيْرَ مَعْرُوْفٍ بِخَيْرٍ
فَلَمَّا حَلَّهَا عَادَتْ رِيَاضاً   مُنَضَّرَةً مِنَ التَّقْوٰی وَذِكْرٍ
مُكَلَّلَةً بِاَزْهَارِ الْمَزَايَا   وَاَزْهَارُ الْمَزَايَا خَيْرُ زَهْرٍ
اَلَا يَا مَالْطَا ! كُوْنِیْ سَلَاماً   عَلیٰ مَحْمُوْدِنَا الرَّاضِی بِقَدْرٍ
اِمَامُ الْخَلْقِ قُدْوَتُهُمْ جَمِيْعاً   لَهٗ كَرَمٌ اِلَی الْاٰفَاقِ يَسْرِیْ
جُنَيْدُ الْعَصْرِ سِرِّیُّ الزَّمَانِ   غُيُوْثُ فُيُوْضِهٖ تَهْمِیْ وَ تَجْرِیْ
فَرِيْدٌ فِیْ خَلَائِقِهِ الْعِذَابِ   وَحِيْدٌ فِی التُّقیٰ مِنْ غَيْرِ فَخْرٍ
اَشَدُّ النَّاسِ اَمْثَلُهُمْ بَلَاءً   فَيَاشَمْسَ الْهُدیٰ يَا طَوْدَ صَبْرٍ
ذَكَرْنَا يُوْسُفَ الصِّدِّيْقَ لَمَّا   اُسِرْتَ بِغَيْرِ اِسْتِحْقَاقِ اَسْرٍ
لِحَرِّ الْبَيْنِ فِیْ صَدْرِ الْكَئِيْبِ   تَفِيْضُ دُمُوْعُهٗ حُمْرًا كَجَمْرٍ
سَيُنْزِلُكَ الْعَزِيْزُ مَحَلَّ عِزٍّ   وَ يَنْصُرُكَ النَّصِيْرُ اَعَزَّ نَصْرٍ

سَيَكْفِيكَ الْاِلٰهُ فَاَنْتَ مَرْءٌ
كَفَاكَ اللّٰهُ قِدْماً كُلَّ شَرٍّ

(رسالہ شیخ الہند مطبوعہ ۱۹۱۸ء)

الضيف الخائن

للعلامة الاديب الاريب مولانا المفتی محمد کفایت الله نورالله مرقده

ضيوف اتونا فی جلود نيمة — جيا عاو عريا يستضيفون قاريا

و كنا كغيث روض الارض ديمته — فعادت سوا ء روضة او فيافيا

قرينا واويناكم فی ربوعنا — و لم ندَرانا نحن نؤوی الاعاديا

فخنتم مضيفيكم، و عبد تموهم — فصارت اضاحيهم تبارئ اللياليا

فنمنا طويلا نومة مستطابة — ذهلنا بها عما اجترحتم مساويا

مصائب صبت ثم عادت دواهيا

فلم نستفق حتی استحالت مخازيا

الارجوزةالسجنية

للعلامة الاديب الاريب المفتی الا عظم مولانا محمد کفایت الله

نهضنا بتضحية تدوم دماء ها (۱) تلوح علی اذيال حزب التعلل

نعالج من دهر مضاض تعبد (۲) لقوم غشوم ذی مكائد حيّل

اذلوافئا مامن اعزة قومنا (۳) لهم عزة زهراء كالنجم فی عل

بذلنا نفوساماجدات و كل ما (٤) حويناه من مال و عز مبجل

ارقنا دماءً من عروق نقيةٍ (٥) تلوح علی مرالدهور كعندل

و جربت اهل السجن ممن له يد (٦) تمكن من تنكيس حرمبجل

يظنون نطوی الكشح عمانريده (۷) و نخشی عصيا او بنادق جحفل

ولسنا بمجتنبين عما نعده (۸) فرائض ايمان و تقوئ مكمل

(۹)عزائمنا صم صميم عقودها

فليست بواهية ولا هی تنجلی

ترجمہ از واصف:

(۱)- ہم اٹھ کھڑے ہوئے ہیں ایسی قربانیاں دینے کے لیے جن کے خون بہلاوے دینے والے گروہوں کے دامنوں پر ہمیشہ نمایاں رہیں گے۔

(۲)- ہم طویل زمانے سے ایک ایسی قوم کی غلامی کی اذیت جھیل رہے ہیں جو غاصب اور بڑی مکار چال باز ہے۔

(۳)- جنہوں نے ہماری قوم کے معزز خاندانوں اور جماعتوں کو ذلیل کیا جو ایسی روشن عزت کے مالک تھے جیسے بلندی پر ستارہ۔

(۴)- ہم نے جنگ آزادی میں اپنی بڑی بڑی محترم جانیں قربان کی ہیں اور اپنی گاڑھی کمائی اور عزت وعظمت لٹائی ہے۔

(۵)- ہم نے پاکیزہ رگوں میں سے، کلاں سر بلند قامت اونٹ کی طرح (عزت وسر بلندی کے ساتھ) خون بہائے ہیں جو مرور ایام کے باوجود نمایاں رہیں گے۔

(۶)- مجھے جیل خانے کے اُن لوگوں کا تجربہ ہے جن کو کوئی اختیار حاصل ہے وہ معزز احرار قوم کی تذلیل کر کے عہدے حاصل کرتے ہیں۔

(۷)- وہ گمان کرتے ہیں کہ ہم اپنے مقصد سے پہلو تہی کریں گے اور پولیس کے لاٹھی چارج اور فوج کی فائرنگ سے ڈر جائیں گے۔

(۸)- حالانکہ ہم جس چیز کو اپنا ایمان وملّی فریضہ سمجھتے ہیں اس سے ہٹنے والے نہیں ہیں۔

(۹)- ہمارے عزائم نہایت مستحکم، ان کی بندشیں بہت مضبوط ہیں، وہ کمزور ہونے والی اور کھل جانے والی نہیں ہیں۔

التهنئة بالعيد السّعيد

(عید سعید پر مبارکباد)

للاستاذ الفاضل العلامة المفتی محمد کفایت الله الدهلوی (حین کان مسجوناً فی الملتان) الی مرکز دائرة المروّة وانسان ناظرة الفتوة، صاحب العلم والرّائی المتین الشیخ میجر فضل الدین مُدیر السجن المرکزی الجدید بملتان

أُهنّيك یا من فاز بالخیر وارتوے (۱) بکأس دهاقٍ من مکارمَ واشتفٰے

أُهنیك یا من صادافئدة الوری (۲) باخلاقك الزهراء طیبة الشذٰے

اُهنیك یا من فاق بالفضل والندے (۳) عليٍ کُلِّ مَنْ اعطیٰ و انفق ماحویٰ
بعیدٍ اذا وافیٰ اتی بمسرَّةٍ (۴) تَدِبُّ الی اعماق افئدة الوری
اُهنیکم، بالعیدِ والعید معجب (۵) لحرٍ کریمٍ فازبالعیش و المُنیٰ
یعود لکم عوداً حمیداً مبارکاً (۶) علیکم وفیکم جالباً لکُمُ الهنا
یعود الیکم مثلَ حِبٍّ یزورُکم (۷) فیاتی بمایاتی الحبیب اذااتیٰ
یعودالیٰ ماتشتهیه و ترتضیٰ (۸) من العمر بالخیراتِ والرشدوالهدےٰ
یزورالمحبّون الاحبّة بُکرةً (۹) ویلتذُّ کلّ بالعناق و باللقا
اذا العیدُ یاتی المرءَ والمرءُ محتظٍ (۱۰) باهلٍ و مغنیً اورث اللطفَ والهنا
ولکِنّهٗ ان حلَّ والسجنُ مؤصدٌ (۱۱) علی المرءلم یورث سوے الحزن و الشجیٰ
وَ کم بین حرٍّ اذ یُناغی غزالَةً (۱۲) و بین المُعانی محنة السّجن و العنه
و کم بین حرٍ قَرَّ عیناه بالهویٰ (۱۳) وبین سیرٍ یصطلی ضرمة النویٰ
ولکنّنا قوم۔ نلاعب بالظّبیٰ (۱۴) ونقلی ظباءً اذتداعت الی الوٰنے
ونحن کِرام نملكُ الخیر فی الندیٰ (۱۵) ونحن لیُوثُ نحسم الشرّفی الوغیٰ
ابینا اِباءَ اللیّث ذُلَّ تعبّدٍ (۱۶) فلاسُبّة اخزیٰ من الذلّ للعدےٰ
حبسنا وَ اُوذینا بغیر جریمةً (۱۷) فما ذنبنا الا الدفاع عن الحِمیٰ
وان غاشم عدّالدفاعَ جریمةً (۱۸) فانا نریٰ هذاك مِن سودالفتےٰ
وَ اِن خاننا الدهر الغشوم فلاتکن (۱۹) یدَّ الِخَوُؤنِ واقف حقاً اذا انجلیٰ
فانت کریم ابنُ الکریم ولم نجد (۲۰) کریماً معیناً للذی جارو اعتدےٰ
نری الاسرللحرّالوفی کرامةً (۲۱) وان کان رِ جزً اللمواقع فی الخنا
وما السجُن للمظلوم الاعطیّةً (۲۲) یمُنّ بها المولیٰ علےٰ عبدن اصطفےٰ
فیاربّ تثبیتاً وصبراعلے البلا (۲۳)ویاربّ عونا وانتصارامن العدیٰ
وبورکتَ فضل الدّین وازددت رِفعةً (۲۴)ووُفِّقتَ بالطاعات والخیر و التُّقےٰ
(۲۵) لیهنك عید الفِطرهذاوبعده
تمتّعت بالاعیاد ماشرق الذکا

حل لغات:

اھنیک تھنیۃً مبارک باد پیش کرنا، ارتواار تواءً سیراب ہونا، کاس دہاق لبریز جام، اشتفیٰ شفاپانا، شذی بو کی تیزی، تدبّ السقم بیماری کا جسم میں سرایت کرنا، اعماق جمع عُمق گہرائی الھنا خوشی مسرت، العناق معانقہ، محظ نصیب والا، مغنی گھر، السجن قید خانہ، موصد او صد الباب دروازہ بند کرنا، الشجی وہ ہڈی جو حلق میں لگ جائے مراد رنج وغم، ینا غی مناغاۃ۔ الرجل مقابلہ کرنا، قریب ہونا، مُعانی اسم فاعل ہے معاناۃً مشقت برداشت کرنا، یصطلی اصطلاءً آگ تاپنا، ضرمۃ چنگاری، نوی فراق، بعد، ظُبی، جمع کرنا تلوار وغیرہ کی دھار، نقلی قلاءً۔ بغض رکھنا، ظباء جمع ظبی ہرن، ونیٰ سُستی، لیوث جمع لیث شیر، نحسم (ض) حسماً جڑ سے کاٹنا، وغیٰ شور، لڑائی، سبّۃ گالی، عار، عدیٰ جمع عدو دشمن، حمیٰ ہر وہ چیز جس کی حفاظت ضروری ہو، غاشم ظالم، سود سرداری، غشوم ظالم، نخوون خیانت کرنے والا، جار جوراً ظلم کرنا، رجز عذاب، الخناء فحش کلامی۔

تشریح:

(۱)- مبارکباد پیش کرتا ہوں آپ کو اے وہ ذات کہ ہر قسم کی خیر سے بہرہ اندوز اور بزرگی و شرافت کے لبریز جام سے سیراب و شفایاب ہے۔

(۲)- اور اے وہ ذات کہ تو نے عمدہ اور پاکیزہ اخلاق کے ساتھ مخلوق کے دلوں کو شکار کرلیا ہے۔

(۳)- اور اے وہ شخص کہ تو فضل و سخاوت کی وجہ سے ہر عطاء کرنے والے اور جمع کردہ کو خرچ کرنے والے پر فائق ہے۔

(۴)- عید پر کہ جب وہ آتی ہے تو مخلوق کے دلوں کی گہرائیوں میں سرایت کرجانے والی مسرت لے کر آتی ہے۔

(۵)- میں آپ کو عید کی مبارک باد پیش کرتا ہوں اور عید خوش کن ہے ہر ایسے بزرگ شریف انسان کے لیے جو خوش عیش اور آرزوؤں میں کامیاب ہے۔

(۶)- عید قابل تعریف اور بابرکت ہو کر نیز تمہارے لیے فرح وسرور کا سامان لے کر بار بار آپ کے سامنے آئے۔

(۷)- عید تمہارے پاس زیارت کنندہ دوست کی طرح بار بار آتی رہے اور جو خوشی محبوب لے کر آتا ہے وہی عید لیکر آتی رہے۔

(۸)- عید ان چیزوں کو لیکر آتی رہے جن کو تو چاہتا ہے اور جن سے خوش ہوتا ہے یعنی خیر وصلاح، رشد وہدایت۔

(۹)- احباء صبح ہی صبح ایک دوسرے کی زیارت کرتے ہیں اور معانقہ وملاقات کر کے لطف اندوز ہوتے ہیں۔

(۱۰)- جب آدمی پہلے ہی سے اپنے اہل وعیال میں مسرور ہوتا ہے تو عید آکر مزید فرح وسرور کا باعث ہوتی ہے۔

(۱۱)- لیکن جب عید اس حالت میں آئے کہ آدمی پر جیل خانہ کا دروازہ بند ہو تو رنج وغم کے سوا کچھ نہیں لاتی۔

(۱۲)- فرق عظیم ہے بیوی بچوں کے ساتھ مسرور شریف آدمی کے درمیان اور جیل خانہ کی سختی ومشقت برداشت کرنے والے کے درمیان۔

(۱۳)- اور فرق عظیم ہے درمیان شریف آدمی کے جس کی آنکھیں اپنی ہر خواہش حاصل کرنے کی وجہ سے ٹھنڈی ہوں اور قیدی کے جو جدائی کی آگ میں جل رہا ہو۔

(۱۴)- لیکن ہم لوگ تلواروں کے ساتھ کھیلتے ہیں اور ہرنیوں کو ناپسند کرتے ہیں جبکہ وہ سستی اور ذلت کا باعث ہوں۔

(۱۵)- اور ہم شریف ہیں کہ عطاء کے وقت خیر کے مالک ہوتے ہیں اور بہادر شیر ہیں کہ لڑائی کے وقت شر کی بیخ کنی کرتے ہیں۔

(۱۶)- ہم شیروں کی طرح غلامی کی ذلت برداشت نہیں کرسکتے کیوں کہ دشمنوں کے غلام ہونے کی ذلت سے بڑھ کر کوئی عار نہیں ہے۔

(۱۷)- ہم کو بلا جرم قید کیا گیا اور طرح طرح سے ستایا گیا ہمارا جرم اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ ہم ممالک اسلامیہ کی حفاظت چاہتے ہیں۔

(۱۸)- اگر کوئی ظالم دفاع کو بھی جرم سمجھے تو سمجھا کرے ہم تو اس کو سرداری سمجھتے ہیں۔

(۱۹)- اور اگر ظالم زمانہ ہم سے خیانت کرے تو خائنوں کا معاون مت ہو بلکہ حق آشکارا ہو جائے تو اس کا اتباع کر۔

(۲۰)- پس آپ شریف ہیں اور شریف زادہ ہیں اور ہم نے کوئی شریف نہیں پایا کہ وہ ظالم وجابر کا مددگار ہو۔

(۲۱)- ہم شریف آدمی کے لیے قیدی کو کرامت سمجھتے ہیں اگرچہ یہی قید بدکار کے لیے عذاب وسزا ہوتی ہے۔

(۲۲)- مظلوم کے لیے جیل خانہ عطیہ ہے جو آقا اپنے چہیتے غلام کو عطا کرتا ہے۔

(۲۳)- سوبار الٰہا ہم کو مصیبتوں پر صابرو ثابت قدم رکھ اور دشمنوں کے مقابلہ میں ہماری مدد فرما۔

(۲۴)- خدا کرے کہ آپ کے دینی فضل میں برکت ہو اور درجہ میں بلندی، اور اطاعت و نیکی اور تقوے کی توفیق نصیب ہو۔

(۲۵)- آپ کو یہ عید بھی مبارک ہو اور اس کے بعد جب تک آفتاب طلوع ہوتا ہے آپ عیدوں سے لطف اندوز ہوتے رہیں۔ (تحفۃ الارب)

روض الرياحين

للاستاذ الفاضل العلامة المفتی
محمد کفایت الله الدہلوی

مطبــع افضــل المــطابـع، دهــلی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

روض الریاحین

عَرَفْتُ اللهَ رَبِّیْ مِنْ بَعِیْدٍ
اپنے پرودگار کو میں نے دور سے پہچانا

فَکَمْ بَیْنَ الْاِلٰہِ وَالْعَبِیْدِ
کیونکہ خالق اور بندوں کے درمیان بہت فاصلہ ہے

عَرَفْتُ اللهُ رَبِّیْ مِنْ قَرِیْبٍ
اپنے پروردگار کو میں نے نزدیک سے پہچانا

اَشَدَّالْقُرْبِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ
اور وہ نزدیکی میری شہرگ کی نزدیکی سے بھی زیادہ ہے

قَرِیْبٌ رَحْمَۃً مِّنَاوَعِلماً
وہ بلحاظ علم ورحمت ہم سے قریب ہے

بَعِیْدٌ فِیْ اکْتِنَاہٍ عَنْ بَعِیْدٍ
اور ادراک ذات میں بے انتہا دور ہے

تَعَالیٰ عَنْ سِمَاتِ النَّقْصِ طُرّاً
تمام صفات رذیلہ ناقصہ سے منزہ ہے

تَقَدَّسَ فِی الصِّفَاتِ عَنِ النَّدِیْدِ
صفات کمالیہ میں کوئی اُس کا شریک نہیں

فَلَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَئیٌ وَّ لَیْسَتْ
کوئی چیز اس کے مانند اور مشابہ نہیں

مُشَارَکَۃُ الْاَسَامِیْ فِی الْعَدِیْدِ
اور محض نام کی شرکت کسی شمار میں نہیں ہے

تَنَزَّہَ عَنْ مُّشَابَھَۃٍ وَّ جِنْسٍ
وہ ہر قسم کی مشابہت اور مجانست سے مبرا ہے

فَسُبْحَانَ الْمُقَدَّسِ وَ الْمَجِیْدِ
پس ہم اُس پاک اور بزرگ کی پاکی بیان کرتے ہیں

اَظَل عَلٰی رؤسِ الخلق فَضلاً
اس نے محض فضل سے بخششوں کا دراز سایہ

بِظل من عطایاہُ مدیدٍ
مخلوق کے سروں پر پھیلا رکھا ہے

مَلِیْك قادر حی قدیم
عالم کا مالک سب پر قادر زندہ اور قدیم ہے

عَلیم بِالمغیبِ و بِالشهیدِ
تمام چھپی اور کھلی ہوئی باتوں کو جانتا ہے

تبارك مَنْ حَکیم ذی اختراعٍ

و مُبِدع ذٰلِكَ النَّسقِ السدیدِ

بہت برکت والا حکیم بغیر نمونہ پیدا کرنے والا
اور اس عمدہ اور درست ترتیب پر عالم کا موجد

بریٰ خلقاً وَ اٰتٰھُم ھُدٰی ھُم
مخلوق کو پیدا کیا اور ہدایت کے اسباب مہیا کر دیے

وَ عقلاً لِلفِرارِ عن المحیدِ
اور بھاگنے کی جگہوں سے بھاگنے کے لیے عقل عنایت کی

وارسلَ رُسُلَہٗ تترٰی الیھِم
اور پھر اپنے رسول اُن کی طرف لگاتار بھیجے

لتمییز الشَّقِیُ عَن السَّعیدِ
تاکہ نیک اور بد میں امتیاز ہو جائے

وَمِن بَین النبیین اصُطفےٰ مَن
اور پھر نبیوں میں اُس (رسول) کو برگزیدہ کیا

حَوٰی کنزَ العُلُومِ مِنَ الحَمیدِ
جس نے علوم (لدنیہ) کے خزانے خدائے حمید سے حاصل کیے

فَاَرشدَنَااِلیٰ دَارِالسّلام
پس اس نے دارالسلام (جنت) کی طرف ہماری رہنمائی کی

وَاوعدَنامن البطشِ الشُّدیدِ
اور خدا کی سخت گرفت سے ہم کو ڈرایا

وَاوَصَلنا اِلیٰ شُرفِ العُلومِ
اور علوم کے کنگروں پر ہم کو پہنچا دیا

وَ نجّانَامِنَ الجَھلِ المُبیدِ
اور جہالت مہلکہ سے ہم کو نجات دی

اَنَارَصُدُوُرنَاَ عِلماً وَّ حِکماً
ہمارے سینوں کو علم و حکمت سے روشن کر دیا

وَاتانا کِتاباً مِّنُ حمیدِ
اور خدائے حمید کی جانب سے ایک کتاب ہمارے پاس لائے

کتابٌ جَاءَ بِالحَقِّ المُبیُنِ
وہ کتاب جو کھلے ہوئے حق کو اپنے ساتھ لائی

اَقَامَ الدّینَ رَغماً لِّلعَنیدِ
اور دین کو منکرین کی مرضی کے خلاف قائم کر دیا

کِتابٌ رَّحمَۃٌ لِلمُؤمِنِین
وہ کتاب مومنین کے لیے رحمت ہے

وَ بُرھَانٌ وَّ نُورٌ لِلسَّعِیدِ
اور نیک بختوں کے لیے برہان اور نور ہے

کِتابٌ فِیہِ اِرشَادُالطَّرِیقِ
اس کتاب میں طریق حق کی ہدایت ہے

شِفَاءٌ مِّنُ سَقَامِ لِلعَمِیدِ
اور مریضان قلب کی بیماریوں کے لیے شفا ہے

کتاب فیہِ بُشریٰ بالنعیم
کتاب فیہِ صَاعِقۃُ الوَعِیدِ

اس کتاب میں فرمانبرداروں کے لیے نعمتوں کی بشارت
اور منکرین کے لیے وعید کی بجلی ہے

فَجاءَ بِهٖ رَسُوْلُ اللهِ حَقاً
اُس کتاب کو بیشک خدا کے رسول لائے
وَعَلَّمَناهُ بِالوجهِ السَّدِيدِ
اور بہت اچھی طرح ہم کو اُسکی تعلیم دی

وَوَعَّظَنَا وَ ذَكَّرَنا بِرِفْقٍ
اور ہم کو نرمی اور احسان کے ساتھ
وَاِحْسَانٍ وَّ تَالِيفِ الكَبِيدِ
نصیحت فرمائی اور غمزدوں کی تالیف کی

وَفَسَّرَمُجْمَلَ الْقُرْآنِ يُسراً
قرآن کی مجمل آیتوں کی بغرض آسانی
بِفَصْلِ خِطَابِهِ الْحَقِّ الْمُفِيدِ
اپنے فائدہ بخش صاف کلام سے تفسیر فرمائی

وَقَالَ خُذوا كِتابَ اللهِ عنى
اور فرمایا کہ کتاب اللہ مجھ سے سیکھو
بِاِتقانٍ وَّ اِحْكامٍ مَّزِيدٍ
اور مضبوطی اور پختگی سے اُسے یادرکھو

يُبَلِّغُ شَاهِد مَنْ غابَ عَنّى
اور موجودین پیچھے آنے والوں کو پہنچائیں
وَيُلْقِيهِ الْقَرِيب على البَعِيدِ
اور نزدیک والے دور والوں کو سکھائیں

فَرُبَّ مُبَلَّغٍ اَوعىٰ فَقِيهٍ
کیونکہ بسااوقات وہ شخص جس کو سکھایا جاتا ہے
يَرىٰ مالارأىٰ عين الشهيدِ
سکھانے والے سے زیادہ سمجھدار اور باریک بیں ہوتا ہے

فَذاالتَّبليغ اوصانا النبیُّ
تو اس تبلیغ کی نبی علیہ السلام نے
بِهٖ حتماً بِاِيْصاءٍ اكيْدٍ
ہم کو نہایت تاکید اور اہتمام سے وصیت فرمائی

فَشَمَّرَذَيْلَهُم عُلَمَاءُ شَرعٍ
پس علمائے شریعت بہ تعمیل ارشادِ مبارک
لِاِبْلاغٍ وَّاِرشادِ الشرِيْدِ
گم شدہ کی رہنمائی اور تعلیم کے لیے مستعد ہوگئے

اَشاعُوا الْعِلْمَ قَرْناً بَعْدَ قَرنٍ
اور انہوں نے قرناً بعد قرن علم دین کی اشاعت کی
وَشادوا الدِّيْن كَالقَصرِالْمَشِيدِ
اور دین کو ایک مضبوط قلعہ کی مانند مستحکم کردیا

جَزٰهُمْ رَبُّهُمْ عَنّا وَعَنْهُمْ
وَاوىٰ هم بِجَنّاتِ الْخُلُودِ

خدائے تعالیٰ اُن کی مساعی جمیلہ کا ہماری جانب سے
بھی بدلہ اور ہمیشگی کے باغوں میں اُن کو جگہ دے

فَاَشْرَقَ نُورُہٗ شَرْقَ الغزالَه
پس آفتاب کی طرح علم کا نور چمک اُٹھا

وَنَوَّرَمَاعلیٰ وَجْہِ الصَّعِیدِ
اور روئے زمین کو اپنی چمک سے روشن کردیا

اَزَاحَ مِنَ القلوبِ صُداءَ جَھْلٍ
دلوں پر سے زنگ جہالت صاف کردیا

وَ نَوَّرَھَا بِتَوْحِیْد الوَحِیدِ
اور انکو خدائے یکتا کی توحید سے منور کردیا

فَکَانَ الْعلمُ مَرْفُوعَ الْبِنَاءِ
اسی طرح ایک مدت تک علم دین عالی شان رہا

مَصُوْناً عَنْ یَدالجھلِ الْمُبِیْدِ
اور جہالت مہلکہ کے ظالم ہاتھ سے بچا رہا

اِلیٰ اَنْ طَالَ اَیْدی الدّھرِ جوراً
آخر کار زمانے نے دست ظلم دراز کیا

عَلَیْہِ فَصارَکالشّیءِ الْفَقِیدِ
اور علم اس کے سبب سے گمی ہوئی چیز بن گیا

خَبَتْ نِیْرَانُہٗ بَعْدَاضْطرامٍ
اُس کے شعلے جو بلند تھے بجھ گئے

وَاَمْسیٰ نَازِلاً بَعْدالصُّعُوْدِ
اور بلندی سے پستی کی جانب مائل ہوگیا

وَصار البدر ینئیٔ عَن افوْلٍ
اس کا بدر کامل قریب تھا کہ ڈوب جائے

وَ ظَلَّ الموجُ یُنبئُ عَنْ جُمودِ
اور اسکی موجیں قریب تھیں کہ جم جائیں

فَاَلھَمَ ربُّنَا الْعُلَمَاءَ تاسیس
پس خدائے تعالیٰ نے علماء کو الہام فرمایا

دورِ العِلمِ فِیْ شانٍ جدیدٍ
کہ نئی شان سے علم کی عمارت کی بنیاد رکھیں

فَاَسَّسَ قَاسِم نَانُوْتَوِیٌّ
تو مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ نے

اَسَاساً شامخاً عَالی العُموْدِ
ایک عالیشان رفیع القدر مدرسہ کی بنیاد ڈالی

اَعَادَ بھاءَ وَجْہِ الْعِلم درساً
جسنے درس و تعلیم کے ذریعہ سے علم کا چہرہ

وَ تَعْلِیماًلْقومٍ مُّستفیدٍ
پھر منور اور تروتازہ کردیا

وَ لَمّا جَاءَہٗ الْاَجلُ الْمُسَمّیٰ
اور جب کہ آپکی اجل مقدر کا وقت آگیا

مَضیٰ فِرحاً اِلی المَولیٰ الْحمیدِ
توخوش خوش اپنے مولیٰ کے دربار میں چلے گئے

وَاَوْصیٰ اَھْلَہٗ اَنْ لَّاتَوَانُوا
بِتوزیع العُلُوْمِ عَلیَ الحدیدِ

اور اپنے لوگوں کو وصیت فرماگئے کہ زمین پر
علوم دین کی اشاعت میں سستی نہ کرنا

فشمرتابعوہُ الذَّیل جُھداً
وشاحُ وصاتِہٖ مِنُھم بجیدٖ
پس آپکے تابعین کوشش کے لیے مستعد ہوگئے
بحالیکہ آپکی وصیت کا ہار اُن کے گلے میں تھا

فشادوامابناہُ وَ شیَّدوہُ
بِاُحکامٍ کَقصرٍ مِّنُ حدیدٖ
پس جس بنا کو آپ بناگئے تھے اُسے بلند
اور لوہے کے محل کے مانند مضبوط اور استوار کردیا

ومنھم صاحبُ الفضلِ العظیم
اَمین الدین ذوالرّای السدیدٖ
ان تابعین میں سے صاحبِ فضل عظیم
اور درست رائے والے مولوی امین الدین
بھی ہیں

رفیقی مونسی حِبّی اَنیسی
نصیحی مُشفقی خلّیٰ ودودٖ
وہ میرے رفیق مونس اور دوست انیس ہیں
میرے خیر خواہ شفیق اور مخلص مہربان ہیں

اقامَ ببلُدۃِ الدّھلی ونادیٰ
اَھالیھا الیٰ اَمرٍ رّشیدٖ
دہلی میں انہوں نے اقامت کی
اور اہل دہلی کو ایک عمدہ چیز کی جانب بلایا

دَعاً ھُم بَعُدان کانوا حیاریٰ
بجھل ھایمین فی بدیدٖ
جبکہ دہلی والے جہالت کے میدان میں
حیراں وسرگرداں تھے انکو ہدایت کی طرف پکارا

فَحضّھم علیٰ نَشرِ الُعُلوم
وَاَسّس مدرس العِلمِ المفید
اور اشاعت علوم دینیہ کی انہیں رغبت دلائی
اور فائدہ بخش علم کی ایک درس گاہ قائم کی

لِاِحُیاءِ الرُّسومِ رُسُومِ دین
وَ ترویج العلومِ علی الصَّعیدٖ
جس سے غرض محض آثار دین کو زندہ کرنا
اور علوم دینیہ کو زمین پر پھیلانا تھا

بِاِخُلاصٍ مِّنَ الُقلبِ السَّلِیمِ
وَتَوُفیقٍ مِّنَ الرَّبِّ المجیدٖ
سچے ارادے اور خالص نیت سے
اور خدائے بزرگ و برتر کی توفیق سے

وَذافیٰ مَسجدٍ عَالٍ مُّطَلّیٰ
رفیع السّمكِ مَرفُوع الوصیدٖ
یہ کہاں؟ عالیشان سنہری مسجد میں
جس کی چھت اونچی دہلیز بلند ہے

وَ سَمّاہُ بِمدرسۃِ اَمینیۃٍ
تلقیبہ بِاسم فریدٖ

اور مدرسہ کا نام مدرسہ امینیہ رکھا | تاکہ یہ مدرسہ ایک خاص نام کے ساتھ ممتاز رہے

فَلَبیٰ دَعوۃَ المولیٰ الأمین | مُحِبو الدینِ اَربَابُ الجدودِ
پس مولوی امین الدین کی دعوت کی اجابت کی | دین کے دوست رکھنے والے دولتمندوں نے

خُصوصاً سابق الخیرات۔ اسحٰق | مفیض الجودِ مُغتنمُ الوجودِ
بالخصوص بھلائیوں میں آگے رہنے والے حاجی محمد اسحٰق نے | جو سخاوت پھیلانے والے مغتنم الوجود ہیں

مَلاذُ اَرامِلٍ ماویٰ الیَتامیٰ | حَلیفُ مَحاسِنٍ غیظُ الحسودِ
مساکین کے پشت پناہ یتیموں کے جائے پناہ | خوبیوں کے مجمع حاسدوں کے لیے باعث غیظ

وَ کُل مجامل جعدٍ کریمٍ | مُفیضِ جلائل الخیرِ العتیدِ
اسی طرح ہر نیکوکار سخی شریف | جمع کیے ہوئے مال میں سے بڑی بڑی سخاوت کرنے والے نے

وَثابَ الیہِ فوج بغد فوجٍ | من الطُّلبَاءِ فی نَظم رَّتیدٍ
اور طالب علموں کی فوجوں کی فوجیں | اُنکے پاس ایک انتظام کیساتھ اکٹھی ہو گئیں

فداراھُم و آساھُم طِلاباً | لِفَضلِ القادِرِ المحی المُعیدِ
انہوں نے طلبہ کی غمخواری کی اور اچھی طرح پیش آئے | خدائے محی و معید کے فضل کی خواہش میں

وَقالَ لاوُثِرَنَّ وَ فودَ خیرٍ | بِما عِندِیَ طریفیَ اَو تلیدٍ
کہا کہ میں ان طالبان خیر کو اختیار کروں گا | اپنے نئے اور پرانے مال کے خرچ کرنے میں

فَاَنعَمَھُم عَلیٰ قَدرِ المزایا | بانعامِ الکثیرِ اَوالزّھیدِ
پس ان کو ان کی فضیلتوں کے موافق | تھوڑا یا بہت بقدرِ استحقاق انعام دیا

وَاویٰ ھُم وَ البسَھُم بروداً | وَاَشبعھم بِکاساتِ الثَّرِیدِ
اُن کو ٹھکانا دیا اور لباس پہنایا | اور گوشت روٹی کے پیالوں سے اُنہیں سیر کیا

وَعلّمھم بِتَعلیمٍ اَنیقٍ | وَھَذَّبَھُم بتَھذیب سَدیدٍ
اور نہایت عمدہ طریقہ سے انہیں تعلیم دی | اور اچھی طرح اُن کے اخلاق کی تہذیب کی

فَفازوابالهُدیٰ بَعدَ الضَّلالِ
پس وہ گمراہی کے بعد ہدایت پر کامیاب ہوئے

وَ بَعدَ الجدبِ بِالعیش الرَّغیدِ
اور قحط زدگی کے بعد خوشی کی زندگی پائی

وَصَارُوا کُلُّهُمْ مَثَلَ النجوم
اور سب کے سب ستاروں کے مانند ہوگئے

وَ شُجعانِ المعارِكِ کالأُسودِ
اور شیروں کی طرح میدان جنگ کے
بہادر بن گئے

نجومِ هِدایةٍ للطَّالِبینَ
طالبان ہدایت کے لیے رہنمائی کے ستارے

أُسودوغیً لِشَیُطٰنٍ مَّرِیدِ
شیطان سرکش کے لیے لڑائی کے شیر

وَلاَ کنجوم سقفٍ مُّسُتدیرٍ
آسمان کے ستاروں کی طرح نہیں

وَلاکاسودِ غاباتِ الحدیدِ
اور جنگل کے شیروں کے مانند نہیں

فَللاولیٰ اُفول بَعد شَرُق
کیونکہ آسمان کے ستارے تو نکل کر
غروب ہو جاتے ہیں

وَ فی الأُخریَ افُتراس للُحلودِ
اور جنگل کے شیر لوگوں کے بدن اور
چمڑے پھاڑتے ہیں

وَ شَرقُ عُلومهم شرق مُّدام
اور انکی علمی روشنی ہمیشہ باقی رہنے والی ہے

وَ هُمُ قطّاعُ جهلٍ لا قدیدِ
اور یہ جہالت کے ٹکڑے کرتے ہیں نہ چمڑوں کے

اَسَاتِذُهُمُ بُدُوربَلُ شموس
ان کے استاد بدر کامل بلکہ مہر منیر ہیں

کُماۃُ الُحقِّ اَقُیالُ الُجنودِ
حق کے بہادر جماعتوں کے سردار ہیں

ضیاء الحق ضَوُءُ العالمینَ
ضیاء الحق عالم والوں کی روشنی ہیں

وَ محی اللّیلِ فی نورِ السحودِ
تمام رات سجدوں کی روشنی میں جاگنے والے

وَ قاسِمهم نبیه المَعیٌ
اور اُن میں محمد قاسم باخبر ذکی الطبع ہیں

وَهازِمُ جَیُش مُبُتدِعٍ طریدِ
اہل بدعت کے لشکروں کو شکست دینے والے

وَانظارٌ لَهٗ انظارُ لُطفٍ
اور انظار حسین۔ ان کی مہربانی کی نگاہیں

اِلیٰ صِفرِالیَدِ الُمُضنَی الکمیدِ
غمزدوں، شکستہ حالوں، تنگدستوں کی
جانب رہتی ہیں

تری عبُدَ الُغفورِ لِخَوفِ ربٍ

غضیض الطَّرُفِ ذامَشیٍ وَّئیدِ

تم عبدالغفور کو دیکھو گے کہ خدا کے خوف سے
اُنکی نگاہیں پست اور چال دھیمی رہتی ہے

وَ مُقرِئُھمُ نبیل رَّحمۃُاللہ
عَلیھِم رَحمۃُ الُمولیَ المجیدِ
اُن میں مدرس قرآن ایک بزرگ رحمت اللہ ہیں
اِن سب پر خدائے بزرگ کی رحمت ہو

فَکُلُّھم لَھُمُ اَقدامُ صِدُقٍ
وَکُلّھم لَحَلّالُ العقیدِ
یہ سارے صاحبِ آثار حسنہ ہیں
اور سب کے سب مشکل گرہوں کے کھولنے والے ہیں

وَ نَخُتِمُ ذَاالکلامَ بِذِکرِ حِبرٍ
فَفَقِیدِ المِثُلِ عَلّامٍ فَرِیدِ
اب ہم ایک بڑے عالم کے ذکر پر یہ کلام ختم کرتے ہیں
وہ بے نظیر علامہ یکتائے زمانہ ہیں

مریغ العِلمِ مُقتنصِ الفُنونِ
لَہٗ کُلُّ المَزَایَا کَالمَصِیدِ
علم کو ڈھونڈ نکالنے والے فنون کو شکار کرنیوالے
تمام فضیلتیں ان کے فتراک کا شکار ہیں

نبیہٍ فَائِقِ الاَقُرانِ یُدُعیٰ
بِانوَرُ شاہُ موموقِ الحسودِ
بزرگ مرتبہ ہمسروں پر فائق جن کو
انور شاہ کہہ کر پکارا جاتا ہے حاسدوں کے محبوب

فَھٰذالحِبرُ غارِس ذَالنخیلِ
وَاَوّل مُوقِظِ القَومِ الرّقُودِ
کیونکہ یہ علامہ اس درخت کے لگانیوالے ہیں
اور سوتی قوم کو اول اول جگانے والے

وَما اَنا مِثُلَھُم فِی الفَضلِ لٰکِن
رَجَائی اَنُ یُغطُونی بِجُودِ
اور میں فضیلت میں اِن سب کی طرح نہیں ہوں
پر امید ہے کہ یہ سب مہربانی سے مجھے ڈھانک لیں

وَ اَنُ اُعطٰی نَصیباً وّافِراً مِنُ
شَرابِ الفَضلِ مِنُ حُبِّ القعیدِ
اور امید ہے کہ مجھے ہمنشیں کی محبت سے
شرب فضل میں سے کافی حصہ نصیب ہوجائے

فَھٰذاالجمع جمع لا یخیب
جَلِیُسُھُم مِن الُخیر المَدِیدِ
کیونکہ یہ وہ جماعت ہے جن کا ہمنشیں
اُنکی متعدی بھلائی سے محروم نہیں رہتا

شرحتُ الحَالَ شَرحاً مُّستبیناً
بِنَظُمٍ یّزُدری نَظم العقودِ

حالات مدرسہ میں نے واضح طور پر بیان کردیئے
ایسی نظم میں جو موتیوں کے ہاروں کو حقیر کردے

ولا بالطوع بَل للاِمتِثالِ
یہ نظم اپنی خوشی سے نہیں بلکہ بہ تعمیل ارشاد
لاَمرِالمُحسِنِ المولیٰ الودودِ
اپنے دوست محسن مہربان کے لکھی ہے

وَلَیسَ الشِعرُمِن دابی وَشُغلیٰ
شعر گوئی میرا طریقہ اور شغل نہیں ہے
وَما اَناللقَوافی بالعَھیدِ
اور نہ میں قصائد کا ہم پیمان ہوں

فلولاالله انزل فی الکتابِ
ہاں اگر خدائے تعالیٰ۔ قرآن مجید میں
اَلم تر انهم کثرت قصیدہٖ
الم ترانہم۔ نازل نہ فرماتا تو میرے قصیدے بکثرت ہوتے

وَحسبی قول مولینا الهُمام
اور اب تو مجھے مولینا امام ہمام
محمدنِ بن ادریس العمیدِ
محمد بن ادریس کا قول کافی ہے

فلوَ لا الشِعُربالعُلماءِ یزری
پس اگر شعر گوئی علماء کے لیے منقصت نہ ہوتی
لکُنتُ الیومَ اشعَرَ مِن لبیدِ
تو میں آج لبید سے زیادہ شاعر ہوتا

اِلٰہ العالَمِ ارزقنی صلاحاً
اے اللہ العالمین مجھے صلاح و تقویٰ روزی کر
وَ حِفظاً مِّن مخائیلِ البُیُودِ
اور مظنہ ہائے ہلاکت سے محفوظ رکھ

دَعوتك بالتضرع وَالخضوع
میں تضرع اور خشوع کے ساتھ دعا کرتا ہوں
وَاِخلاصِ مِّنَ القَلبِ الحَریدِ
اور یکہ وتنہا دل سے تجھے پکارتا ہوں

وَقُلتَ اُجیبُ دَعوۃ مَن دَعانیٗ
اور تو فرما چکا ہے کہ میں اُس شخص کی
بِقلبِ ذی خُشوعِ مِّن عَبیدِ
جو خشوع سے مجھے پکارے دعا قبول کرتا ہوں

فیاربِ اسقِنی راحَ الغرام
تو اے میرے خدا مجھے ایسی شراب شوق پلا
فَاَصرَخَ دَائماً هل مِن مَّزیدِ
کہ میں ہمیشہ ہل من مزید پکارتا رہوں

وقِ العَبدَالذلیل کفایة الله
اور اپنے ذلیل بندے کفایت اللہ کو جو
حلیف الحُزنِ وَالعین الجمودِ
غموں اور خشک آنکھوں کا حلیف ہے

عنِ الاثامِ والاٰفاتِ طُراً
تمام آفتوں اور گناہوں سے محفوظ رکھ

وَاوصِلهُ الیٰ ماویٰ الخلودِ
اور ہمیشگی کے ٹھکانے اسے پہنچادے

وَافرِغ من شابیب الرّضاءِ
اور اپنی رضامندی کی موسلادھار اس پر برسا

علیهِ وصنه عَنُ عَقدٍ فَسیدٍ
اور فقر کے معاملات سے اسے بچا

وَ فرض شُکر سادَ تِنا الکرام
اور اپنے بزرگ سرداروں کا شکریہ بھی فرض ہے

ذوِی النعماءِ وَ الخیرِ المَدیدِ
جو ممتد بھلائی اور بہت نعمتوں والے ہیں

هُداۃِ الخلقِ منهاجاً قویُما
خلق خدا کو سیدھا راستہ بتانے والے

کُماۃِ الحقِ اخُیارِ العبیدِ
حق کے بہادر بندگان خدامیں برگزیدہ

شموسِ هدایۃٍ ذَرَّتُ بِضوءٍ
ہدایت کے آفتاب ایسی روشنی لیکر طلوع ہوئے

تجلیّٰ لِلُقرِیب و لُلبعیدِ
جو نزدیک و دور کے لیے برابر چمکتی ہے

بایدِیُهم مَفاتیح العلوم
ان کے ہاتھوں میں تمام علوم کی کنجیاں ہیں

خزآئنهم لمن خیرالنُّقودِ
انکے (علوم کے) خزانے بہترین نقود ہیں

فَانَّ لَهُم لِاحُساناً عَظیما
کیونکہ ہم پر ان کا بڑا احسان ہے

علینا بل علیٰ من فِی الوجودِ
بلکہ تمام لوگوں پر جو وجود پاچکے ہیں

فمنهم سیدی مسعود احمد
ان میں سے ہمارے سردار مسعود احمد ہیں

رضیع رَزانۃٍ نَحُلُ الرّشیدِ
متانت کا دودھ پیکر پلے ہوئے مولانا رشید احمد کے صاحبزادے

نجیح صریمۃٍ مّاضی الأُمورِ
ارادوں میں کامیاب تمام کام کر گزرنے والے

طبیب زمانهٖ وَعدِیم حیدٍ
اپنے زمانہ کے طبیب اور بے مثل

وَمحمودالوری حسنُ السجایا
اور خلق خدا کے سراہے ہوئے نیک خصلتوں والے

وَسیمُ الخلقِ ذو خُلقٍ حمیدٍ
حسین بدن والے۔ عمدہ عادتوں والے

بِای خلیقۃ أُثنی علیهِ
شمائلهٗ تزِیدُ علی العدیدِ

میں آپکی کس کس نیک خصلت کی تعریف کروں — آپ کے اوصاف جمیلہ احاطۂ شمار سے زائد ہیں

غزارۃُ عِلمِہٖ وَ صَفاءُ سِرِّہٖ — علیٰ دَعْوایَ مِنْ خیر الشھودٖ
آپکے علم کی بے حد زیادتی اور دل کی صفائی — میرے اس دعوے پر بہترین گواہ ہیں

وَمَوْلینا الْھُمامُ خلیل احمد — فَقیہُ الْعَصْرِ ذو فَضلٍ حریدٖ
اور ہمارے مولانا بزرگ (مولوی) خلیل احمد — اپنے زمانہ کے فقیہ بے مثل کمال والے

تَری عبدالرحیم حلیف صدقٍ — تَقی الخلقِ اوفی بالعھودٖ
مولینا عبدالرحیم کو تم سچائی کا حلیف دیکھوگے — برگزیدہ خلق عہد واقرار پورا کرنے والے

وَ احمدُ ھُمْ حباہُ اللہ فوزاً — بآمالٍ وَّ بِالْعَیش الرَّغیدٖ
اور ان میں مولوی احمد، انکو خدائے تعالیٰ نے — امیدوں اور فراخ عیش پر کامیاب کردیا ہے

تَذَکَّرْنَاالرَّشید و نحن نبکے — وَنیران الصَّبابَۃِ فی صعودٖ
مولانا رشید احمد کو یاد کر کے ہم رو رہے ہیں — اور عشق کی آگ کے شعلے بلند ہو رہے ہیں

وَیَعثر فی یَدیَ قلمی وانی — لفی ظُلمٍ مِّنَ الْاَحْزانِ سودٖ
اور ہاتھ میں قلم ٹھوکریں کھاتا ہے۔ اور میں — غم کی کالی اندھیریوں میں گھرا ہوا ہوں

ذَکَرْنا سیداً شیخاً ھُماماً — وَلِیَّ اللہ ذَاالْخَلَدِ الجلیدٖ
ہم نے ایک سردار شیخ کامل بزرگ کو یاد کیا ہے — جو خدا کے ولی اور بہادر دل والے ہیں

فلم یخفِ الا میرَ وَ قال حقا — وَ لَمْ یصرفہُ عنہُ ھوَی القعیدٖ
کسی امیر سے نہ ڈرے۔ حق بات کہہ دی — اور ہم نشینوں کی محبت نے بھی حق گوئی سے نہ روکا

تزھّدَ فی مَتاعِ العیش حتّٰے — رایٰ جلفاً اَلَذَّ مِنَ الزغیدٖ
اسباب زندگی میں ایسا زہد اختیار کیا — کہ سوکھی روٹی کے ٹکڑے مسکہ سے لذیذ سمجھنے لگے

وَ کانَ اَبَرَّھم بِالطَّالِبِیْنَ — وَ اَخْشَعَ رُکَّعٍ اَخْشیٰ سجودٖ
طالبین کے ساتھ بے حد احسان کرنے والے — تمام راکعین سے زیادہ خاشع اور تمام ساجدین سے زیادہ خائف

وَکان یُریٰ اِذاسرد الُمسائل　　کانّ ابا حنیفة فی الوجودِ
جسوقت مسائل فقہیہ بیان فرمانے لگتے یوں معلوم ہوتا　　کہ گویا امام ابو حنیفہؒ وجود میں ہیں

توفیٰ ذاکرا براشھیداً　　بِکنُکوہِ ظھیرةَ یومِ عیدِ
خدا کا ذکر کرتے ہوئے نیکوکاری میں شہادت پائی　　مقام گنگوہ میں دوپہر کے وقت جمعہ کے دن

کانّ قیامة قامتُ علینا　　اِذا صعِدالُملائِکُ بالشّھیدِ
ہم پر تو گویا قیامت قائم ہوگئی تھی　　جبکہ فرشتے اُس شہید کی روح لیکر آسمان پر چڑھے

اَیا ایّامَ عیشٍ فُزتُ فیھا　　بِرویةِ ارشد الاَعلامِ عُودِ
اے زمانہ عیش! جس میں کہ میں　　ارشد علماء کی زیارت سے فیضیاب ہوا تھا لوٹ آ

وَ اَین تعُودُ ایّام مَضینَ　　قضاء الله یجری بالحدودِ
اور گزرا ہوا زمانہ کب واپس آتا ہے۔　　خدا کا حکم حدودِ معینہ پر جاری ہوتا ہے

☆☆☆☆

وقال ایضاً
یمدح شیخه و یشکر نعمائه

قَلَمُ الْمشیّةِ قدجرٰی بِھوانی
قلم قدرت میری ذلت وخواری پر چل چکا

فی حُبِّ مَنْ عَنْ قَلبِہٖ اَمحانیٰ
اس کی محبت میں جو مجھے اپنے دل سے بھلا چکا ہے

اَصْبَحْتُ مِنْ سجع اَلبَلابِلِ سحرۃً
نور کے تڑکے ترانہ ہائے بلبل سن کر

قَلِقاً کغُصْنِ الْبَانِ فی الْخفقانِ
میں ایسا مضطرب ہوں جیسے بان کی تر شاخ تھر تھراتی ہے

اَسفیْ عَلیٰ شُربیْ رَحیق لقَائہاَ
میرا اتمام غم اس زمانہ کے جاتے رہنے پر ہے جس میں

زَمَنا مَضیٰ مِنْ اَجْمَلِ الْاَحْیَانِ
میں شراب وصل پیتا تھا۔ تمام زمانوں سے اچھا وہ زمانہ تھا

قَسماً بِوَجْدِ الشوقِ وَالاحزانِ
غمہائے عشق ولذت شوق کی قسم کھاکر کہتاہوں

اِنَّ الْحشاَ مُستوقدالنیرانِ
کہ یہ دل آتش محبت کی بھٹی بن گیا

ایُّ الفؤاد فؤاد مضنی ھائم
کون سا دل! عاشق حیران زار ونزار کا دل

قَلِقٍ کَئیبٍ وَامق ولُھانِ
وہ عاشق جو مضطرب، غمزدہ مبتلائے...

تَرْفَضُ دمْعاً قَانیًا فکانہ
ایسے سرخ آنسو کہ گویا وہ

لَنجیع قَلْبٍ اَوْ سُلافَۃُ حانِ
دل کا تازہ خون یادکان شراب کے سُرخ شراب ہیں

عَیناَیَ مِنْ حَرِّالصَّبَابَۃِ وَالھویٰ
فَھُما لِعَامُورِ الْحشا عینانِ

میری آنکھیں ... عشق و محبت کی گرمی ہے

گویا دونوں آنکھیں ... دل کے دو چشمے ہیں

وَالقلب مرمی بینشا مَلیحةٍ

اور دل ایک جو کے تیر نگاہ کا کشتہ ہے

حَدُّ الْقَناةِ وَ طَرُفُها سِیَانٖ

نیزے کی نوک اور اس کی نگاہ برابر ہیں

جَاءَ الْصَّبَا مِن نحوهابا رِیجهٖ

بادِ صبا اس کی جانب سے ایک خوشبو لائی ہے

مِنها تفوح کنفحةِ البُستانٖ

جو اسی کی خوشبو ہے اور باغ کی خوشبو کی طرح مہکتی ہے

تَرَكَ الهوىٰ قلبی علیها عاكِفا

میرے دل کو محبت نے ان کا مجاور بنا رکھا ہے

قدماً کَمَن عَکفوا علی الْاوثانٖ

عرصہ دراز سے جیسے بت پرست بتوں کے مجاور ہیں

فُتِنوا بصم مِّنْ صفائح صَخْرةٍ

اتنا فرق ہے کہ بت پرست تو پتھروں کی چٹانوں پر مفتوں ہوئے

وفُتِنتُ صَاحِ بِاملحِ الغِزلانٖ

اور میں غزلان حسن میں سے ملیح تر غزال پر مفتوں ہوا ہوں

سکَنَ الْقلوبِ اسْمَح برشةِ نظرةٍ

اے دلوں کی تسکین ایک نظر کے چھینٹے سے مشرف فرما

تُطفی ضراماً موقداً بجنانی

ایسا چھینٹا جو دل کی بھڑکتی آگ کو بجھا دے

یَاسادتی منّاًعلیّ بِلحظة

اے میرے سردارو ایک نظر کے ساتھ احسان کرو

من فاترٍ وَّ بِزَوْرةٍ وَ تدانٖ

چشمِ بیمار کی نظر اور دیدار اور قرب سے

رفقاً بِمَنْ صرفتهُ قصوتُکمُ عَنِ

اور اس شخص کے ساتھ جس کو تمہاری سخت دلی نے

الْحیُرانِ وَالإِخوانِ والْخلانٖ

پڑوسیوں اور بھائیوں اور دوستوں سے جدا کر دیا ہے نرمی کرو

ذکرالْمَنْ من دابهٖ ذکر اکُمْ

فاحدُّ سُمرِ اَسمَرالنسیانٖ

اور کبھی اس کو یاد کرلیا کرو جس کا وظیفہ تمہاری یاد ہے
کیونکہ تمہاری فراموشی اس کے لیے بڑا تیز نیزہ ہے

مَہلاً مّلامكِ ايهذا اللائمی — اِنَّ الملامَ وهجرها وِزرانِ

اے ملامت کرنے والے ذرا اپنی ملامت کو روک لے
بیشک تیری ملامت اور محبوبہ کی جدائی دو بوجھ ہیں

فالهجرُ وِزرٌ مّااستطعتُ تحمّلاً — وَاضَفتَ وِزراً آخراً اعیانی

اور جدائی ایک ایسا بوجھ ہے جس کی میں برداشت نہ کرسکا
اور تو نے ایک اور بوجھ بڑھادیا جس نے مجھے تھکا ہی دیا

وَهوَی النَّعاج العین فی قلبی وعذ — لُ العاذلینَ تَرُدُّهُ الأُذُنانِ

ان لیل گائے جیسی آنکھوں والیوں کی محبت تو میرے دل میں ہے
اور ملامت گروں کی ملات کو کان ہی رد کردیتے ہیں

ما الزمَ الاسقامَ بی عجباً لّها — لَزِمَتُ لتنزعنی شوی سلوانی

بیماریوں پر تعجب ہے کیسی مجھے چمٹی رہیں
اس لیے چمٹی ہوں گی کہ میرا رہا سہا اطمینان ہی نکال لیں

وهن القوی منی وَحان هلاكها — بلظی الفِراقِ وَ لومة الحرمانِ

میری تمام قوتیں بندی اور قریب بہلاک ہوگئیں
فراق کے شعلوں اور محرومی کی لپٹ سے

وَایسْتُ مِنْ بُرْئی وقامَ العود — وَرایت موتی قائما بعیان

اور میں اپنی صحت سے مایوس ہوگیا اور عیادت کرنے والے بھی ناامید ہوکر
اور مجھ کو موت سامنے کھڑی ہوئی معلوم ہونے لگی

فَاذانداءٌ مِّنْ سَماَءٍ جاءَ نی — آن لذبقنو المُرشِدِ الروحانی

اچانک آسمان سے ایک آواز آئی
کہ جا اور مرشد روحانی کی خدمت میں پناہ لے

جِبُرِ الورٰی عَلمِ الهِدَایةِ وَ التُّقیٰ — راسِ الکِرامِ الباهرالبُرهانِ

جو تمام خلق میں بڑے عالم ہدایت اور تقووں کے کوہ گراں

شرفاء کے سردار روشن دلیل والے ہیں

فَشھدتُ سُدّۃ بابِ محمودِالوَرےٰ

فَشَفیٰ وَانزلنی محلَّ امانٖ

پس میں حضرت مولانا محمود حسن کی دہلیز پر حاضر ہوا

اور آپ نے مجھے شفادی اور امن کی جگہ میں اتار دیا

بحر محیط ذاخر مُتَلاطِمُ

الامواجِ فی الْا صقاع وَالودیانٖ

ممدوح ایک محیط سمندر ذخیرہ ہائے درومرجان والا ہے جسکی

موجیں تمام زمینوں اور وادیوں تک پہنچی ہیں

دیوبند منبع مائہ وحُبابُہٗ

یَسقیٰ بِلادَالْھِندِ وَالْایرانٖ

دیوبند اس کا سرچشمہ ہے اور بڑا پانی اس کا

ایران وہندوستان کے شہروں کو سیراب کر رہا ہے

ھطل لہ الْامطارُمدرار لہٗ

اِنباتُ اطیب خُضرَۃ الرَّیحانٖ

ممدوح ایک برسنے والا ابر ہے بہت برسنے والا کہ

عمدہ عمدہ پھولوں کے درخت اگانا اسکا کام ہے

ریحانِ عِلمِ الدینِ فاحَ اَریجہ

بفدافدِ الغبراءِ وَالغیطانٖ

کون سے پھول؟ علم دین کے پھول جن کی خوشبو

اونچی اور نیچی زمینوں میں مہک رہی ہے

شَجر ظلیل فی السّماءِ فروعۃ

للمستَظِلّ بِظِلِہ حَظّانٖ

ممدوح سایہ دار درخت ہے جس کی شاخیں آسمان تک پہنچی ہیں

اس سے سایہ لینے والے کے لیے دو حصے اور ہیں

حَظُّ الثمارِ ثِمارِ عِلمٍ تقتنےٰ

حظُّ التقاۃِ وَ خشیَۃِ الرَّحمٰنٖ

ایک حصہ یہ کہ علم ومعرفت کے پھل چُنے

دوسرا حصہ یہ کہ تقوے اور خشیہ حاصل ہو

قمر جلا ظلم الْفسوقِ بِاسرھا

وَغزالۃ کشفَتْ دُجی الْکفرانٖ

ممدوح ایک چاند ہے جس نے نافرمانی
کی ظلمتیں دور کر دیں
اور آفتاب ہے جس نے کفر کی
اندھیریوں کو ہٹادیا

شمس تجلی نور توحید الالٰہِ
وہ ایسا آفتاب ہے جس کی دعوت
سے ہر جگہ
بدَعوۃٍ مِّنھا بِکُلِّ مَکانٖ
خدائے تعالیٰ کی توحید کا نور چمک اٹھا
ہے

نورُالعلوم ِ وَنورُخشیتِہِ الّتیٰ
علوم یقینہ کا نور اور اس کے خوف و
خشیہ کا نور
مِنْ رَّبِہٖ فَھُما لَہٗ نورانٖ
یہ دونوں اس کے لیے دوروشنیاں
ہیں

ضَوءُ العِبادۃِ للا لہِ وضَوءُ وجہٖ
خدائے تعالیٰ کی عبادت کی چمک اور
اس کے منور چہرے
زَاھِرٍ فَھُمالَہٗ ضَوءَانٖ
کی دمک یہ دونوں اس کی دو چمکیں ہیں

سیماہُ مِنْ اَثرِ السجود لِرَبِّہٖ
اس کے منہ پر علامت موجود ہے
اپنے خدائے برتر کے لیے
فی وجھہ ذی النورِ واللمعانٖ
سجدوں کی جو اس کے منور اور چمکدار
چہرے پر ہیں

ظَلَّ الاُمورُتطیعہٗ فی عَزمِہٖ
تمام امور اس کے ارادے کے تابع ہیں
وَ مضائِہٖ قَدَماً بِطَوعٖ عِنانٖ
اپنی خوشی سے ہمیشہ اُس کے ارادے کے
ساتھ چلتے ہیں

حبر نبیل فائقُ الاقرانِ نجل
ممدوح بڑا عالم، بزرگ، ہمعصروں سے
بڑھ چڑھ کر
السادۃِ الاَمجادِ وَالاُعیانٖ
بزرگوں، سرداروں، شریفوں کی اولاد
میں ہے

اَسمِح بِہٖ من باذِل اسر القلوبَ
کیا ہی جوانمرد ہے سخی جس نے دلوں
کو
بجودہٖ وَالفضلِ وَالفَیضانٖ
اپنے فضل و کرم و فیض سے قید کر لیا
ہے

اَکرمُ بِہٖ اَرحم بہٖ احلِمْ بِہٖ
اَعْلِم بِہٖ بالفقہِ وَالقُرانٖ

کیا ہی کریم کیا ہی رحیم کیا ہی بردبار ہے
کیا ہی جاننے والا ہے فقہ اور قرآن مقدس کا

اَجود بِہٖ اَحسِن بِہٖ اَشجِعُ بِہٖ
کیا ہی سخی کیسا محسن کیسا بہادر ہے
اَعُھذُبِہٖ بالمالِ للجیُران
پڑوسیوں کی اپنے مال سے کیسا غمگساری کرنے والا

کھفُ البَرِیَّۃِ غوثھمُ وَملاذُھم
خلق خدا کا جائے پناہ فریادرس اور ان کی پناہ
منُ مُفُزعات طوَارقِ الحدثانِ
گردش زمانہ کی خوفناک مصائب آفات سے

لم یعرمن اعطاہُ ثوُباً من ثیابِ
کبھی ننگا نہ ہوا وہ شخص جسے ممدوح نے ایک کپڑا دیدیا
عُلومِ دینِ المصطفیٰ ذی الشانِ
پیغمبر ذی شان مصطفیٰ صلعم کے دینی علوم کے حلّوں میں سے

وَلَنِعُم ثوُباً اِنُ قَدَرُتُم قدُرَہٗ
وہ کپڑا بہت ہی اچھا کپڑا ہے اگر تم اس کی قدر کرو
وَاللہِ لا یَبلیٰ بِطوُلِ زَمانِ
خدا کی قسم مرور زمانہ سے پُرانا نہیں ہوتا

لَمُ یصد منُ اسقاہُ مِنُ جرُ بالہٖ
کبھی پیاسا نہ ہوا وہ شخص جس کو ممدوح نے اپنی شراب پلادی
اَلمُغلیٰ بِماءِ الجودِ والاِحسانِ
وہ شراب جس میں جود واحسان کے پانی کی ملونی ہے

لَمُ یفتَ یخشیٰ اللہ فی احوالہٖ
ہمیشہ اپنے تمام احوال میں خدا سے ڈرتا ہے
فَھو الفقیہ العَالِمُ الرَّبانی
پس وہ فقیہ عالم ربانی ہے

نَفسی الفداءُ لصارِمٍ عُریانٍ
میری جان اس شمشیر برہنہ پر قربان ہو
منُ باتراتِ اللہِ ذی السُّلطانِ
جو خدائے غالب کی تلواروں میں سے ایک تلوار ہے

طُبِعَتُ براھین الھُدیٰ سَیفاً فیا
عَجَباً لِعَضبِ الطف القصمانِ

براہین ہدایت کی تلوار ڈھالی گئی پس اس
تمام تلواروں سے لطیف تر تلوار.....

فذبابہٗ موتُ المَلاحدَۃِ اللئام
عِداۃِ دینِ الحق والایمانِ

کیونکہ اسکی دھار ملاحدہ کنام کی موت ہے
جو دین حق اور ایمان کے دشمن ہیں

مستمسکٌ بعرےَ الھِدایۃِ و الرّشادِ
منُ کِتابٍ وّاضِحِ التبیانِ

ممدوح ہدایت اور رشد کے عروۂ وثقیٰ کو پکڑے ہوئے ہے
جو کھلی ہوئی واضح کتاب سے ماخوذ ہے

فیہِ البشارۃُ للذینَ یلونہ
بالفوزِ بالحُسنیٰ وبالرِّضوانِ

وہ کتاب جس میں مطیعین کے لیے بشارت ہے
کہ وہ جنت اور خدا کی رضا مندی پر کامیاب ہوں گے

فیہِ الوعیدُ لِمَنْ تعدی حدّہٗ
بخبیثۃِ الأشجارِ وَالخُسرانِ

اور جس میں حد سے بڑھنے والوں کے لیے وعید ہے
بد ترین درخت (زقوم) اور ناکامی کی

صَدرُالکرامِ کِرامِ مَدرسۃِ العلومِ
الفائزینَ بِرَحمۃِ الرَّحمٰنِ

ممدوح مدرسہ دیوبند کے مدرسین میں صدر مدرس ہیں
اور وہ سب خدا کی رحمت کے ساتھ کامیاب ہیں

لأزالَ مدرُسۃ رَمَتْ بنصالِھا
قَوماً یقویٰ فتنۃَ الشَیطانِ

یہ مدرسہ ہمیشہ رہے جس نے اپنے بھالوں سے
شیطانی فتنوں کے تقویت دینے والے گروہ کو خستہ جگر کر دیا ہے

لأزالَ مَدرسۃ صحت فیھاسکارے
الجھل وَ العُدوَانِ وَ الطُغیانِ

یہ مدرسہ ہمیشہ قائم رہے جس میں جا کر جہالت اور سرکشی
اور تعدی حدود کے سرمست ہوش میں آجاتے ہیں

لأزالَ مَدرَسۃ جرَتْ مِنھا عیونُ
العِلمِ وَالتّوحیدِ وَالعِرفانِ

یہ مدرسہ ہمیشہ رہے جس سے علم و توحید
و معرفت کے چشمے جاری ہو گئے ہیں

☆☆☆

آثارِ علمیہ خطیہ

(۱)

مولانا امین الدین بانی و مہتمم مدرسۂ اسلامیہ امینیہ دہلی کے نام حضرت مفتی اعظم کے ایک یادگار مکتوب کا عکس۔

پنجشنبہ
۱۸ فروری

جناب مکرم محترم

بعد سلام مسنون ۔ بندہ مع الخیر ہے ۔ مدرسہ میں خیریت ہے ۔ آپ کے
مکان پر خیریت ہے ۔ کل چہارشنبہ کو بیمہ پارسل کی اطلاع ڈاکخانہ
سے آئی تھی ۔ پوسٹمین نے کہا کہ پارسل تمہیں ملجائیگا ۔ میں ڈاکخانہ
گیا ۔ ہیڈ پوسٹمین نے وہاں بیان بھی کر دیا کہ میں انہیں جانتا ہوں
اور مولوی امین الدین صاحب کے پارسل اور منی آرڈر یہ وصول کرتے ہیں
اور انہیں اس کی اجازت ہے مگر باوجود اس کے ڈاکخانہ کے اسسٹنٹ انسپکٹر
نے یہی کہا کہ پارسل نہیں دیا اور کہا کہ یہ بات خلاف قاعدہ ہے بلکہ ہیڈ
پوسٹمین کو بھی ڈانٹا ۔ اب پارسل واپس ہوگا ۔ جب آپ یہاں آئیں گے اس وقت
پارسل وصول ہوگا ۔ مولوی ابراہیم صاحب کو بھی اسی مضمون کا کارڈ
میں نے لکھدیا ہے ۔

حضرت اقدس مولانا مدظلہم العالی کی خدمت میں خاکسار کا
نیازمندانہ سلام عرض کر کے دعا کی درخواست کریں
اور جو حضرات کہ بندہ سے واقف ہوں ان سے بھی سلام
فرمادیں ۔ مکرمی حاجی عبدالغنی صاحب کو بھی سلام مسنون عرض

کفایت اللہ
مسجد کشمیری دہلی

عکس

(۲)

التهنئة بالعيد السعيد

من مسجون محب

الى مركز دائرة المروة وانسان ناظرة الصدق وصاحب العلم والرأى المتين الشيخ ميجر فضل الدين مدير السجن المركزي بالبلد بملتان

اهنيك يامن فاز بالخير وارتقى	بكأس دهاق من مكارم واستقى
اهنيك يامن صار افئدة الورى	بأخلاقك الزهراء طيبة الشذى
اهنيك يامن فاق بالفضل والندى	على كل من اعلى وانفق ما حوى
بعيد اذا وافى اتى بمسرة	تدب الى اعماق افئدة الورى
اهنيكم بالعيد والعيد معجب	لحر كريم فاز بالعيش والمنى
يعود بكم عيد واعياد مباركا	عليكم وفيكم بابا لكم المنا
يعود اليكم مثل حب يزوركم	يأتى بما يأتى الحبيب اذا اتى
يعود بحال ما تشتهيه وترتضى	من الحمد بالخيرات والرشد والهدى
يزور المحبين الاحبة بكرة	ويلتذ كل بالتلاقى وباللقا
اذا العيد يأتى المرء والدهر مقسط	بأمل ومغنى اورث الطف والهنا

مخلصكم المسجون - محمد كفايت الله عفا عنه مولاه - ۲۹ رمضان سنه ۱۳۵۱ھ ملتان

میجر فضل الدین سپرنٹنڈنٹ سنٹرل جیل ملتان کے لیے تہنیت عید میں حضرت مفتی اعظم کے چند عربی اشعار حضرت مرحوم کے اپنے قلم سے، مورخہ ۲۹؍ رمضان المبارک ۱۳۵۱ھ مطابق ۲۶؍ جنوری ۱۹۳۳ء۔ اس سال رمضان کے تیس روزے ہوئے تھے اور عید ۲۸؍ جنوری کو پڑی تھی۔ (ا۔ س۔ ش)

ضمیمہ:

چند نادر و یادگار تحریرات

مولانا سعید الدین ابن مولانا امین الدین (رحمہما اللہ تعالیٰ) کے خلف الرشید مولانا حافظ فرید الدین (خطیب جامع مسجد قدوسیہ ناظم آباد نمبر ا، کراچی) کے نام حضرت مفتی اعظم کے ایک نادر مکتوب سامی کے علاوہ تین نادر و یادگار خطوط اور بھی متعدد نکات علمیہ اور معلوماتِ مفیدہ سے مالامال محفوظ تھے اور ان میں کئی معلومات حضرت مفتیِ اعظم کے اعزہ و متعلقین کے بارے میں تھیں۔ انھیں بھی اس خیال سے اس مجموعے میں شامل کرلیا ہے کہ:

اولاً: مستقبل میں ان کے تحفظ کی کوئی اطمینان بخش صورت نظر نہ آتی تھی۔

ثانیاً: ان کے نکات علمیہ و معلومات مفیدہ کا فیضان و افادہ مولانا فرید الدین کے ذوق علمی کے حدود سے زیادہ وسیع ہوسکے۔

یہ تین خطوط حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا علیہ لرحمہ (مظاہر العلوم، سہارن پور)، مولانا سعید الدینؒ (ابن مولانا امین الدین بانی مدرسہ امینیہ، دہلی) اور مولانا مفتی حفیظ الرحمٰن واصف مرحوم (خلف الرشید مفتی اعظم مولانا محمد کفایت اللہ شاہ جہاں پوری ثم دہلوی) کی تحریرات نادرہ سے یادگار ہیں:

مولانا سعید الدین مرحوم ۱۹۴۷ء میں دہلی کے حالات سے متاثر ہو کر پاکستان آگئے تھے۔ وہ کراچی کی مشہور مکی مسجد (گارڈن روڈ) کے خطیب اور تحریک تبلیغ دین اور دعوت و اصلاح کی اہم شخصیات میں سے تھے۔ دوسری دونوں شخصیات علم و دین اور ادب و تحقیق کے میدانوں کی نامور شخصیات ہیں اور تعارف سے بے نیاز ہیں۔

ان بزرگوں کے نام خطوط یہ ہیں:

(۱)

مکتوبِ شیخ الحدیث

عنایت فرمایم سلمکم اللہ تعالیٰ بعد سلام و مسنون!

عنایت نامہ پہنچا۔ مشورۂ عافیت سے مسرت ہوئی۔ اللہ تعالیٰ شانہ، کا شکر ہے کہ اس نے صحتِ کاملہ عطا فرمائی۔ آپ نے ماہ مبارک میں آنے کو لکھا ہے شوق سے تشریف لاویں۔ لیکن میرا مشورہ یہ ہے کہ اگر حضرت اقدس رائے پوری دام مجد ہم (۱) کا رمضان وہاں گزرے جیسا کہ اس کی کوشش ہو رہی ہے تو آپ رمضان حضرت ہی کی خدمت میں گزاریں۔ حضرت اقدس کا دم بہت غنیمت ہے۔ اسلاف میں یہی ایک ہستی رہ گئی ہے۔ جو وقت بھی ہے، وہ نعمت غیر مترقبہ اور اللہ کا احسان عظیم ہے۔ میری طرف سے اپنے احباب کو بھی یہ پیام پہنچادیں کہ حضرت کا وہاں تشریف لے جانا ہو تو جس کو جتنا وقت بھی مل سکے، اس کو بہت زیادہ غنیمت سمجھ کر حضرت کی خدمت میں حاضر ہو۔ فقط والسلام

عنایت فرمایم مولوی فریدالدین صاحب سلمہ
مدرسہ خدام القرآن، ڈاک خانہ میرے شاہ
صادق آباد علاقہ بہاول پور، (مغربی پاکستان)

زکریا
مظاہر علوم
یکم جمادی الثانی ۱۳۷۸ھ
(۳/ دسمبر ۱۹۵۸ء)

---

(۱)۔ حضرت رائے پوری سے اشارہ حضرت شاہ عبد القادر رائے پوری علیہ الرحمہ کی طرف ہے۔

(۲)

مکتوبِ سعید

۲۳ر صفر ۷۱ھ روز شنبہ (۲۳ر نومبر ۱۹۵۱ء)

کراچی

برخوردار سعادت آثار خوش باشید

بعد سلام مسنون و دعائے ماوجب آں کہ تمہارا ۷ ار صفر کا لکھا ہوا خط ملا۔ خیریت مزاج اور حالات معلوم ہو کر اطمینان ہوا۔ حسبِ تحریر امید ہے کہ تمہارا امتحان بھی ہو گیا ہو گا۔ حق تعالیٰ شانہ محض اپنے فضل سے تم کو علم صحیح عطا فرمائے اور عمل صالح سے آراستہ فرما کر دارین کی ترقیات اور قرب و رضا کی دولتوں سے مالا مال فرمائے۔ آمین۔

حسبِ ارشاد نبوی من خرج فی طلب العلم فھو فی سبیل اللہ حتی یرجع، تم اللہ کے محبوب راستے میں ہو اور تمہاری دعائیں مقبول ہیں۔ اس لیے درخواست ہے کہ بندہ کو خصوصاً اور بہن بھائیوں و جملہ متعلقین کو عموماً اپنی دعاؤں میں یاد رکھنا کہ ہم تمہاری دعواتِ صالحہ کے محتاج ہیں اور دعا میں ادائے حقوق کی نیت رکھنا۔

گھر میں بحمد اللہ تعالیٰ سب بخیریت ہیں۔ میری طبیعت ایک ہفتہ سے زیادہ سے مضمحل ہے۔ دو تین روز سے حکیم مختار حسن صاحب کا علاج شروع کیا ہے۔ ممکن ہے دس بارہ یوم کے بعد پنجاب کا سفر کروں کیونکہ کراچی کی آب و ہوا سازگار نہیں ہے۔

ایک بات کا خیال رکھنا کہ جو ادویہ یہاں سے لے گئے ہو، ان کو بلا ضرورت استعمال نہ کرنا۔ صحت کے لیے زیادہ تر غذائی تدابیر کا لحاظ رکھنا۔ دواؤں کے تسلسل سے طبیعت ان کی عادی ہو جاتی ہے۔ پھر ان سے نفع بھی نہیں ہوتا۔ بلکہ ان کے بغیر معدہ اور جگر اپنا کام بھی نہیں کرتے۔ اس لیے معمولی شکایات میں تو صرف غذا اور پرہیز ہی سے کام لینا چاہیے۔ صرف زیادتی کی صورت میں بہ قدر ضرورت دوا کا استعمال ہو اور تم ماشاء اللہ سمجھ دار ہو۔

حسب موقع اہل الرائے کے مشورے سے مناسب محل صورت کر لیا کرو۔ مولانا عبدالرشید صاحب مدظلہ (۱) ودیگر اکابر وواقفین سے بندہ کا سلام اور دعا کی درخواست کر دینا۔ تم برابر خیریت و حالات سے اطلاع دیتے رہنا۔ یہاں سے اگر جواب نہ بھی پہنچے تو مضائقہ نہیں۔

فقط

بہ مطالعہ عزیزم مولوی فرید الدین سلمہ اللہ تعالیٰ
دارالعلوم الاسلامیہ۔اشرف آباد
ٹنڈوالہ یار، حیدر آباد، سندھ

بندۂ ناکارہ
سعید الدین
مکی مسجد۔ کراچی

(۳)

مکتوبِ واصف

۲۳-۶-۶۸

عزیزم سلمہ،
وعلیکم السلام!

آپ کا ۲۹ر مئی کا لکھا ہوا پوسٹ کارڈ موصول ہوا۔ خیر وعافیت معلوم ہوئی۔ اپنی پھوپھی جان کی خدمت میں ہم سب کی طرف سے سلام عرض کر دیجئے۔ اللہ کے فضل و کرم

---

(۱)- مولانا رشید الدین نعمانی مراد ہیں۔ جو اس زمانے میں دارالعلوم ٹنڈوالہ یار میں مدرس تھے اور مولانا قاری فرید الدین (مکتوب الیہ) کے استاد گرامی تھے۔

سے یہاں سب بخیریت ہیں۔انیسہ بیگم کی طبیعت کچھ خراب ہو گئی تھی۔اب بحمد اللہ ٹھیک ہے۔
امید ہے کہ آپ بھی بخیریت ہوں گے اور آپا محترمہ بھی بخیریت ہوں گی۔کب تک دہلی واپسی کا ارادہ ہے؟ آج کل آپ کا مشغلہ کیا ہے؟ باقی خیریت ہے۔فقط
والسلام

حفیظ الرحمٰن
مدرسہ امینیہ اسلامیہ۔کشمیری دروازہ، دہلی

بہ مطالعہ عزیزی مولوی حافظ فرید الدین سلمہ،
مسجد قدوسیہ، نزد پٹرول پمپ، ناظم آباد، نمبر ا
کراچی نمبر ۱۸

---

(۱)-مکتوب الیہ کی پھوپی اور مکتوب نگار کی خوش دامن میمونہ خاتون ان دنوں اپنے اعزہ سے ملنے پاکستان آئی ہوئی تھیں اور کراچی میں اپنے بھتیجے مولانا فرید الدین کے پاس مقیم تھیں۔
(۲)-انیسہ بیگم مکتوب نگار کی صاحبزادی
(۳)-آپا محترمہ سے مراد میمونہ خاتون مکتوب نگار کی خوش دامن ہیں، جنہیں وہ آپا کہا کرتے تھے۔